راتوں کا شہر
شوکت صدیقی
http://www.pakistanconnections.com/ebooks

افسانے

شوکت صدیقی

شریف آدمی

دوسرے روز وہ بستر پر پڑا دن چڑھے تک کروٹیں بدلتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ باہر صحن میں چمکیلی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ ہڑبڑا کر رضائی ایک طرف پھینکی اور جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر انگڑائی لے کر کسلمندی دور کرنے لگا۔ لیکن اس مہینے کے ہر روز کی طرح' آج بھی اس کے لیے دن کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔

گھر میں بالکل سناٹا تھا۔ اس نے دروازے سے جھانک کر باہر نظر ڈالی۔ اس کی بیوی دالان کے ایک گوشے میں سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔ تینوں بچوں کا کہیں پتہ نہ تھا۔ صبح ہی صبح وہ باہر میدان میں کھیلنے نکل گئے تھے۔ اس نے سوچا اس وقت بیوی سے بات کرنا مناسب نہیں۔ بہتر یہی ہے کہ پہلے بچوں کو بلا کر گھر لے آئے اور جب ذرا چہل پہل ہو جائے تو پھر کوئی بات چیت کی جائے۔ کچھ یہی سوچ کر وہ کمرے سے نکل کر دالان میں آ گیا۔ بیوی نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا۔ لمحہ بھر کے لیے دونوں کی نظریں ملیں' مگر کسی نے کوئی بات نہیں کی۔ وہ چپ چاپ گھر سے باہر چلا گیا۔

دروازے ہی پر اسے ڈپٹی صاحب کا ڈرائیور مل گیا۔ اس وقت وہ گہرے نیلے رنگ کی اونی وردی پہنے ہوئے تھا۔ سر پر ڈرائیوروں والی ٹوپی تھی۔ ڈرائیور ہزارے کا گورا چٹا نوجوان تھا۔ لمبا تڑنگا جسم' چہرے پر تازہ خون کی دمک' وردی پہن کر وہ بڑا شاندار نظر آ رہا تھا اور اس کے سامنے وہ خود کسی کیڑے کی طرح حقیر معلوم ہو رہا تھا۔ ڈرائیور نے اسے دیکھتے ہی اپنے بھاری بھرکم آواز میں کہا۔

"ماسٹر جی السلام علیکم!"

وہ حقیر کیڑے سے ایک بارگی باعزت آدمی بن گیا۔ اس نے لہجے میں ضرورت سے زیادہ شفقت پیدا کرتے ہوئے جواب دیا۔ "وعلیکم السلام! کہو میاں گھر پر سب خیریت ہے۔ بال بچے اچھی طرح ہیں۔"

"خدا کا شکر ہے سب ٹھیک ٹھاک ہیں۔"

وہ تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ اسے ڈیوٹی پر پہنچنے کی جلدی تھی۔ صاحب کے دفتر جانے کا وقت ہو گیا تھا۔ اب وہ ناشتہ سے فارغ ہو کر ڈرائنگ روم میں پہنچ گئے ہوں گے۔

ڈرائیور تیز تیز قدم اٹھاتا ڈپٹی صاحب کے بنگلے کی جانب چل دیا۔ وہ دروازے پر کھڑا اسے میدان کے اس سرے تک دیکھتا رہا جہاں بہت سے بچے ہجوم کی صورت میں چیخ چیخ کر شور مچا رہے تھے اور ذرا فاصلے پر انگریزوں کی سی وضع قطع کا ایک شخص کیمرہ لیے ان کا فوٹو لے رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ سارا ہنگامہ کا ہے کا ہے۔ وہ آگے بڑھ کر اس طرف غور سے دیکھنے لگا۔ اسی اثناء میں سامنے سے ریلوے ورکشاپ کا مستری آتا ہوا نظر آیا' وہ اسی سمت سے آ رہا تھا۔ مستری اس کا پڑوسی تھا لہٰذا شناسائی بھی تھی۔ جب وہ قریب آ گیا تو اس نے پوچھا۔

''یہ بچے اتنا شور کیوں مچا رہے ہیں؟''

''میں بھی یہی دیکھنے گیا تھا۔'' مستری نے بتایا۔ ''وہ جو کیمرہ لیے کھڑا ہے' بچوں کے سامنے چاکلیٹ' ٹافیاں اور پیسے پھینک رہا ہے اور جب بچے ان کو اٹھانے کے لیے جھپٹتے ہیں تو وہ جلدی سے ان کا فوٹو کھینچ لیتا ہے۔''

وہ حیرت زدہ ہو کر بولا ''فوٹو کھینچ لیتا ہے! کیوں؟''

مستری نے اس کی حیرت نظر انداز کرتے ہوئے جواب دیا۔ ''پتہ نہیں' نہ جانے کیسا آدمی ہے۔ جب بچے اس کے قریب آ جاتے ہیں تو ان کو ڈانٹ کر دور کر دیتا ہے اور جب وہ چلاتے ہیں تو کھیسیں نکال کر خود بھی ہنسنے لگتا ہے۔ میں نے بچوں کے برابر کھڑے ہو کر چاہا کہ لاؤ ایک فوٹو اپنا بھی کھنچوا لوں تو سالے نے انگریزی میں ایک موٹی سی گالی دے کر مجھے الگ ہٹا دیا۔''

اس نے جھٹ سے کہا۔ ''اور تم نے گالی سن لی۔''

''ہاں جی اور کیا کرتا؟''

ماسٹر جی تعلیمی استعداد کے اعتبار سے تو صرف منشی فاضل تھے مگر ٹوٹی پھوٹی انگریزی بھی بول لیتے تھے۔ ان کو مستری کے بے حسی پر بڑا تاؤ آیا۔ جی چاہا کہ ابھی جا کر اسے بری طرح جھاڑیں کہ اسے بھی معلوم ہو جائے کہ اس محلے میں مستری کی طرح سب بے غیرت ہی نہیں رہتے بلکہ شریف لوگ بھی بستے ہیں۔ مستری جیسے ان کے ارادے کو بھانپ گیا تھا' اس نے فوراً ہی موضوع بدل دیا' کہنے لگا۔

''اچھا ہوا اس وقت ملاقات ہو گئی۔ میں کئی روز سے آپ کی تلاش میں تھا۔''

''کیوں خیریت تو ہے؟''

مستری آہستہ سے بولا ''بات یہ ہے کہ۔۔۔۔۔۔۔'' کہتے کہتے وہ اس طرح رک گیا جیسے اپنی بات کہنے میں جھجک محسوس کر رہا

ہو۔اس نے مستری کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے فوراً کہا۔"ہاں ہاں! کہو کیا بات ہے؟"

مستری کہنے لگا "بات یہ ہے جی کہ میری گھر والی پچھلے کچھ دنوں سے بہت بیمار ہے۔اس کا تو آپ کو بھی پتہ ہوگا۔"

اس نے جھٹ لقمہ دیا۔"ہاں سنا تو ہے کہ تمہارے گھر میں سے آج کل علیل ہیں۔"

مستری بتانے لگا"اس کی بیماری کی وجہ سے کھانے پکانے کی بڑی تکلیف ہے۔آج کل گھر سے کچھ کھائے پیے بغیر ہی ڈیوٹی پر چلا جاتا ہوں۔بچے الگ ستاتے ہیں۔گھر والی کا یہ حال ہے کہ وہ تو اٹھنے بیٹھنے سے بھی لاچار ہوتی جارہی ہے۔بڑی مشکل سے دن کٹ رہے ہیں۔"

اس نے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کہا۔"بھئی کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھاؤ اور لگ کر علاج کرو۔اس طرح کیسے کام چلے گا؟"

"علاج تو اس کا ہو رہا ہے مگر اس وقت سوال تو کھانے پینے کا ہے اور گھر کی دیکھ بھال کا ہے۔"مستری نے لحہ بھر کے لیے توقف کیا اور حرف مطلب پر آ گیا۔"میں نے سوچا آپ کا ہاتھ آج کل ذرا تنگ ہے۔آپ کی گھر والی دن میں اکثر کچھ نہ کچھ مانگنے آ جاتی ہیں تو اس سے ہم دونوں کو بڑی شرم معلوم ہوتی ہے۔کوئی ہرج نہ ہو تو وہ میرے گھر کی ذرا دیکھ بھال کر لیا کریں۔کھانا تیار کر دیا کریں' کوئی زیادہ کام نہیں ہے۔اپنا ہی گھر سمجھ کر کام کر دیا کریں۔دونوں وقت کے کھانے کے علاوہ آپ کو پچیس روپے مہینہ دے دیا کروں گا۔اور اس کے علاوہ۔۔۔۔۔۔۔"

مگر اس نے بات پوری کرنے سے پہلے ہی مستری کو ٹوکا۔"۔۔۔۔۔۔اور اس کے علاوہ پھٹا پرانا کپڑا بھی پہننے کو دیا کروں گا۔یہی مطلب ہے نا تمہارا؟" غصہ اور جذبات کی شدت سے اس کی آواز بھرا گئی۔"مستری خدا نے ہم پر یہ وقت ڈالا ہے تو تم بھی جو چاہو کہہ لو۔اللہ اللہ! اب یہ وقت آ گیا ہے کہ ماسٹر سکندر علی کی بیوی تمہارے گھر کے برتن مانجھے' ماما گیری کرے۔واہ مستری جی! خوب تم نے ہمدردی کی۔خوب تم نے ہمسائیگی کا حق ادا کیا۔"اس کی آواز بھرا گئی۔اور مستری کے جواب کا انتظار کئے بغیر غصے سے کانپتے ہوئے اپنے گھر میں چلا گیا۔

مستری ہکا بکا کھڑا دیکھتا رہ گیا۔

گھر میں داخل ہو کر ماسٹر سکندر علی نے دیکھا کہ بیوی اسی طرح والان کے کونے میں سر جھکائے مضمحل بیٹھی تھی۔اس نے بیوی سے اس دفعہ بھی مطلق بات چیت نہیں کی۔کمرے میں گیا اور باؤلے کتے کی طرح بے چینی سے ادھر ادھر تیزی سے گھومتا رہا۔

گھومتے گھومتے کمرے سے نکل کر دالان میں آ گیا اور بیوی کو مخاطب کر کے بولا"میں نے کہا' سن رہی شمن کی ماں! آئندہ اس

مستری کے بچے کے دروازے پر تم نے قدم رکھا تو سمجھ لینا مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔خبردار جواب تم اس کے گھر گئیں۔ سالا کمینہ پچوڑا کہیں کا۔"

وہ پیچ وتاب کھاتا ہوا پھر کمرے کے طرف بڑھا' بیوی نے گھبرا کر ٹوکا۔"خیریت تو ہے' آخر ہوا کیا؟"

"کچھ نہیں" وہ اپنی بات کہتے کہتے لحظہ بھر کے لیے رکا۔"کیا بتاؤں' کہتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔حرام زادہ' ذرا دیر پہلے باہر میدان میں ملا تو مجھ سے کہنے لگا کہ تم اپنی بیوی کو میرے گھر میں کھانا پکانا اور اوپر کے کام کاج پر لگا دو۔پچیس روپے تنخواہ دینے کو بھی کہتا تھا۔ذرا اس کی دیدہ دلیری تو دیکھو' خدا ہو گئی پچوڑے پن کی۔"

بیوی غصے سے آگ بگولا ہو گئی۔غضب ناک ہو کر بولی۔"سور کا بچہ! اے' اس کی اتنی ہمت کیسے ہوئی۔ابا جان کے کان میں بھنک بھی پڑ گئی تو سر پیٹ لیں گے۔یہی کہیں گے' کہ پاکستان جا کر تم دونوں نے خاندان کا خوب نام روشن کیا۔رئیس بسواں میر کلب رضا کی پوتی اور پیش کار صاحب کی بیٹی اب مستریوں کے گھر میں ماما گیری کرے گی۔ان رذیلوں کے برتن مانجھے گی۔" اس نے اپنے سر پر دو ہتڑ مارا۔"خدا اس گھڑی کو موت نے دے دے۔" اور وہ پھوٹ پھوٹ کر اپنی قسمت کو رونے لگی۔

سکندر علی کمرے میں جا کر خاموش بیٹھ گیا۔گھر پر سناٹا چھا گیا۔دھوپ دیوار سے پھسل کر اب دالان تک آ گئی تھی۔گرمی کی شدت بڑھ گئی تھی۔سکندر علی بہت اداس بیٹھا تھا۔باہر دالان سے ابھی تک اس کی بیوی کی سسکیاں رک رک کر ابھر رہی تھیں۔فضا اتنی بوجھل اور بے کیف تھی کہ دم گھٹتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔اچانک گھر کا دروازہ شور کرتا ہوا تیزی سے کھل گیا۔

اس کے تینوں بچے صحن میں آ کر آپس میں دھینگا مشتی کر رہے تھے۔زور زور سے چیخ چلا رہے تھے۔گھر کا سناٹا شکست ہو چکا تھا۔زندگی کے ہنگامے اداس فضا سے نکل کر بیدار ہو گئے تھے۔جب بچوں کا شور زیادہ بڑھ گیا تو وہ کمرے سے نکل کر دروازے پر آ گیا۔اس نے دیکھا' دونوں لڑکے چھوٹی بچی کے ہاتھ سے کچھ چھیننے کی کوشش کر رہے تھے۔بچی جھکی ہوئی زمین پر اوندھی پڑی تھی۔اس نے اپنا ایک ہاتھ سینے سے چمٹا لیا تھا اور دوسرے ہاتھ سے دونوں بھائیوں کو نوچ کھسوٹ رہی تھی جو بری طرح اس سے چمٹے ہوئے تھے۔

اب اس کی بیوی بھی وہاں پہنچ گئی تھی۔اس نے ڈپٹ کر ان کو علیحدہ کرنے کی کوشش کی مگر وہ باز نہ آئے۔آخر وہ ان کے نزدیک چلی گئی۔اس نے دونوں بیٹوں کو زبردستی پکڑ کر الگ ہٹایا۔بچی اٹھ کر بیٹھ گئی۔اس کے کپڑوں پر' بالوں پر' ہاتھ پیروں پر خاک ہی خاک تھی۔اس نے رونا بند کر دیا تھا۔ذرا دیر بعد اس نے خوشی سے ہنس کر اپنا ہاتھ نکالا اور بھائیوں کی طرف بڑھا کر کہا۔"لو یہ رہی"

اور اپنا ہاتھ کھول دیا۔ مگر اس کا ہاتھ خالی تھا۔ لمحہ بھر تک تو وہ اپنی ہتھیلی کو کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھتی رہی پھر منہ بسور کر رونے لگی اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر وہیں مٹی پر لوٹ گئی۔

دونوں لڑکے خوشی سے تالیاں بجا کر اچھلنے کودنے لگے۔ ''اچھا ہوا' لے چلی گئی نا۔ اب تو ہم یہ بھی نہیں دیں گے۔'' انہوں نے اپنی جیب کے اندر سے خوبصورت کاغذوں میں لپٹی ہوئی چاکلیٹ نکالی اور ماں کے پاس سے دور بھاگ گئے۔ ماں پوچھنے لگی۔

''ارے کم بختو! یہ تو بتاؤ' اس کے ہاتھ میں تھا کیا؟''

ایک بچہ کہنے لگا۔ ''چونی تھی' صاحب نے ہم سب کو دی تھی۔ یہ اکیلی ہی اسے ہڑپ کر لینا چاہتی تھی۔ اب کھوگئی' اچھا ہوا۔''

ماں نے جلدی سے کہا ''تو وہ گئی کہاں؟'' اور پھر بیٹوں کی بات نظر انداز کر کے بچی کے پاس پہنچ گئی اور نظریں جھکا کر ادھر ادھر چونی تلاش کرنے لگی۔ اچانک بچی کے پیروں کے قریب اسے مٹی میں دبی ہوئی چونی نظر آ گئی۔ اس نے چپکے سے چونی اٹھا کر ہاتھ میں دبا لی۔ بچی کو اٹھایا اور چمکارنے لگی۔ وہ مٹی میں لتھڑی ہوئی سسکیاں بھر رہی تھی۔ سکندر علی دروازے سے لگا سب کچھ دیکھتا رہا پھر خاموشی سے کمرے کے اندر چلا گیا۔

سورج چڑھ کر آسمان کے بیچوں بیچ پہنچ گیا۔ اب دوپہر ہوگئی تھی۔ کل دن بھر کی بھوک جورات کے ہنگامے سے بجھ گئی تھی پھر سلگنے لگی تھی۔ سکندر علی چپ چاپ بیٹھا سوچتا رہا کہ اب وہ کہاں جائے' کیا کرے؟ باہر دالان میں بچوں کے چلانے اور اس کی بیوی کے کوسنوں کی آوازیں سنائی پڑ رہی تھیں اور وہ ان آوازوں سے بے نیاز' صرف ایک ہی آواز سن رہا تھا۔ بھوک' بھوک' بھوک جو گھڑی کے پنڈولم کی طرح کھٹاک' کھٹاک' کھٹاک ہر ہر پل اور ہر ہر سیکنڈ کے ساتھ ابھر رہی تھی۔

اسی لمحے اس کی بیوی کمرے کے اندر آ گئی۔ ''لیجئے' یہ ذرا سے کچالو کھا کر پانی پی لیجئے' کچھ سہارا ہو جائے گا۔'' اس نے گھوم کر دیکھا بیوی کے ہاتھ میں رکابی تھی۔ اس میں ابلے ہوئے آلوؤں کے تھوڑے سے قتلے تھے جن پر نمک مرچ چھڑکا ہوا تھا۔ اس نے بیوی سے نظریں ملائے بغیر چپ چاپ رکابی ہاتھ میں لے لی۔

بیوی باہر چلی گئی۔ اس نے آلو کا ایک قتلہ اٹھا کر منہ میں ڈال لیا لیکن ابھی چند ہی قتلے کھائے تھے کہ باہر آنگن میں اس کے خالہ زاد بھائی کی آواز سنائی دی۔ اس نے رکابی اٹھا کر دیوار کے پاس ایک کونے میں چھپا دی اور جلدی جلدی منہ پونچھنے لگا۔

ذرا ہی دیر بعد وہ اندر آ گیا۔ سکندر علی دیر تک اس سے باتیں کرتا رہا۔ وہ بہت عرصہ بعد آیا تھا۔ لہٰذا سکندر علی ہر ایک کے متعلق تفصیل سے پوچھ رہا تھا۔ آخر جب وہ اٹھ کر چلنے لگا تو سکندر علی نے تکلفاً روکتے ہوئے کہا۔ ''بیٹھو میاں' چائے تو پیتے جاؤ۔''

شاید اسے ابھی کچھ دیر اور باتیں کرنا تھیں لہٰذا وہ ٹھہر گیا۔ سکندر علی نے ذرا اونچی آواز سے بیوی کو مخاطب کیا۔ "ارے بھئی سن رہی ہو؟ تم نے سمیع کے لیے چائے تیار نہیں کی۔ کہے گا کہ بھائی کے یہاں گیا تھا' چائے تک کو نہ پوچھا۔" اس نے خواہ مخواہ خوش مزاج بننے کی کوشش کی۔

اس وقت دروازے کی اوٹ سے اس کی بیوی کا چہرہ نظر آیا۔ وہ خفگی سے آنکھیں نکالے اس کی طرف گھور گھور کر دیکھ رہی تھی۔ سکندر علی نے جلدی سے گردن موڑ لی اور پھر باتوں میں مصروف ہو گیا۔

آخر جب سمیع پھر اٹھنے لگا تو سکندر علی نے ٹوکا۔ "چائے تو پیتے جاؤ' نہ معلوم اتنی دیر کیوں ہو گئی۔" وہ اٹھا اور باہر دالان میں آ گیا۔ بیوی کے قریب جا کر اس نے کہا۔ "چائے کا تو بندوبست کر دو۔ سمیع کو تم جانتی ہو۔ خالہ سے جا کر کیا کہے گا' سکندر بھائی کے گھر گیا تھا ایک پیالی چائے تک کو نہیں پوچھا۔"

بیوی جل کر بولی۔ "آپ بھی کمال کرتے ہیں' بچی کی چوٹی لے کر تو آلو منگائے تھے۔ میرے پاس کچھ آپ نے جمع کرا دیا ہے کہ چائے کا انتظام کر دوں۔"

سکندر علی خاموش ہو کر سوچنے لگا' پھر ذرا جھجکتے ہوئے بولا۔ "مستری کے یہاں سے کچھ لے آؤ۔"

وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر بولی۔ "مستری کے یہاں سے؟ آج ہی تو آپ نے منع کیا تھا۔ میں تو اس کے در پر اب تھوکنے کی بھی نہیں۔"

وہ اسے منانے لگا۔ "سنو تو' کہا ہم جلد ہی تمہارا سارا قرضہ ادا کر دیں گے اور اس میں کچھ جھوٹ بھی نہیں' مسلم اسکول کے سیکرٹری نے آج مجھے بلایا بھی ہے۔"

وہ آمادہ نہ ہوئی۔ "وہ تو روز بلاتا ہے' مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔" پھر اس نے عاجزی سے کہا۔ "خدا کے لیے مجھے وہاں نہ بھیجیے' بڑی شرم معلوم ہوتی ہے۔ پھر آج تو آپ سے اس کی اچھی خاصی جھائیں جھائیں بھی ہو گئی۔"

سکندر علی خاموش ہو کر انگلی سے اپنے بالوں کو کریدنے لگا۔ اتنے میں سمیع نکل کر باہر دالان میں آ گیا۔ کہنے لگا "نہیں بھائی صاحب! آپ چائے کا تکلف نہ کیجیے۔ خواہ مخواہ بھابی کو تکلیف ہو گی۔" اور وہ روٹھا ہوا سا منہ لے کر باہر چلا گیا۔ سکندر علی نے اسے روکا بھی' مگر وہ نہ رکا اس نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔

سکندر علی کمرے میں واپس گیا' اس نے دیکھا کہ رکابی خالی پڑی تھی۔ اس کی غیر حاضری میں بچوں نے اسے صاف کر دیا تھا۔

غصے سے اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ بچوں کو اس کا پہلے ہی علم تھا لہٰذا وہ گھر سے سٹک گئے تھے۔ اس نے جھنجھلاہٹ میں رکابی اٹھا کر باہر آنگن میں پھینک دی۔ کچھ دیر غیظ و غضب کے عالم میں بیٹھا رہا' پھر اٹھا۔ اپنا ٹرنک کھولا اور کپڑوں کو الٹ پلٹ کر نیچے سے اپنی سرج کی شیروانی نکالی۔ اسے پہنا اور تیزی سے باہر چلا گیا۔ بیوی نے اسے باہر جاتے ہوئے دیکھا۔ مگر شیروانی پر نظر پڑی تو اسے تعجب ضرور ہوا۔ اسے تعجب کا باعث یہ تھا کہ سکندر علی اس اونی شیروانی کو خاص خاص موقعوں پر پہنا کرتا تھا اور اسے بڑی حفاظت سے رکھتا تھا۔ جب وہ اسے پہنتا تو بیوی کے سامنے اس طرح اترا اترا کر چلتا کہ اس کا ہر انداز چیخ چیخ کر کہتا۔ ''دیکھو کیسا جچ رہا ہوں کیا ٹھاٹھ ہیں اپنے۔'' بلکہ ایک بار وہ اپنے سکول کی کسی تقریب سے لوٹ کر آیا تو بار بار اسے ہنسی آ رہی تھی۔ بیوی نے پوچھا تو کہنے لگا۔ ''آج بڑا عجیب واقعہ پیش آیا۔ سکول کے جلسے میں جو بھی آتا' وہ مجھی کو ہیڈ ماسٹر سمجھتا۔ پہلے مجھ سے مصافحہ کرتا۔ ہیڈ ماسٹر جل بھن کر رہ گیا۔'' وہ جانتی تھی کہ یہ سب کچھ شیروانی کی شان میں قصیدہ خوانی ہو رہی ہے۔ مگر آج اس شیروانی کو کیوں نکالا گیا؟ پھر اسے خود ہی خیال آ گیا کہ مسلم اسکول کے سیکرٹری سے ملنے گئے ہوں گے اور اس احساس نے اسے امید اور ناامیدی کے دوراہے پر لا کر چھوڑ دیا۔

سکندر علی گھر سے نکل کر پرانے کپڑے فروخت کرنے والوں کی دکان پر پہنچا۔ آنے کو تو وہ اس بازار میں آ گیا مگر کسی دکان میں جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ آخر وہ ایک دکان میں جہاں بالکل سناٹا تھا' اللہ کا نام لے کر داخل ہو گیا۔ دکان میں الماریوں کے اندر ہینگروں پر' دیواروں پر ہر جگہ انگریزی وضع کے لباس ٹنگے تھے۔ بعض ایسی اچھی حالت میں تھے کہ ایسے اعلیٰ درجوں کے سلے ہوئے تھے کہ اسے اپنی شیروانی گھٹیا معلوم ہونے لگی۔ دکاندار اٹھ کر اس کے پاس آیا۔

''کیا چاہیے؟'' پھر اس نے خود ہی کہا۔ ''کوٹ دکھاؤں' کوئی سوٹ؟ ہمارے یہاں جو نیا مال آیا ہے اس میں تو ایسے ایسے کوٹ ہیں کہ نیا اس کے سامنے شرما جائے' خالص فارن مال ہے۔''

سکندر علی نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ''آپ کے یہاں شیروانیاں نہیں ہوتیں؟''

دکاندار مسکرانے لگا۔ ''نہیں صاحب! شیروانیاں کیسے ہو سکتی ہیں۔ یہ سب کپڑے تو امریکہ سے آئے ہیں۔''

سکندر کہنے لگا۔ ''شیروانی اور اسی قسم کے کپڑے آپ یہاں سے خرید لیا کیجئے۔''

دکاندار اونچی آواز میں بولا۔ ''ارے صاحب! آپ بھی کمال کرتے ہیں' امریکہ میں تو ہر سیزن میں کپڑے آؤٹ آف ڈیٹ ہوتے ہیں۔ وہاں ہر سال فیشن بدلتا ہے۔ نئے سے نئے کپڑے ایک دم کنڈم کر دیئے جاتے ہیں۔ یہاں تو لوگ دس دس سال ایک

کپڑے کو رگڑتے ہیں۔ اب اپنی اس شیروانی ہی کو دیکھ لیجیے۔ سات آٹھ سال سے کم کی کیا بنی ہوگی۔ ایسے کپڑے لے کر دکان پر لگائے جائیں تو آپ ہی بتایئے! کون ان کو خریدنے آئے گا۔"

سکندر علی جل بھن کر رہ گیا۔ اپنی شیروانی کی وہ اس قدر ہتک برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اسی اثناء میں دکان کے اندر ایک گاہک آ گیا۔ دکاندار اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ سکندر علی پیچ و تاب کھاتا باہر آ گیا۔ کسی اور دکان پر جانے کی ہمت نہ پڑی۔

شام کو جب وہ لوٹا تو گھر میں اندھیرا پڑا تھا۔ بچے چیخ چیخ کر رو رہے تھے۔ بیوی حسب معمول ان کو کوسنے دے رہی تھی۔ وہ چپ چاپ جا کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد بیوی نے آ کر پوچھا۔ "سیکرٹری صاحب سے کچھ بات ہوئی۔"

وہ اسے مایوس نہ کر سکا۔ "پرسوں پھر بلایا ہے۔"

وہ بولی "تو کچھ امید ہے۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں؟" بیوی کو دلاسا دینے کے لیے اس نے نہایت صفائی سے جھوٹ بولا۔

اندھیرا اور گہرا ہو گیا تھا۔ وہ ایک بوسیدہ سرکاری کوارٹر میں رہتا تھا۔ جس کی بجلی نہ جانے کب کی کٹ چکی تھی۔

سکندر علی نے شیروانی اتار کر کھونٹی پر لٹکا دی اور نڈھال ہو کر بستر پر لیٹ گیا۔ سردی بڑھتی جا رہی تھی۔ بچے روتے روتے سو گئے تھے۔ مگر سکندر علی کی آنکھوں میں دور دور تک نیند کا گزر نہ تھا۔ ہر طرف ایک ایسا گھپ اندھیرا تھا کہ اس کا دم گھٹنے لگا۔ آخر وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اٹھا اور کمرے سے نکل کر بے چینی سے دالان میں ٹہلنے لگا۔ گھر پر موت کی سی ویرانی چھائی تھی۔ اس نے بیوی سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ آج لالٹین کیوں نہیں روشن کی۔ پوچھنے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ اسے بخوبی اندازہ تھا کہ مٹی کا تیل ختم ہو چکا ہے اور اسے خریدنے کے لیے گھر میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔

ٹہلتے ٹہلتے اس نے کچھ سوچا۔ کمرے میں واپس آ گیا۔ شیروانی پہنی۔ بڑے لڑکے کو اٹھایا۔ وہ ابھی سویا نہیں تھا۔ مٹی کے تیل کی بوتل اس کے ہاتھ میں تھمائی اور اپنے ساتھ لے کر گھر سے باہر چلا گیا۔

بیوی نے خاموشی سے سب کچھ دیکھا مگر کچھ بولی نہیں دم بخود لیٹی رہی۔

باہر آ کر وہ سیدھا محلے کے پرچونیئے کی دکان پر پہنچا۔ سردی کی وجہ سے سر شام ہی سناٹا پڑ گیا تھا۔ دکان پر اس وقت سوائے دکاندار کے کوئی اور موجود نہ تھا۔ سکندر علی نے مسکرا کر نرم لہجے میں اسے مخاطب کیا۔

''خان صاحب! تم نے ابھی تک دکان نہیں بڑھائی۔''

وہ کہنے لگا ''بس بند کرنے ہی جا رہا تھا۔ آج سردی بھی کچھ زیادہ ہے۔''

سکندر علی نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ آج سردی کچھ چمک گئی ہے۔ مگر تمہارا کیا ہے بھائی' تم تو سنا ہے کہ آج کل بادام کا نشاستہ پیتے ہو۔'' وہ خواہ مخواہ بے تکلفی برتنے لگا۔ صحت بھی ماشاءاللہ ادھر اچھی ہوگئی ہے۔ سچ تو یہ ہے خان صاحب! تم پر تو پھر سے جوانی آ گئی ہے۔'' سکندر علی یہ کہہ کر ہنسنے لگا۔ دکاندار بھی مسکرا دیا۔

''ماسٹر صاحب کیوں ایسی باتیں کرتے ہو' غریب آدمی ہوں۔ بال بچوں کا کسی نہ کسی طرح پیٹ پال لیتا ہوں۔''

سکندر علی نے جھٹ اس کی تائید کی۔ ''ہاں بھئی تمہاری ہمت پر آفرین ہے۔ اکیلے دم پر اتنا بڑا ٹبر سنبھالے ہوئے ہو۔'' پھر اس نے فوراً ہی بات کا رخ بدل کر کہا۔ ''ذرا ایک بوتل مٹی کا تیل تو دینا۔'' اور بیٹے سے بوتل لے کر اس کی طرف بڑھا دی۔ دکاندار نے بوتل میں تیل بھر دیا۔

سکندر علی نے بوتل بیٹے کو دے کر کہا۔ ''اچھا تم چلو' امی سے کہنا میں ابھی آتا ہوں۔'' وہ گھر کی طرف چل دیا۔ سکندر علی دکاندار کی طرف متوجہ ہوگیا۔ ''خان صاحب! اس کے پیسے کل آ جائیں گے۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا۔۔۔۔۔۔''

دکاندار نے فوراً مداخلت کی۔ ''ماسٹر جی! اس طرح کام نہیں چلے گا۔''

وہ خواہ مخواہ ہنسنے لگا۔ ''اماں! اس طرح بھی کام چلتا ہے۔'' اس نے فوراً بات کا رخ بدلنے کی کوشش کی۔ ''ہاں تو میں۔۔۔۔۔۔''

دکاندار نے پھر اسے ٹوکا۔ ''نہیں جی! قرض ادھار میں نے بالکل بند کر دیا ہے۔ لڑکے کو بلا لیجیے۔'' اس نے سکندر علی کو کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ لڑکے کو آواز دے کر واپس بلا لیا۔ اس سے بوتل لی اور کنستر میں تیل انڈیل کر خالی بوتل اس کو تھما دی۔ بچہ سہما ہوا باپ کی طرف دیکھنے لگا۔ سکندر علی نے جھینپ مٹانے کی کوشش کی۔ ''خان صاحب! بعض وقت تو تم ایسی بے مروتی پر اتر آتے ہو کہ بالکل مارواڑی بن جاتے ہو۔ تمہارے پیسے لے کر یہاں سے بھاگنے سے تو رہا۔''

مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ تہمد سنبھالتا ہوا اٹھا اور دکان بند کرنے کی غرض سے قفل نکالنے لگا۔ سکندر علی ذرا دیر تک گم صم کھڑا رہا' پھر دکان سے ہٹ آیا۔ بیٹے کو گھر جانے کی ہدایت کی۔ خود دودھ والے کی دکان کی طرف چل دیا۔ گھر جا کر کرتا بھی کیا۔ گھپ اندھیرے سے وحشت ہوتی تھی۔

دودھ والے کی دکان پر دھندلی سی لالٹین جل رہی تھی۔ بھٹی پر دودھ سے بھرا ہوا کڑھاؤ چڑھا تھا اور تین گاہک سامنے بنچ پر بیٹھے دودھ پی رہے تھے۔ سکندر علی بھی وہاں پہنچ گیا۔ ''کہو بھئی پہلوان کیا حال احوال ہے؟''

''ماسٹر جی، سب خدا کا شکر ہے۔''

''ہاں میاں، ہر حال میں اس کا شکر ادا کرنا چاہیے وہ بڑی شان والا ہے۔''

دودھ والا اپنی بات کہہ کر فوراً کام میں مصروف ہو گیا۔ سکندر علی وہیں بنچ پر بیٹھ گیا اور بے قرار نظروں سے کڑھاؤ میں بھرے ہوئے گرم گرم دودھ کو تکنے لگا۔ جو گاہک وہاں بیٹھے تھے کچھ دیر بعد اٹھ کر چل دیئے۔ اب دکان پر سناٹا چھا گیا تھا۔ پہلوان کے علاوہ دکان میں سامنے پلنگ پر ایک شخص رضائی اوڑھے پڑا سو رہا تھا۔ ذرا دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ پھر دکاندار کہنے لگا۔ ''ماسٹر جی! اب کسی چیز میں برکت نہیں رہی۔''

وہ بولا ''ہاں بھئی، برکت رہے بھی تو کیسے؟ لوگوں کی اب وہ نیتیں نہیں رہیں۔ وہ ایمان نہیں رہے۔''

''بالکل ٹھیک کہا آپ نے جی دنیا کا یہی حال ہے۔'' پھر وہ دکانداری کے خراب ہونے کا رونا رونے لگا۔ ''اب کیا بتاؤں آپ سے، کس طرح دکانداری چلتی ہے۔ لوگوں کو کھانے کو تو میسر نہیں۔ بے چارے دودھ کہاں سے پئیں۔''

سکندر علی نے باتوں میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔ ''عجیب زمانہ آیا ہے، ایسا تو کبھی دیکھا اور نہ خدا دکھائے۔ ایک یہ وقت ہے۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا۔ خدا بخشے والد مرحوم حیات تھے۔ حویلی کے وسیع احاطہ میں بھینسیں بندھی رہتی تھیں۔ گابھن ہوئی تو گاؤں بھجوا دی۔ دوسری بلوالی۔ دونوں وقت میں ۲۵ سیر تک دودھ دیا ہے ہماری بھینسوں نے۔ ابا جان سر پر سوار ہو کر زبردستی دودھ پلواتے تھے۔ جہاں ان کی نظر بچی اور میں نے جھٹ سے کٹورا اوندھا کر دیا۔ اماں تم کو تعجب ہوگا۔ ہمارے آنگن کا فرش کچا تھا۔ جہاں میں دودھ ڈالتا تھا وہاں کی زمین ایسی چکنی ہو گئی تھی کہ نچوڑ تو چکنائی ٹپک پڑے۔''

پہلوان نے فوراً تائید کی۔ ''کیوں نہیں، ماسٹر جی! کیوں نہیں۔ اس دودھ کی کیا بات تھی۔''

سکندر علی جیسے اسے مرعوب کرنے پر تلا ہوا تھا۔ کہنے لگا۔ ''سستا زمانہ تھا، دو روپے میں نوکر مل جاتا تھا۔ گھر میں خدا جھوٹ نہ بلائے تو کوئی درجن بھر ملازم ہوں گے۔ پوری پلٹن کی پلٹن تھی۔ اس خیال سے کہ ابا جان ہم کو دودھ نہ پلا دیں۔ چپکے چپکے ان کو گلاس بھر بھر کر پلا دیتے تھے۔ سالے پھول پھول کر کٹھنا ہاتھی ہو گئے تھے۔''

پہلوان نے اس دفعہ بات کا جواب نہیں دیا۔ ہوا یہ کہ دودھ نکالنے کا ڈونگا اس کے ہاتھ سے پھسل کر نیچے گر گیا تھا۔ وہ اسے

اٹھانے کے لیے دوسری طرف جھک گیا۔ سکندر علی کی جانب اس کی پیٹھ تھی۔ اچانک اس کی نظر لکڑی کی اس صندوقچی پر پڑ گئی جو کھلی ہوئی تھی۔ اس میں کچھ ریزگاری تھی۔ چند روپے تھے اور دس روپے والا ایک نوٹ بھی تھا۔ سکندر علی نے لمحہ بھر تک اس طرف دیکھا۔ اپنی جگہ سے اٹھا بلی کی طرح چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا اور ہاتھ بڑھا کر جھپاک سے دس کا نوٹ اٹھا لیا۔ اس وقت پہلوان دودھ کا ڈونگا اٹھا کر اپنی جگہ آ گیا۔ سکندر علی نے گھبرا کر نوٹ شیروانی کی نچلی جیب میں ڈال لیا اور شیروانی کی سلوٹیں درست کرتا ہوا پھر بنچ پر بیٹھ گیا۔ مگر گھبراہٹ ہنوز طاری تھی۔

دودھ والے نے اس کے چہرے کا رنگ متغیر دیکھا تو حیران ہو کر پوچھا۔ ''کیوں ماسٹر جی! کیا بات ہے؟ کچھ پریشان لگ رہے ہو۔''

سکندر علی نے خود کو سنبھالا۔ فوراً بات بنائی۔ ''کچھ نہیں بھئی! بیٹھے بیٹھے پیٹ میں اچانک مروڑ سی معلوم ہوئی۔ خدا خیر کرے۔'' ذرا دیر وہ خاموش بیٹھا رہا۔ پھر اس نے بے چین ہو کر پہلو بدلا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

پہلوان کو نہ جانے کیا خیال آیا کہ گلے سے روپے نکال کر گننے لگا۔ روپے گنتے گنتے چونک کر بولا ''یہ دس کا نوٹ کہاں گیا؟''

سکندر علی اور گھبرا گیا۔ اس نے سوچا' اب یہاں سے کھسک جانا ہی بہتر ہوگا۔ اس نے اپنا خالی پیٹ خواہ مخواہ دونوں ہاتھوں سے دبوچ لیا۔ ''بھئی بڑی تکلیف ہو رہی ہے۔ میں تو اب چلا۔''

دودھ والے نے جیسے اس کی اَن سنی ہی نہیں۔ نوٹ کے غائب ہو جانے سے وہ سخت پریشان ہو گیا تھا۔

اسی اثنا میں پلنگ پر لیٹا ہوا آدمی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے پہلوان سے پوچھا۔ ''چاچا کیا ڈھونڈ رہے ہو؟''

''دس روپے کا ایک نوٹ جانے کہاں چلا گیا؟''

سکندر علی اب دکان سے آگے بڑھ چکا تھا۔ وہ بے حد گھبرایا ہوا تھا۔

اس نے چند ہی قدم کا فاصلہ طے کیا تھا کہ کسی نے اس کا کندھا پکڑ کر کہا۔ ''ذرا ادھر آنا جی'' سکندر علی نے گھوم کر دیکھا۔ پہلوان کا بھتیجا قہر آلود نظروں سے اس کی جانب گھور رہا تھا۔ اس نے سکندر علی کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور دس کا نوٹ نکال کر سامنے کر دیا۔

''چاچا! یہ رہا نوٹ'' وہ مسکرا کر داد طلب نگاہوں سے دودھ والے کو دیکھنے لگا۔

ہوا یہ کہ گھبراہٹ میں سکندر علی نے نوٹ اس طرح رکھا تھا کہ جیب سے اس کا ایک کونا صاف دکھائی دے رہا تھا۔ دکاندار ایک دم آپے سے باہر ہو گیا۔ غضب ناک ہو کر دکان سے نیچے کودا۔ تیزی سے سکندر علی کی جانب لپکا اور قریب پہنچ کر سکندر علی کی کمر پر اس

زور سے لات ماری کہ وہ منہ کے بل زمین پر گر پڑا۔ مگر فوراً اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور کپڑے جھاڑنے لگا۔ اس کی آواز اس قدر بھرائی ہوئی تھی کہ منہ سے بول نہیں پھوٹ رہا تھا۔ لیکن پہلوان نے ایک لات مارنے پر اکتفا نہیں کیا جھپٹ کر اس کا گریبان پکڑ لیا اور گالیاں دینے لگا۔

سکندر علی نے آہستہ سے کہا۔ "اماں گریبان تو چھوڑو۔ دم گھٹا جا رہا ہے۔"

پہلوان نے اس کے منہ پر کس کے تھپڑ مارا۔ چیخ کر بولا "حرام کے تخم! شرم نہیں آتی چوری کرتے ہوئے۔"

سکندر علی نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "اچھا گریبان تو چھوڑو میری سرج کی شیروانی کا کالر خراب ہو جائے گا۔"

دودھ والے نے اس زور کا جھٹکا دیا کہ شیروانی کندھے پر سے پھٹ کر کمر تک آ گئی۔ اور اس کے ساتھ ہی اس نے پھر اسے مارنا شروع کر دیا اور چیخ چیخ کر کہنے لگا۔

"سالے چور! مار مار کر تیرا بھرکس نکال دوں گا۔ تو اسی لیے اتنی رات کو دکان پر آیا تھا؟"

سکندر علی آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ "تم اتنا شور کیوں مچا رہے ہو؟ تمہارا نوٹ مل گیا ہے۔ اب مجھے چھوڑ دو۔ تم نے اتنا مار بھی لیا ہے اب اور کیا چاہتے ہو؟"

مگر پہلوان ذرا متاثر نہ ہوا۔ کہنے لگا۔ "میں تجھے تھانے لے جاؤں گا۔ سالے تجھ کو نہیں چھوڑوں گا۔"

شور سن کر پاس پڑوس کے رہنے والے گھروں سے نکل نکل کر وہاں اکٹھا ہونے لگے۔ پہلوان نے اب سکندر علی کی قمیض کا گریبان پکڑ لیا تھا۔ وہ بار بار کہہ رہا تھا۔ "بھئی میری بات تو سنو۔۔۔۔۔۔" اتنے میں ایک شخص بڑھ کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ وہ سرکاری محکمے میں ملازم تھا اسے سکندر علی کی ناگفتہ بہ حالت پر ترس آ گیا۔ اس نے پہلوان سے ڈپٹ کر کہا۔ "گریبان تو چھوڑو۔"

پہلوان نے گریبان چھوڑ دیا۔ اس نے سکندر علی کو شائستگی سے مخاطب کیا۔ "ماسٹر صاحب! پہلے آپ بتایئے کی بات کیا تھی۔"

سکندر علی کو ذرا سہارا ملا تو اس نے خود کو سنبھالا۔ ڈھٹائی سے بولا "جناب میں شریف آدمی ہوں یہ بدقماش لوگ ہیں۔ خواہ مخواہ میرے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ مجھ پر چوری کا الزام لگا رہے ہیں۔ دیکھئے میری اتنی قیمتی شیروانی بھی پھاڑ ڈالی اور برابر پیٹ رہے ہیں۔"

وہ بھیگی بلی بنا ہوا رقت انگیز لہجے میں صفائی پیش کر رہا تھا۔ خدا کی قسم میں نے اس کا نوٹ دیکھا تک نہیں۔"

پہلوان کا بھتیجا غضب ناک ہو کر چیخا۔ "او سور کے بچے جھوٹے! ابھی تو تیری جیب سے میں نے چوری کا نوٹ نکالا ہے۔"

سکندر علی کے جھوٹ بولنے پر پہلوان کو پھر غصہ آ گیا۔ وہ اسے موٹی موٹی گالیاں دینے لگا۔ اس نے جھپٹ کر ایک بار پھر اس کا

گریباں پکڑ لیا اور سکندر علی کے حمایتی کی طرف آنکھیں نکال کر بولا "دیکھیے بابو جی! آپ اس معاملے میں نہ بولیے ورنہ بات بڑھ جائے گی۔"

بے چارے بابو جی پہلوان کی خون خوار آنکھوں سے مرعوب ہو گئے۔ وہ بات کو آگے نہ بڑھا سکے اور آہستہ سے کھسک کر پیچھے آ گئے۔ پہلوان بضد تھا۔ کہ وہ سکندر علی کو تھانے ضرور لے جائے گا۔ اسی اثنا میں کسی نے ہجوم میں سے چیخ کر کہا۔

"پہلوان تھانے لے جا کر کیا کرو گے۔ خواہ مخواہ رات کی نیند حرام کرو گے۔ عدالت میں پیشیاں الگ بھگتنا پڑیں گی۔ میرا کہا مانو تو دس بیس جوتے مار کر چھوڑ دو۔ سالا بال بچے والا ہے' یہ تو جیل چلا جائے گا وہ بے چارے بھوکے مریں گے۔"

پہلوان اس تجویز کو قبول کرنے میں ہچکچا رہا تھا۔ اتنے میں اس شخص نے' جس نے یہ مشورہ دیا تھا' پیر سے جوتا اتارا اور دھڑا دھڑ جوتے مارنا شروع کر دیے۔

سکندر علی چیختا رہا۔ دہائی دیتا رہا۔ "بھائی میری بات تو سنو' میں شریف آدمی ہوں۔" مگر وہاں کون اس کی سنتا۔ وہ قسمیں کھاتا رہا۔ اپنی بے گناہی ثابت کرتا رہا۔ مگر جوتے دھڑا دھڑ پڑتے رہے۔ پھر اس شخص نے ہاتھ روک کر ہانپتے ہوئے کہا۔ "اچھا اب اس کو جانے دو۔" اور وہ سکندر علی کا ہاتھ پکڑ کر بھیڑ سے نکال لایا اور جھک کر سرگوشی کی۔

"کہو استاد کیسا صاف بچوا دیا۔ ورنہ ابھی حالات میں ہوتے۔ تم شریف آدمی ہو۔ اسی کو غنیمت جانو۔"

سکندر علی کو اس پر سخت غصہ آیا۔ مگر وہ کرتا بھی کیا۔ چپ چاپ شریف آدمی کی طرح سر جھکائے آگے بڑھ گیا۔

گھر میں جا کر اس نے دیکھا' کمرے میں روشنی ہو رہی تھی اور بیوی جاگ رہی تھی۔ اس کی پھٹی ہوئی شیروانی اور بگڑا ہوا حلیہ دیکھ کر بولی۔ "ہے ہے کیا ہو گیا؟ کسی سے لڑ کر آئے ہو؟ شور میں نے بھی سنا تھا۔"

وہ خشم گیں نظروں سے گھور کر بولا "کچھ نہیں ہوا۔"

وہ پریشان ہو کر اصرار کرنے لگی۔ "کچھ تو بتاؤ' ہوا کیا؟"

وہ بگڑ کر بولا "یہ روشنی کمرے میں کیسی ہو رہی ہے؟ تم پھر اس خبیث مستری کے یہاں گئی تھیں۔ میں نے ہزار دفعہ سمجھایا کہ وہاں نہ جایا کرو۔ مگر تم تو ذات کی مراثن ہو میراثن۔ کمین خصلت کہیں جا سکتی ہے۔"

وہ سراسیمہ ہو کر عاجزی سے بولی۔ "اس کے یہاں کب گئی تھی۔ آپ کے جانے کے بعد' یہ بچے سب جاگ اٹھے تھے۔ ان کو بہلانے کے لیے کلب کی طرف لے گئی تھی۔ وہاں آج کوئی بڑا جشن تھا۔ بہت بھاری دعوت تھی۔ خوب روشنی ہو رہی تھی۔ بینڈ بج رہا

تھا۔عورتیں اور مرد مل کر ناچ رہے تھے۔۔۔۔۔۔" وہ بچوں کی طرح ایک ایک بات تفصیل سے مزا لے لے کر بتا رہی تھی۔" وہیں کوڑے کے ڈرم میں سے بچے نہ جانے کیسے ایک موم بتی ڈھونڈ لائے۔ اسی کو میں نے جلا دیا۔"

سکندر علی خاموش بیٹھا اس کی باتیں سنتا رہا۔ دفعتاً اس نے فرش پر پڑے ہوئے توسٹ کے ایک ٹکڑے کو دیکھا اور نفرت سے منہ بگاڑ کر بولا۔" اور وہیں کوڑے کے ڈھیر سے لوگوں کے آگے کا بچا کھچا کھانا بھی اٹھا لائیں۔ میں کہتا ہوں تم کیوں میری عزت کے پیچھے پڑی ہو۔ دنیا میں ایسی بھی عورت ہیں جن پر سات سات وقت کا فاقہ پڑتا ہے اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی اور ایک تم ہو۔۔۔۔۔۔"

بیوی کی چوری پکڑی گئی تھی۔ وہ جھنجلا کر بولی۔" آخر میں کیا کروں؟ ان حرام زادوں نے میری بوٹیاں نوچنی شروع کر دی تھیں۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

سکندر علی کو اس کا رونا پیٹنا سخت ناگوار گزرا۔ وہ غضب ناک ہو کر بیوی پر جھپٹا اور اس کے بال پکڑ کر اس زور سے کھینچا کہ وہ فرش کے بل گر پڑی۔ سکندر علی اس وقت واقعی دیوانہ ہو گیا تھا۔ اس نے بیوی کی کمر پر اور پیٹھ پر جوتوں کی ٹھوکریں مارنا شروع کر دیں۔

شور سن کر بچے بھی جاگ اٹھے اور چیخ چیخ کر رونے لگے۔ سکندر علی نے چیخ کر انہیں ڈانٹا۔" چپ ہو جاؤ سور کے بچو!" مگر دوسور کے بچے تو ڈانٹ سن کر خاموش ہو گئے البتہ سور کی بچی اور چیخ چیخ کر رونے لگی۔ سکندر علی نے جھنجلا کر اس کے منہ پر اس زور سے تھپڑ مارا کہ وہ لڑھکتی ہوئی بستر کے دوسرے کنارے تک چلی گئی اور خوفزدہ ہو کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگی۔

سکندر علی لمحہ بھر تک سہمی ہوئی معصوم بچی کی جانب گھورتا رہا پھر اسے خود ہی اپنی حالت پر ترس آ گیا۔ وہ وحشیوں کی طرح پلٹا اور دیوار پر سر دے مارا۔" اور لو اور لو اور لو" وہ دیوانوں کی طرح دیوار پر ٹکریں مارتا رہا۔ اس کا سر پھٹ گیا اور خون بہتا ہوا اسکے چہرے پر پھیل گیا۔

دھندلی روشنی میں خون سے لتھڑا ہوا اس کا چہرہ بہت خوفناک نظر آ رہا تھا۔ بچے چیخ کر ایک دوسرے سے چمٹ گئے تھے۔ لیکن سکندر علی زیادہ دیر کھڑا نہ رہ سکا۔ اس کے پیر کانپنے لگے تھے۔ وہ نڈھال ہو کر لڑکھڑایا اور فرش پر گر کر بے ہوش ہو گیا۔

بہت دیر بعد اس کی آنکھ کھلی۔ اس نے دیکھا۔ کمرے میں گھور اندھیرا تھا۔ ہر طرف گہرا سکوت تھا اور اس کے سر میں درد ہو رہا تھا۔ اس نے سر پر ہاتھ پھیرا تو محسوس ہوا اس کی پیشانی پر پٹی بندھی تھی۔ وہ دیر تک اسی طرح پڑا رہا۔ اس کا ذہن ہر خیال سے خالی ہو چکا تھا اور پیٹ میں آگ سی لگ رہی تھی۔

وہ آہستہ سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے اندھیرے میں ہر طرف نظریں دوڑائیں مگر سوائے اس کے کچھ اندازہ نہ ہوا کہ سب سو رہے ہیں۔ وہ کمرے سے نکلا اور چپ چاپ گھر سے باہر چلا گیا۔

کلب میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ روشنیاں بجھ چکی تھیں۔

کلب کے پچھواڑے دیوار کے سائے میں چند کتے موجود تھے۔ وہ غرا رہے تھے۔ آپس میں لڑ رہے تھے۔ سکندر علی آہستہ آہستہ چلتا ہوا قریب پہنچ گیا۔ کتے اسے دیکھ کر غرائے۔ بھونکے بھی اور پھر وہاں سے بھاگ گئے۔

اس کے چاروں طرف طرح طرح کے کھانوں کی خوشبو پھیل ہوئی تھی۔ اس نے کئی بار گہری سانس بھری کھانوں کی خوشبو کی لذت کو محسوس کیا۔ چوکنا نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ زیر لب مسکرا کر سوچا' بھلا اتنی رات گئے یہاں کون آنے لگا۔ اس نے جھک کر روٹی اور گوشت کے کچھ بچے کھچے ٹکڑے کوڑے کے ڈھیر میں سے ڈھونڈ کر نکالے اور وہیں بیٹھ کر ہبڑ ہبڑ کھانے لگا۔

اچانک کوڑے کے بڑے ڈرم کے عقب سے ایک انسانی سایہ ابھرا۔ اچانک گھٹی ہوئی نسوانی چیخ سنائی دی۔ وہ اس طرف بڑھا۔ قریب جا کر دیکھا' یہ اس کی بیوی تھی۔ دونوں لمحہ بھر تک ہکا بکا کھڑے رہے۔ پھر سکندر علی نے مسکرا کر ایک ٹکڑا بیوی کی طرف بڑھایا۔ آہستہ سے کہا۔ ''لو اسے کھاؤ بہت مزیدار ہے۔'' بیوی نے چپ چاپ ہاتھ بڑھا کر اسے لے لیا۔

◆◆◆

تماشائے اہل کرم

سڑک کے ایک موڑ سے اچانک کتوں کا غول نمودار ہوا۔ کتے کار کے ساتھ ساتھ دوڑ رہے تھے اور زور زور سے بھونک بھی رہے تھے۔ سلیم احمد خان درانی نے مڑ کر ان کی جانب دیکھا اور جھنجھلا کر بڑبڑانے لگا۔ سامنے نظر ڈالی تو دل دھک سے رہ گیا۔ ایک سایہ کار کی بتیوں کی تیز روشنی میں لہرایا۔ درانی نے گھبرا کر بریک لگانے کی کوشش کی۔ اندھیرے میں ہولناک چیخ ابھری۔ کار زور سے اچھلی اور بے قابو ہو کر سڑک کے کنارے لگے ہوئے ٹیلیفون کے کھمبے سے ٹکرا کر رک گئی۔

حادثہ اس قدر آناً فاناً ہوا کہ درانی دم بخود رہ گیا۔ چند لمحے تک ہکا بکا سا اسٹیرنگ وہیل کے سہارے بت بنا بیٹھا رہا۔ ذرا ہوش ٹھکانے آئے تو وہ سنبھلا۔ خیریت ہوئی کہ جسم پر کہیں چوٹ چپٹ نہیں آئی تھی۔ وہ بالکل محفوظ تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ کھولا اور کار سے نکل کر باہر آ گیا۔

سڑک کے بیچوں بیچ کوئی اندھیرے میں بے حال پڑا تھا اور رک رک کر کراہ رہا تھا۔ درانی نے اس کی کراہ سنی دم بھر کے لیے ٹھٹکا' پھر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا اور اس کے قریب پہنچ گیا۔ تاروں کی دھندلی دھندلی روشنی میں درانی نے غور سے دیکھا' ایک لمبا چوڑا آدمی اوندھے منہ سڑک پر لیٹا ہے۔ اس کے آس پاس خون ہی خون پھیلا ہوا تھا۔ دور دور تک کسی کا نام و نشان نہ تھا۔ ہر طرف اندھیرا تھا اور گہری خاموشی چھائی تھی۔

درانی نے چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا' جھکا اور سڑک پر پڑے ہوئے زخمی شخص کے بازوؤں کو دونوں ہاتھوں سے تھاما' اپنی طرف کھینچا اور اسے گھسیٹتا ہوا کسی نہ کسی طور سڑک کے کنارے لے گیا۔

اس نے اب کراہنا بند کر دیا تھا اور رک رک کر سانس لے رہا تھا۔ درانی نے اس کی یہ تشویش ناک حالت دیکھی تو پریشان ہو گیا۔ موقع غنیمت تھا۔ اس نے فرار ہونے کا منصوبہ باندھا۔ زخمی کو اس کے حال پر چھوڑا۔ کار کی سمت بڑھا اور اندر جا کر اسے دوڑانے کی کوشش کی۔ مگر انجن اسٹارٹ نہ ہوا۔

ہر طرح کی کوشش کے باوجود جب انجن سٹارٹ نہ ہوا اور کار ٹس سے مس نہ ہوئی تو مجبوراً وہ باہر آ گیا۔ سہما ہوا سا خون میں ڈوبے ہوئے آدمی کے پاس گیا۔ وہ اب تک بے سدھ پڑا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور سانس بہت آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ درانی

خوفزدہ نظروں سے دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ اب کیا کیا جائے۔

کئی بار اس نے ارادہ کیا کہ کار چھوڑ کر بھاگ جائے مگر وہ ایسا نہ کر سکا۔ جائے واردت پر کار کی موجودگی اس کے خلاف پورا پورا ثبوت بہم پہنچا سکتی تھی۔

درانی کی پریشانی اور گھبراہٹ دم بدم بڑھتی جا رہی تھی۔ سڑک بالکل ویران تھی۔ آس پاس آبادی بھی نہ تھی۔ سڑک کے دونوں جانب بنجر اور چٹیل میدان تھا' جس میں کہیں کہیں خودرو اور جنگلی پودوں کی جھاڑیاں تھیں۔ درانی کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ وہ گم صم کھڑا تھا۔ کئی منٹ اسی گومگو کے عالم میں گزر گئے۔ ناگاہ دور سے روشنی ابھری اور سڑک پر پھیلنے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک ٹرک سامنے سے نمودار ہوا اور رفتہ رفتہ قریب آتا گیا۔

درانی نے اپنے حواس درست کئے۔ آگے بڑھا اور ہاتھ ہلا ہلا کر ٹرک ٹھہرانے کی کوشش کی۔ ٹرک نزدیک پہنچ کر رک گیا۔

درانی نے اونچی آواز سے کہا۔ ''ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔''

ٹرک کے اندر ڈرائیور کے علاوہ کلینر بھی تھا۔ دونوں نے جھک کر باہر دیکھا۔ ان کے سامنے خون میں لتھڑا ہوا ایک کالا کلوٹا آدمی مردے کی مانند بے حال پڑا تھا۔ قریب ہی درانی کی کار کھڑی تھی جس کا بونٹ ٹیلی فون کے کھمبے سے ٹکرا کر ٹیڑھا ہو گیا تھا۔ کھمبا بھی کار کی ٹکر سے ایک طرف جھک گیا تھا۔

''زبردست ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔'' ڈرائیور نے زخمی کی جانب ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے دریافت کیا۔ ''کیا ایک دم سامنے آ گیا تھا؟''

''باتیں کرنے کا وقت نہیں ہے۔'' درانی نے مڑ کر زخمی کو دیکھا جو ٹرک کی بتیوں کی تیز روشنی میں بے جان نظر آ رہا تھا۔ ''اسے فوراً ہسپتال پہنچانا ہے۔''

معاف کرنا جی' میں ایسے چکر میں نہیں پڑتا۔'' ڈرائیور نے بے رخی سے جواب دیا۔

درانی نے عاجزی سے کہا۔ ''یہ ایک زندگی کا سوال ہے۔ اسے فوری طور پر طبی امداد نہ ملی تو ختم ہو جائے گا۔''

''یہ تو اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی راستے میں مر جائے گا۔ اس کی حالت دیکھ کر تو یہی معلوم ہوتا ہے۔'' ڈرائیور اسپتال جانے پر آمادہ نہ ہوا۔ ''مر گیا تو تمہارے ساتھ میں بھی پھنس جاؤں گا۔ گواہی دو' ہر پیشی پر عدالت میں حاضری لگواؤ' نہ جاؤ تو گرفتاری کا وارنٹ جاری ہو جائے گا۔''

''پولیس الگ پریشان کرے گی۔ کبھی تھانے جاؤ کبھی عدالت۔'' اس دفعہ کلینر بولا۔ اس نے حوصلہ افزائی کی بجائے حوصلہ شکنی کی۔ ''استاد! گاڑی سٹارٹ کرو۔ اس پھڈے میں نہ پڑو۔ یاد ہے نہر کے پل والا ایکسیڈنٹ ۔۔۔۔۔۔ عدالت کے چکر کاٹتے کاٹتے پلیتھن نکل گیا تھا۔ سارا دھندا چوپٹ ہو گیا تھا۔''

''تو گویا تم میری کوئی مدد نہیں کر سکتے۔'' درانی نے دل برداشتہ ہو کر کہا۔

''میں تمہاری یہ مدد کر سکتا ہوں کہ تھانے پہنچا دوں۔'' ڈرائیور نے مشورہ دیا۔ ''تھانہ یہاں سے زیادہ دور بھی نہیں۔ راستے ہی میں پڑے گا' میں تم کو وہاں چھوڑ دوں گا۔''

''مگر میں تھانے جا کر کیا کروں گا؟'' درانی نے حیرت سے پوچھا۔

''لگتا ہے پہلی بار ایکسیڈنٹ سے سابقہ پڑا ہے۔'' ڈرائیور نے مسکرا کر کہا۔ ''میری گاڑی سے جب بھی ایکسیڈنٹ ہوتا ہے' گاڑی چھوڑ کر سیدھا تھانے جاتا ہوں۔ تھانے ہی میں معاملہ فٹ ہو جائے تو عام طور پر عدالت جانے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ ساری کارروائی تو پولیس ہی کو کرنی ہوتی ہے نا۔ میرا کہنا مانو تو تھانے چلو۔ ہیڈ محرر سے اپنی جان پہچان بھی ہے۔ اس وقت ڈیوٹی پر ہوا تو معاملہ طے کرا دوں گا۔''

درانی نے کوئی جواب نہ دیا۔ چند لمحے گم صم کھڑا سوچتا رہا۔ آخر کار ڈرائیور کا مشورہ قبول کر لیا۔ اس کے ہمراہ تھانے جانے پر آمادہ ہو گیا۔ ٹرک کے اندر داخل ہوا اور ڈرائیور کے قریب بیٹھ گیا۔ ڈرائیور نے ایکسیلیٹر دبایا۔ ٹرک آگے بڑھا اور سنسان سڑک پر تیزی سے دوڑنے لگا۔

درانی چلا گیا۔ مگر زخمی سڑک کے کنارے بے ہوش پڑا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد ایک کار اس کے نزدیک آ کر رکی۔ دروازہ کھلا اور ایک شخص کار سے نکل کر باہر آیا۔ اتفاق سے وہ ڈاکٹر تھا۔ نوجوان اور صحت مند تھا۔ خدا ترس بھی تھا۔ اس نے زخمی کو اٹھا کر اپنی کار کی پچھلی نشست پر لٹا دیا اور سرکاری اسپتال کی جانب روانہ ہو گیا۔ اسپتال پہنچ کر اس نے زخمی کو شعبہ حادثات کے ڈاکٹروں کے سپرد کیا۔

یہ تو معلوم نہیں ہو سکا کہ سلیم احمد خان درانی نے تھانے پہنچ کر کس ڈھب سے بات کی' ٹرک ڈرائیور کے وسیلے سے کیوں کر اپنی گلو خلاصی کرائی اور پولیس نے ضابطے کی کارروائی کس طور پر مکمل کی' تھانے کے ہیڈ محرر نے روزنامچے میں کیا اندراج کیا' البتہ مقامی اخبارات میں حادثے کے متعلق جو خبریں شائع ہوئیں' ان سے اتنا معلوم ہو سکا کہ زخمی کا نام عبداللہ تھا۔ رکشا چلاتا تھا۔ حادثے کی شب ملک کو رکشا واپس کر کے گھر لوٹ رہا تھا' نکلسن روڈ کے موڑ پر ایک تیز رفتار کار کی زد میں آ گیا تھا۔ زخم ایسا کاری لگا کہ فوراً بے

ہوش ہو گیا۔ جب ہوش آیا تو وہ اسپتال میں تھا۔

عبداللہ لگ بھگ دو مہینے اسپتال کے جنرل وارڈ میں زیر علاج رہا۔ جس روز اسپتال سے چھٹی ملی تو صرف اس کی بیوی موجود تھی۔ وہ اسے گھر لے گئی۔ حادثے میں جو زخم آئے تھے وہ تو علاج معالجے سے مندمل ہو گئے' لیکن پیر کی ہڈی ایسی چکنا چور ہو گئی کہ درست نہ ہو سکی۔ ڈاکٹروں نے مجبوراً اس کی ٹانگ کاٹ دی۔

عبداللہ اب کسی کام دھندے کے لائق نہیں رہا تھا۔ ایک ٹانگ سے محروم ہونے کے بعد وہ بیساکھی کے سہارے چلتا تھا۔ اس کا چوڑا چکلا مضبوط جسم مرجھا کر کبڑوں کی مانند جھک گیا تھا۔ وہ تمام وقت گھر میں پڑا کھانستا رہتا۔ آل اولاد بھی نہ تھی۔ لے دے کے گھر میں صرف ایک بیوی تھی جو اس کی مونس و غمگسار بھی تھی اور اس کے غم و غصے کا نشانہ بنتی تھی۔ وہ بہت چڑچڑا اور زود رنج ہو گیا تھا۔ بات بات پر بیوی سے لڑتا جھگڑتا' مارنے پیٹنے کی دھمکی بھی دیتا۔ اس کا سیاہ رنگ کچھ اور زیادہ سیاہ ہو گیا تھا۔ ڈاڑھی بڑھ کر بے ترتیب ہو گئی تھی۔ آنکھوں سے ہر وقت وحشت برستی' چہرہ روز بروز خوفناک ہوتا جا رہا تھا۔ ملنے جلنے والے' جو ازراہ ہمدردی کبھی کبھار اس کے پاس گھڑی دو گھڑی بیٹھ جاتے تھے' اب کترانے لگتے تھے۔

عبداللہ جس محلے میں رہتا تھا اس کی بیشتر آبادی غریب اور پسماندہ طبقے کے افراد پر مشتمل تھی۔ محلے میں ہر طرف چھوٹے چھوٹے نیم پختہ مکانات تھے۔ چند قدیم وضع کی بلند و بالا عمارتیں بھی تھیں جو امتداد زمانہ سے روز بروز کھنڈر بنتی جا رہی تھیں۔ تنگ و تاریک گلیاں تھیں جن کے درمیان عیسائیوں کا قبرستان بھی تھا۔ قبرستان کے چاروں طرف قد آدم پختہ چار دیواری تھی۔ وسط میں اونچی لاٹ تھی جس پر سنگ مرمر کا کتبہ آویزاں تھا۔ یہ کسی انگریز کرنل کی قبر تھی جس کی تمام زندگی میدان جنگ میں غنیم سے معرکہ آرائی میں بسر ہوئی تھی۔ لیکن اس کی موت خودکشی سے واقع ہوئی تھی۔

مشہور تھا کہ مرنے کے بعد کرنل بھوت بن گیا۔ اکثر اندھیری راتوں میں لوگوں نے سنسان گلیوں میں اسے منڈلاتے ہوئے دیکھا بھی تھا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ جب بھی وہ کسی کو نظر آیا تو ہمیشہ ایک ہی صدا لگاتا۔

"مکھن ٹوش"

خدا معلوم اس کی اس طلب کا کیا مطلب تھا۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ جس کسی سے بھی مڈبھیڑ ہوئی اس نے یہی آواز اس کے منہ سے سنی اور یہ آواز اس قدر دل ہلا دینے والی ہوتی کہ اچھے بھلے جی دار آدمی کے اوسان خطا ہو جاتے۔ وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگتا۔ یہی وجہ تھی کہ قبرستان کی چار دیواری کے ساتھ جو تپلی سی گلی جاتی تھی' رات گئے راہ گیر اس سے گزرتے ہوئے ڈرتے تھے۔

محلے کی دوسری نمایاں خصوصیت سکینہ بیگم تھیں۔ وہ بیوہ تھیں۔ ان کے شوہر ترکے میں بہت بڑی جائیداد چھوڑ کر مرے تھے۔ مرحوم کی جیتی جاگتی نشانی صرف ایک بیٹا تھا۔ سکینہ بیگم نے اسے بڑے ناز و نعمت سے پالا تھا۔ اسے دیکھ کر جیتی تھیں' ہر طرح سے ناز برداری کرتی تھیں۔ مگر وہ پوری طرح جوان بھی نہ ہوا تھا کہ گھر سے روٹھ کر چلا گیا۔ بات صرف اتنی تھی کہ اس نے ماں سے کھچڑی کھانے کی فرمائش کی تھی۔ سکینہ بیگم کی اس روز طبیعت کچھ ناساز تھی۔ باورچی نے توجہ نہ دی۔ دستر خوان پر کھچڑی نہ پا کر صاحب زادے اس قدر برافروختہ ہوئے کہ بغیر کچھ کھائے پیئے اٹھ گئے۔ اس کے بعد اسے کسی نے نہ دیکھا۔ البتہ کچھ عرصے بعد یہ اطلاع ملی کہ وہ ٹرین کے حادثے میں جاں بحق ہو گئے۔

حادثے کے بعد کئی عینی گواہ تھے۔ انہوں نے سکینہ بیگم کو اس المناک سانحے سے آگاہ بھی کیا۔ لیکن وہ کسی طرح یقین ماننے پر آمادہ نہ ہوئیں۔ بعد میں کوئی اس کا اظہار بھی کرتا تو اس کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جاتیں۔ ایک ہی سانس میں سینکڑوں کوسنے دے ڈالتیں۔ لہٰذا سب نے اس سلسلے میں بات کرنا ہی ترک کر دیا۔ بلکہ بعض حیلہ ساز عورتوں نے تو طرح طرح کے قصے کہانیاں سنا کر ٹھگنا بھی شروع کر دیا تھا۔ وہ آئے دن نت نئے قصے گھڑ کر لاتیں اور سکینہ بیگم سے کچھ نہ کچھ اینٹھ کر لے جاتیں۔

سکینہ بیگم ہر تہوار پر بیٹے کا نیا جوڑا سلواتیں۔ خاندان کی ہر خوبصورت لڑکی کے لیے اپنے بیٹے کا پیغام دیتیں۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر مشاطائیں بلواتیں۔ انہیں انعام و اکرام دیتیں اور ان کے ذریعے بہو تلاش کرواتیں۔ کوئی بیٹے کے بارے میں پوچھتا تو مسکرا کر کہتیں۔ ''بس آنے ہی والا ہے' کل ہی تو ایک شخص آیا تھا جس سے اس نے میری خیریت دریافت کی تھی۔'' کبھی اس کے خط کا حوالہ دیتیں اور مزے لے لے کر اس کے بارے میں باتیں کرنا شروع کر دیتیں۔ سننے والے ان کی باتیں سن کر دل ہی دل میں افسوس کرتے۔ خبطی اور سنکی کہتے۔ ان کی دیوانگی دیکھ کر کف افسوس ملتے۔

وہ ہر روز بیٹے کی آمد کا انتظار کرتیں۔ ہر شام نہایت اہتمام سے اس کے لیے کھچڑی پکواتیں' رات گئے تک منتظر رہتیں۔ صبح ہوتی تو کھچڑی باسی ہو جاتی۔ محلے کے کسی محتاج اور مسکین کا اس سے پیٹ بھر جاتا۔ ایک مدت سے یہ سلسلہ چل رہا تھا۔ جب سے عبداللہ ایک ٹانگ سے معذور ہوا تھا' باسی کھچڑی سے اس کا بھی حصہ مل جاتا۔ سویرے ہی سویرے اس کی بیوی اٹھ کر سکینہ کے دروازے پر پہنچ جاتی اور جب واپس آتی تو میاں بیوی کے لیے ایک وقت کے کھانے کا بندوبست ہو جاتا۔

عبداللہ کے شب و روز اسی طرح نیم فاقہ کشی اور تنگ دستی میں کٹ رہے تھے۔ اتفاق سے اس کی بیوی بیمار پڑ گئی۔ طبیعت ایسی

بگڑی کہ چلنے پھرنے سے معذور ہوگئی۔ عبداللہ کو کئی روز فاقہ کرنا پڑا۔ آخر جب پیٹ کی آگ بجھانے کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو ایک روز عبداللہ نے اپنی بیساکھی سنبھالی اور اس کے سہارے چلتا ہوا گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ دسمبر کا مہینہ تھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ غضب کی سردی پڑ رہی تھی۔ سرِ شام ہی سناٹا پڑ گیا تھا۔ گلی کوچے ویران ہو گئے تھے۔

پہر رات گزر چکی تھی۔

عبداللہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا قبرستان سے ملحق تنگ و تاریک گلی میں داخل ہوا۔ کچھ ہی دور گیا ہوگا کہ دھندلی روشنی میں اسے ایک انسانی سایہ نظر آیا۔ وہ اسی طرف آ رہا تھا۔ عبداللہ جہاں تھا وہیں ٹھہر گیا۔ جب وہ قریب آیا تو عبداللہ نے ہچکچاتے ہوئے ہاتھ آگے بڑھایا اور اس کے سامنے کر دیا۔ راہ گیر ٹھٹک کر رہ گیا۔ اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ عبداللہ کا چہرہ اندھیرے میں اس قدر ڈراؤنا لگا کہ خوف سے اس کی گھگھی بندھ گئی۔ وہ ڈبہ بھی زمین پر گر گیا تو اس کے ہاتھ میں دبا تھا۔

عبداللہ خود بھی گھبرا گیا۔ چند لمحے حیران و پریشان کھڑا رہا۔ جب ذرا ہوش بجا ہوئے تو اس نے فرش پر پڑے ہوئے ڈبے کو دیکھا۔ جھک کر اسے اٹھایا' کھول کر نظر ڈالی۔ گرم گرم امرتیاں تھیں۔ عبداللہ کی خوشی سے باچھیں کھل گئیں۔ گھبراہٹ ہوا ہوگئی۔ فوراً گھر پہنچا۔ میاں بیوی نے مزا لے لے کر امرتیاں کھائیں اور اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔

دوسرے روز عبداللہ رات کو پھر اسی گلی میں پہنچا۔ اس وقت ہلکی ہلکی بوندا باندی بھی ہو رہی تھی۔ سردی اور بڑھ گئی تھی۔ ہر طرف گھپ اندھیرا تھا۔ وہ دیر تک گلی میں قبرستان کے احاطے کی دیوار سے لگا کھڑا رہا لیکن کوئی بھولے سے بھی ادھر نہ آیا۔ سردی سے عبداللہ کا جسم کپکپا رہا تھا۔ آخر جب وہ مایوس ہو کر لوٹ رہا تھا تو اچانک ایک مونگ پھلی بیچنے والا گلی میں داخل ہوا۔ عبداللہ پلٹا اور اس کی جانب بڑھنے لگا۔ قریب پہنچ کر اس نے ہاتھ پھیلانے کی بجائے ناک میں منمنا کر کہا۔

''ذراں بانت سن ناں بھائی''

عبداللہ کا ہیبت ناک چہرہ' بھوت پریتوں کا سا لہجہ اور سنسان رات' مونگ پھلی والے پر کچھ ایسی دہشت طاری ہوئی کہ لحظہ بھر تک آنکھیں پھاڑے' منہ کھولے چیخنے کی بے سود کوشش کرتا رہا' پھر لڑکھڑایا اور گر کر بے ہوش ہو گیا۔ اس کا خوانچہ بھی گر گیا۔ عبداللہ نے فرش پر بے سدھ پڑے ہوئے پھیری والے کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ جلدی جلدی اپنی چادر کے پلو میں سیر' سوا سیر مونگ پھلیاں باندھیں اور بیساکھی کے سہارے تیز تیز قدم اٹھاتا گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔

ان دو واقعات سے محلے بھر میں سنسنی پھیل گئی۔ گھر گھر چرچا ہونے لگا کہ کرنل کا بھوت آج کل راہ گیروں کو بہت پریشان کر رہا

ہے۔رات کو گلی کوچوں میں منڈلاتا رہتا ہے' ڈراتا ہے' دھمکاتا ہے۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔قبرستان کے آس پاس رہنے والوں پر تو اور بھی زیادہ دہشت طاری ہو گئی۔ وہ سرِ شام ہی دروازے بند کر کے گھروں میں بیٹھ جاتے۔ عبداللہ نے خوف اور دہشت کی اس فضا سے اور بھی فائدہ اٹھایا۔

رات گئے جب راستے سنسان ہو جاتے اور ہر طرف ہو کا عالم ہوتا تو عبداللہ اپنی میلی کچیلی چادر اوڑھتا' خاموشی سے باہر نکلتا' قبرستان سے ملحق گلی میں داخل ہوتا اور اندھیرے میں دبک کر کھڑا ہو جاتا۔ ادھر کوئی بھولا بھٹکا راہ گیر گلی میں داخل اور عبداللہ چوکس ہو کر اس کی گھات میں فوراً لگ گیا۔ قریب آتے ہی خوفناک آواز میں منمنا کر صدا بلند کرتا۔ ''مکھن ٹوش!''

راہ گیر اس کی آواز سنتے ہی دہشت زدہ ہو جاتا۔

عبداللہ نے اب باقاعدہ کرنل کے بھوت کا روپ اختیار کر لیا تھا۔ اس کا یہ حربہ کارگر ثابت ہوا۔ پہلے وہ صرف کھانے پینے کی اشیاء پر اکتفا کر لیا کرتا تھا۔ پھر ایسا ہوا کہ اگر کوئی خوف سے بے ہوش ہو جاتا تو وہ اس کی جیبیں ٹٹولتا۔ جامہ تلاشی لیتا اور جو کچھ اس کے پاس ہوتا اپنے قبضے میں کر لیتا۔

محلے میں کرنل کے بھوت کا چرچا روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ لوگوں میں سخت خوف و ہراس پھیل گیا تھا۔ دوسری طرف عبداللہ اپنے کام میں اتنا مشاق اور نڈر ہو گیا تھا کہ اکثر اندھیرے سے نکل کر جھپٹتا اور اپنے شکار کو دبوچ لیتا۔ کسی کو ''مکھن ٹوش'' کی خوفناک صدا سے اور کسی کو صرف لرزہ خیز قہقہہ لگا کر بدحواس کر دیتا۔ کسی کی ٹانگ پکڑ کر گھسیٹ لی۔ کسی کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ کبھی چہرہ کھلا ہوتا' کبھی چادر سے ڈھکا ہوتا۔ جیسا موقع ہوتا' اسی مناسبت سے اپنا حربہ استعمال کرتا۔

آخر ایک ایسا وقت آیا کہ راہ گیروں اور پھیری والوں نے رات کو قبرستان والی گلی سے گزرنا ہی چھوڑ دیا۔ کوئی بھولے سے بھی اس میں داخل نہ ہوتا۔ لیکن عبداللہ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ اس قدر دیدہ دلیر ہو گیا تھا کہ اندھیری اور سنسان راتوں میں گلی سے نکل کر باہر چلا جاتا' راہ گیروں کو ڈرا دھمکا کر جو کچھ ملتا' ہتھیا لیتا۔ گھر واپس جا کر بیوی کے سامنے اسے ڈال دیتا اور مسکرا کر کہتا۔ ''آج صرف اتنا ہی ٹیکس وصول ہوا۔'' پہلے وہ پوچھ گچھ کرتی تھی' تشویش کا اظہار کرتی تھی لیکن وہ بھی اب عادی ہو گئی تھی۔ دنوں کی مزے سے گزر بسر ہو رہی تھی۔

محلے والے بھی اب اس قدر دہشت زدہ ہو گئے تھے کہ سورج غروب ہوتے ہی کوچہ و بازار کی رونق اجڑ جاتی۔ ہر طرف ویرانی برسنے لگتی۔ سناٹا شدید ہو جاتا اور اس ہولناک سناٹے میں عبداللہ اطمینان سے کسی گلی کی نکڑ پر اندھیرے میں دبکا ہوا کھڑا ہوتا۔ اس کا

چہرہ اب اور بھی ڈراؤنا ہو گیا تھا۔ آنکھوں سے ٹپکتی ہوئی وحشت اور بڑھ گئی تھی۔ اس کی آواز میں دم توڑتے ہوئے انسان کا سا کرب پیدا ہو گیا تا۔ وہ دن بھر گھر میں پڑا سوتا رہتا۔ پہر رات گزرتے ہی چادر اٹھاتا اور جسم کے گرد لپیٹ کر بیساکھی کے سہارے باہر چلا جاتا اور ویران گلیوں میں اپنے شکار کی تلاش میں مارا مارا پھرتا۔

جاڑوں کا چل چلاؤ تھا۔ گرمی کی آمد آمد تھی۔ کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ عبداللہ کو کئی روز تک کوئی شکار نہ ملا۔ اس کی بیوی نے سکینہ بیگم کے گھر ایک مدت سے آمد و رفت بند کر دی تھی۔ دونوں بالکل قلاش تھے۔ لہٰذا مسلسل کئی وقت کے فاقے کرنا پڑے۔

بیوی گھر میں اکیلی تھی۔ رات گہری ہو چکی تھی۔ مگر بھوک کے مارے اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ اس رات عبداللہ جلد ہی گھر سے باہر چلا گیا۔

وہ بے چینی کے عالم میں اندھیری گلیوں کے چکر کاٹ رہا تھا۔ سناٹا بڑھتا گیا۔ وقت گزرتا رہا۔ رات آدھی سے زیادہ ہو چکی تھی۔ لیکن عبداللہ کو کوئی بھی بھولا بھٹکا راہ گیر نہ ملا۔ گلی کوچے بھائیں بھائیں کر رہے تھے۔

عبداللہ کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔

رات کی وہ گھڑی قریب آتی جا رہی تھی جب صرف گشت کرنے والے کانسٹیبل کے بھاری بھاری بوٹوں کی آہٹ سنائی پڑتی جن کی نظروں سے بچنے کے لیے اسے خاصی پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ عام طور پر آدھی رات سے پہلے ہی واپس گھر چلا جاتا۔ مگر آج رات وہ خالی ہاتھ واپس جانا نہ چاہتا تھا۔

آخر جب کوئی شکار ہاتھ نہ آیا تو اس نے نیا حربہ آزمانا چاہا۔ کسی راہ گیر کی گھات میں کہیں دبک کر کھڑے ہونے کے بجائے وہ کسی مکان کو تاڑتا' قریب جاتا' دروازے سے کان لگا کر اندر کی سن گن لیتا۔

وہ کئی مکانوں کے دروازوں پر پہنچا۔ سن گن لینے کی بھی کوشش کی لیکن ہمت نہ ہوئی۔ آخر ایک مکان کو اس نے تاکا' دروازے پر پہنچ کر آہستہ سے دستک دی۔ ذرا دیر بعد اندر سے نیند میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری۔

''کون ہے؟''

''دروازہ کھولو۔'' عبداللہ نے آہستہ سے کہا۔

قدموں کی آہٹ ابھری۔ دروازہ کھول کر کسی نے منہ باہر نکالا' پوچھا۔ ''کون ہے۔۔۔۔۔۔۔ سامنے آؤ۔''

عبداللہ اندھیرے سے نکل کرایک دم سامنے آ گیا۔اس نے خوفناک لہجے میں منمنا کرصدا بلند کی۔''مکھن ٹوش''

اس شخص کی سٹی گم ہوگئی۔گلا پھاڑ کر چیخا۔''باپ رے باپ''

عبداللہ نے اس دفعہ اور بھی ڈراؤنی آواز میں وحشت زدہ کرنے کی کوشش کی۔''مکھان ٹوش''

وہ شخص بدحواش ہوکر چلانے لگا۔''بھوت۔۔۔۔۔۔۔بھوت''

سابقہ تجربے کے پیش نظر عبداللہ کواب وہاں سے سٹک جانا چاہیے تھا۔مگر وہ ڈھیٹ بنا دروازے کے سامنے کھڑا رہا۔اس نے سوچا کہ اب تو یہ خوفزدہ ہو ہی چکا ہے'ایک وار اور کروں گا تو بے ہوش ہوجائے گا۔اس نے انتہائے خوفناک لہجے میں صدا بلند کی۔

''مکھان ٹوش''

اس باراس شخص پر یہ رد عمل ہوا کہ وہ اور بھی زیادہ دہشت زدہ ہوکر چیخنے چلانے لگا۔یہ بیٹھک کا دروازہ تھا جس میں کچھ اور لوگ بھی سو رہے تھے۔وہ بھی بیدار ہو گئے۔ذرا دیر تو وہ سہمے ہوئے دم بخود رہے'پھر سب بدحواس ہوکر چیخنے لگے۔

''بھوت۔۔۔۔۔۔۔بھوت!''

اتنی بہت سی آوازوں کا شور سن کر عبداللہ بھی گھبرا گیا۔وہ اپنی بیسا کی سنبھال کر مڑا۔آگے بڑھا اور کسی نہ کسی طرح قبرستان والی تنگ و تاریک گلی میں داخل ہوگیا۔اب پاس پڑوس کے مکانوں کے رہنے والے بھی بیدار ہو گئے تھے۔کچھ ایسے بھی تھے جو ہمت کر کے گھروں سے نکل نکل کر باہر آنے لگے۔وہ اونچی اونچی آوازوں میں بول رہے تھے۔عبداللہ نے محسوس کیا کہ گلی کے دونوں سروں پر ملی جلی آوازوں کا شور ابھر رہا ہے۔گلی سے باہر نکلنے کی گنجائش نہ تھی۔ادھر ادھر جانے کی بجائے وہ اندھیرے میں ایک دیوار کے ساتھ دبک کر کھڑا ہو گیا۔اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

ناگاہ گلی کے پختہ فرش پر قدموں کی آہٹ ابھری اور کوئی تیزی سے عبداللہ سے ٹکرایا'لڑکھڑایا مگر گرا نہیں۔وہ ''بھوت'بھوت'' کہتا ہوا سرپٹ بھاگا۔پھر تو ہر طرف سے ملی جلی آوازیں ابھرنے لگیں۔

عبداللہ سوچ ہی رہا تھا کہ اب کیا کرے۔اسی اثناء میں ایک پتھر اس کے داہنے کندھے پر آ کر زور سے لگا۔

''وہ سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ پتھروں کی بارش شروع ہوگئی۔ہر طرف سے پتھر آ آ کر گلی میں گرنے لگے۔ساتھ ہی ملی جلی آوازیں ابھرتی رہیں۔

''گلی میں بھوت ہے۔''

"وہ دیکھو کچھ نظر تو آ رہا ہے۔"

"ہاں ہاں دیوار کے ساتھ کوئی اندھیرے میں کھڑا ہے۔"

اچانک غلغلہ بلند ہوا۔ "بھوت بھوت" اور پتھروں کی بارش شروع ہوگئی۔ پتھر آ آ کر عبداللہ کے جسم سے ٹکرا رہے تھے۔ ایک پتھر تو اس زور سے ماتھے پر لگا کہ وہ چکرا کر بیٹھ گیا۔ عین اسی وقت ایک اور پتھر اس کی کن پٹی پر لگا۔

عبداللہ نڈھال ہو کر زمین پر لیٹ گیا۔

قریب ہی ایک گہری بدرو تھی۔ عبداللہ نے سوچا کہ کسی طرح اگر بدرو میں داخل ہو جائے تو سنگ باری سے بچ جائے گا۔ اس نے ہمت سے کام لیا اور دھیرے دھیرے بدرو کی جانب کھسکنے لگا۔ مگر بدرو کے قریب پہنچا بھی نہ تھا کہ ایک بڑا سا پتھر اس کے سر پر آ لگا۔ عبداللہ جہاں تھا، وہیں رہ گیا اور گلا پھاڑ کر چیخا۔

"ہائے مرا۔۔۔۔۔۔۔"

عبداللہ پتھروں کی لگاتار چوٹوں سے بلبلا کر کئی بار چیخا۔ کئی بار اس نے التجا کی، گڑگڑایا بھی، دہائی بھی دی مگر دوسری طرف اس قدر شور تھا کہ کوئی اس کی آواز نہ سن سکا۔ کسی کے کانوں تک اس کی فریاد نہ پہنچی۔

پتھروں کی بارش مسلسل ہوتی رہی۔

لوگ گلا پھاڑ پھاڑ کر چیختے رہے۔ وہ اس وقت کرنل کے بھوت کو سنگسار کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ وہ پاگلوں کی طرح چلا رہے تھے اور گلی میں بے تحاشا پتھر برسا رہے تھے۔ رات کے سناٹے میں یہ شور بڑا خوفناک معلوم ہو رہا تھا۔

دوسرے روز محلے والوں نے دیکھا کہ گلی کے بیچوں بیچ ایک کالا کلوٹا بدہیئت شخص منہ اوندھائے پڑا ہے۔ اس کے چاروں طرف پتھر ہی پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے کالے بھجنگ جسم کے ہر حصے پر گاڑھا گاڑھا خون بہہ کر جم گیا تھا۔ اس کا خوفناک چہرہ بدرو کے اندر تھا اور کیچڑ میں لت پت تھا۔

یہ عبداللہ تھا جو رات ہی مر گیا تھا۔

راتوں کا شہر

دونوں کاٹھیاواڑی دلال بہت دیر سے کاٹن کی سٹے بازی کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ پھر نہ جانے ان کو کیا سوجھی کہ اچانک میونسپل کارپوریشن کا ذکر لے بیٹھے اور آخر میں محکمہ موسمیات کو گالیاں دیتے ہوئے اٹھ کر چل دیئے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے اطمینان کی سانس لی اور خالی بنچ پر ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ گیا۔

یہ نومبر کی ایک سنسان رات تھی' شبنم سے بھیگی ہوئی ہوا میں خنکی تھی اور فضا میں ہلکا ہلکا غبار رچا ہوا تھا۔ سڑکوں پر گاڑیوں کا شور مدھم پڑ گیا اور راہ گیر بھی اکا دکا نظر آتے تھے۔ اس مختصر سے ٹریفک آئی لینڈ پر کہیں کہیں لوگ سکڑے سکڑائے پڑے تھے۔ سیمنٹ کی بنی ہوئی بنچوں پر' ٹھنڈے فرش پر' درختوں کے نیچے' ہر جگہ انسانی جسم لاشوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔

میں بنچ پر لیٹنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اسی اثنا میں ایک شخص نہ جانے کہاں سے آ گیا۔ اس نے بڑی بدتمیزی سے میری ٹانگیں ایک طرف ہٹائیں اور بنچ پر جم کر بیٹھ گیا۔ مجھے اس کی حرکت پر سخت غصہ آیا۔ غصے کی بات ہی تھی۔ اس روز بھی حسب معمول کہیں رات بسر کرنے کا بندوبست نہ تھا۔ لہٰذا بازار میں سناٹا ہوتے ہی میں نے یہاں کا چکر کاٹنا شروع کر دیا تھا۔ بڑی دیر کے بعد ایک خالی بنچ ملی' تو یہ شخص موت کے فرشتے کی طرح آ دھمکا۔ میں نے اسے قہر آلود نظروں سے دیکھا۔ وضع قطع سے وہ خطرناک غنڈہ معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے اسی میں اپنی خیریت سمجھی کہ گھٹنوں میں سر دبا کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔

رات کا سناٹا اور گہرا ہو گیا۔ نم آلود ہوا میں خنکی بڑھ گئی تھی۔ کبھی کبھی سنسان سڑک پر کوئی کار تیزی سی سنسناتی ہوئی گزر جاتی۔ رکشا اسٹینڈ پر ملی جلی آوازوں کا شور ابھرتا اور ڈوب جاتا۔ ٹریفک آئی لینڈ کے پاس پہنچ کر کوئی چھپی والا زور سے پی پی کی آواز لگاتا اور کسی چالو فلم کا گیت گنگناتا ہوا گزر جاتا۔ میں آنکھیں بند کئے ہر آہٹ کو ہر آواز کو خاموشی سے سنتا رہا۔ میرے برابر بیٹھا ہوا خطرناک غنڈہ ابھی تک بالکل چپ تھا۔ شاید وہ اونگھ رہا تھا یا سو گیا تھا یا اسے بھی میری طرح بنچ کے خالی ہو جانے کا انتظار تھا۔

کوئی آدھ گھنٹے کے بعد میں نے سنا۔ وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا۔ ''کیوں جی' کیا بجا ہوگا؟'' معلوم نہیں اسے یہ کیسے پتہ چل گیا کہ میں ابھی تک جاگ رہا ہوں۔

میں نے گھٹنوں پر سے سر اٹھا کر بے رخی سے جواب دیا۔ ''میرے پاس گھڑی نہیں ہے۔''

''کوئی ڈیڑھ بج گیا ہوگا۔'' یہ بات اس نے اس طرح کہی جیسے خود سے باتیں کر رہا ہو۔ پھر اس نے کان میں لگے ہوئے ادھ جلے سگریٹ کا ٹوٹا نکالا اور اسے سلگا کر کش لگانے لگا۔ لیکن وہ زیادہ دیر خاموش نہ رہا' کہنے لگا۔ ''یار آج سردی کچھ زیادہ ہے جاڑا اب آ ہی گیا۔''

''ہاں'' میں نے مختصر سا جواب دیا۔

وہ بولا ''تو اب تم سو کیوں نہیں جاتے؟''

میں نے جل کر کہا۔ ''مجھے اکڑوں بیٹھ کر نیند نہیں آتی۔''

آدمی حساس تھا۔ میری بات کا مطلب فوراً بھانپ گیا۔ ہنس کر کہنے لگا۔ ''اماں' تو یوں کہو۔ تم نے یہ بات پہلے کیوں نہ کہی۔ لے بھائی میں تو چلا' تو ناراض نہ ہو۔'' اتنا کہہ کر وہ کھڑا ہو گیا۔

اس کے وہاں سے کھسکتے ہی میں نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر جھٹ سے پوری بنچ پر ٹانگیں پھیلا دیں اور بازو پر سر رکھ کر آنکھیں میچ لیں۔ لیکن ذرا ہی دیر بعد وہ پھر نازل ہوا اور بڑی بے تکلفی سے بولا۔ ''اماں' کیا سو گئے؟''

میں مسٹ مارے خاموش پڑا رہا۔

''استاد کیوں مکر گانٹھ رہے ہو ذرا ٹانگیں تو سرکاؤ۔'' اس نے بے تکلفی سے کہا۔

مجھے اس کے اس انداز پر ہنسی آ گئی۔ مجبوراً اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ''لو بھئی اطمینان سے بیٹھو۔'' اس کے سوا اور کہتا بھی کیا کیا۔ پڑا رہتا تو وہ پھر ٹانگیں پکڑ کر ایک طرف کر دیتا۔ میں اس کا کیا بگاڑ لیتا۔

اب وہ خواہ مخواہ مجھ سے مانوس ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہنس کر بولا۔ ''یار خفا کیوں ہوتے ہو۔ ابھی تو بہت رات پڑی ہے سو لینا۔''

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ لیکن وہ خود ہی چھیڑ کر بولا۔ ''چائے پیو گے؟''

میں نے انکار کر دیا۔

''نہیں جی' یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ چائے پینے کا مزہ تو اسی وقت ہے۔'' اتنا کہہ کر اس نے بھڑ سے گالی دی۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا' مگر وہ اپنی شلوار کا نیفا ٹٹول رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے لوہے کی ایک خم دار سلاخ نکال کر سامنے ڈال دی اور کمر سہلاتے ہوئے بولا۔ ''سالی نے گھاؤ ڈال دیا۔''

میں نے حیرت زدہ ہو کر ہاتھ بھر کے اس لوہے کے ٹکڑے کو دیکھا اور اس سے پوچھنے لگا۔ "یہ کیا ہے؟"

کہنے لگا۔ "کمائی کا ٹھیکرا" اور اسی طرح اطمینان سے بیٹھا کمر سہلاتا رہا۔

میں اور بھی حیرت زدہ ہو کر بولا۔ "یار ٹھیک سے بتاؤ' یہ کیا جادو منتر ہے۔"

میری بات پر اسے ہنسی آ گئی۔ بڑی بے تکلفی سے بولا۔ "پیارے دل خوش کر دیا۔ آدمی تم بھی کینڈے کے لگتے ہو۔" لمحے بھر کے بعد کہنے لگا۔ "تو پھر ہو جائے کچھ چائے پانی۔ تم بھی کیا یاد کرو گے کہ کوئی سانولے خان ملا تھا۔"

مگر اس کے ساتھ جانے کو جی نہ چاہا۔ "نہیں بھئی' مجھے تو اب تم سو ہی جانے دو۔"

وہ باز نہ آیا۔ میرا بازو پکڑ کر اٹھاتے ہوئے بولا۔ "یار ان باتوں میں کیا دھرا ہے' آؤ میرے ساتھ۔"

بادل نخواستہ مجھے اس کے ہمراہ چلنا پڑا۔ کچھ دور تک ہم دونوں سنسان سڑک پر چلتے رہے' پھر ایک گلی کی نکڑ پر وہ ٹھٹکا۔ اس نے چاروں طرف ایک چوکنا نظر ڈالی' آگے بڑھا اور لپک کر ایک دکان کے دروازے پر پہنچ گیا اور لوہے کی خمیدہ سلاخ تالے میں ڈال کر آہستہ سے بولا۔ "کھل جا میری جان سم سم" اور تالا جھٹ سے کھل گیا۔ اسی وقت گلی کے دوسرے سرے پر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اس نے مڑ کر مجھے دیکھا اور منہ قریب لا کر سرگوشی کی۔

"یارا چوکیدار آ رہا ہے۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ تم ایسا کرو۔ لپک کر اس کے پاس پہنچ جاؤ اور اس کو باتوں میں لگا لو۔ بس یوں ہی کچھ پوچھنا شروع کر دو۔ میں تم کو نالے کی پلیا پر ملوں گا اور ہاں۔۔۔۔۔۔۔"

اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور دکان کا ایک پٹ کھول کر اندر چلا گیا۔ خوف کے مارے میری حالت غیر ہوتی جا رہی تھی۔ یا اللہ یہ آج کس مصیبت میں پھنسا۔ ایکا ایکی بجلی کے کھمبے کے پاس روشنی میں ایک انسانی سایہ نظر آیا۔ سوچنے کی گنجائش نہیں تھی۔ میں اسی طرف چل دیا۔

چوکیدار نے مجھے دیکھ کر دور ہی سے آواز لگائی۔ "کون ہے؟"

گھبراہٹ کے باعث حلق سے میری آواز نہ نکل سکی۔ مگر وہ میرے قریب نہ آیا۔ شاید وہ بھی خوفزدہ تھا۔ اس نے زمین پر زور زور سے لاٹھی بجا کر اس دفعہ کسی قدر اونچی آواز میں پوچھا۔

"کون ہے گلی میں؟"

میں اب اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔ میں نے جلدی سے کہا۔ "تم اتنا شور کیوں مچا رہے ہو؟"

وہ سینہ تان کر بولا۔ پر تم بولتا کیوں نہیں' وہاں اندھیرے میں کیا کرتا تھا۔ تمہارا ادھر کیا کام؟

سرحد کا وہ چوڑا چکلا پٹھان میرے سر ہو گیا۔ میں نے اسے مطمئن کرنے کی غرض سے نرم لہجے میں کہا۔ ''لالہ! بات یہ ہے کہ مجھے ایک شخص کا پتہ معلوم کرنا تھا۔''

وہ اور بھی بھڑک اٹھا۔ ''رات کا دو بجے پتہ ملوم کرتا ہے۔ خو چہ' تم کیسا بات کرتا ہے؟''

میں نے دل میں سوچا کہ اس سالے اٹھائی گیرے نے تو آج پھنسوا ہی دیا۔ یہ اکھڑ پٹھان کسی طرح مانتا ہی نہیں۔ لیکن خیریت یہ ہوئی کہ آس پاس کوئی اور چوکیدار نہ تھا۔ ورنہ دھر لیے جانے میں کیا کسر رہ گئی تھی۔ آخر میں نے اسے مرعوب کرنے کی کوشش کی۔

''لالہ! تم ان کو ضرور جانتے ہو گے' ان کا نام عظیم اللہ ہے۔ وہ سرکاری دفتر میں افسر ہیں۔''

میں نے خواہ مخواہ اس موقع پر دو چار انگریزی کے الفاظ بھی بولے۔ یہ حربہ کارگر ثابت ہوا۔ چوکیدار ذرا نرم پڑ گیا' آہستہ آہستہ گردن ہلا کر بولا۔ ''عظیم اللہ!!! ہاں ہم اس کو جانتا ہے' ایک دم لمبا ہے۔ خوب شراب میں ڈاؤن رہتا ہے' روز گھر میں جھگڑتا ہے' بوت بوم مارتا ہے۔''

میں نے فوراً اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ''بالکل ٹھیک' لالہ! وہی عظیم اللہ۔ تم یہ بتا دو کہ اس کا فلیٹ کون سا ہے۔ بہت ضروری کام ہے۔'' کہنے کو تو میں نے یہ بات کہہ دی' پھر خود ہی گھبرا بھی گیا۔ لیکن جب اس نے بتایا کہ ''پر وہ تو اب یاں سے چلا گیا۔ اس کا لاہور بدلی ہو گیا۔'' تو میری جان میں جان آئی۔

میں نے خواہ مخواہ حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''نہیں خان' وہ تو یہیں ہو گا۔''

وہ ذرا دیر خاموش کھڑا سوچتا رہا۔ ''ہم کو ٹیک سے نہیں ملوم۔ یہ فلیٹ میں رہنے والا ساب لوگ روز بگڑی پر فلیٹ چلاتا ہے' پتہ نہیں تم کس کو پوچھتا ہے۔''

میں نے اصرار کیا۔ ''لالہ! بہت ضروری کام ہے تمہاری بڑی مہربانی ہو گی۔''

مگر اب وہ اکتا چکا تھا۔ مڑتے ہوئے بولا ''بابا ہم کو کچھ پتہ نہیں' جاؤ آگے پوچھو۔'' میں نے سوچا کہ اب تک سانولے خان اپنا کام کر چکا ہو گا۔ لہٰذا میں نے اس چوڑے چکلے پٹھان سے مزید الجھنا مناسب نہیں سمجھا اور چپ چاپ آگے بڑھ گیا۔

کئی گلیوں کا چکر کاٹ کر میں نالے کی پلیا پر پہنچا تو سانولے خان وہاں موجود تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی ہولے سے سیٹی بجا کر سگنل دیا۔ وہ اندھیرے میں ایک دیوار کے پاس کھڑا تھا۔ ''یار تم نے اتنی دیر کہاں لگا دی؟'' اس نے دریافت کیا۔

میں اسے پانی کارگزاری سنانے لگا۔ مگر اس نے پوری تفصیل نہیں سنی' بڑے پیار سے میرے شانے تھپتھپا کر بولا۔ ''یار! میں نے تو تیری ایک ہی بات سے تاڑ لیا تھا کہ یہ اپنے کینڈے کا آدمی ہے۔''

''اچھا اب مجھے چلنے دو ورنہ بیچ پر کوئی اور آدھمکے گا۔''

وہ ہنس کر بولا ''چھوڑ یار' سالی بیچ کو کس چکر میں پڑ گیا۔ اب ذرا یار لوگوں کے عیش ہوں گے۔ کام پورا چوکس ہوا ہے۔''

میں نے ایک بار پھر اپنی جان چھڑانے کی کوشش کی۔ ''نہیں بھئی' سچ کہہ رہا ہوں۔ مجھے بہت نیند آرہی ہے۔'' مگر وہ کہاں باز آنے والا آدمی تھا' کہنے لگا۔ ''استاد' دل نہ توڑ۔ اس کام میں دونوں ہی کا ساجھا ہے میں کبھی چھوٹا پن نہیں کرتا۔ ہمیشہ مل بانٹ کر کھاتا ہوں۔'' اس نے بے تکلفی سے میری پیٹھ تھپ تھپائی۔ ''یار! زیادہ نخرے نہ دکھا۔ آ ؤ میرے ساتھ۔'' اس نے ایک موٹی سی گالی دی۔ وہ آگے بڑھا۔ میں چپ چاپ اس کے ساتھ چلنے لگا۔ ہم دونوں اب کشادہ سڑکوں کے بجائے تنگ و تاریک گلیوں میں سے گزر رہے تھے۔ اندھیرے کے باعث میں ٹھیک سے دیکھ نہیں سکا۔ البتہ اتنا اندازہ ضرور تھا کہ سانولے خان کی بغل میں ایک ڈبا دبا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر میں اور بھی بدحواس ہو رہا تھا کہ کہیں راستے میں گشت کرنے والے کانسٹیبل مل گئے تو دونوں مع مال مسروقہ پکڑے جائیں گے۔ کچھ بھی سوچ کر میں نے کہا۔

''بھئی! مجھے تو اب تم جانے ہی دو۔''

میری آواز خوف سے کانپ رہی تھی۔ میری گھبراہٹ اور سراسیمگی دیکھ کر وہ ٹھٹھول پن پر اتر آیا۔ ہنس کر کہنے لگا۔ یار تو اتنا ڈر کیوں رہا ہے۔ زائد سے زائد یہی تو ہوگا کہ رات حوالات میں کاٹنا پڑے گی۔ دونوں مزے سے ٹانگیں پھیلا کر صبح تک سوئیں گے۔ وہ آہستہ آہستہ گنگنانے لگا۔

اب تو آرام سے گزرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے

میں نے چپ رہنے ہی میں مصلحت سمجھی۔ خاموشی سے اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ اس نے گنگناتے گنگناتے آواز ذرا اونچی ہی کی تھی کہ دفعتاً ایک شخص جھپاک سے نکلا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ سانولے فوراً خاموش ہو گیا۔ ہم دونوں ٹھٹک کر رہ گئے۔ جب وہ دور چلا گیا تو سانولے خاں سرگوشی کے سے انداز میں کہنے لگا۔

''سالے نے خواہ مخواہ ڈرا دیا۔ اپنی ہی کوئی بھائی بند معلوم ہوتا ہے۔''

اس دفعہ بھی میں نے کوئی جواب نہ دیا۔

کچھ دور تک ہم خاموش چلتے رہے۔ آخر ایک ایسی جگہ پہنچ کر ہم دونوں رک گئے جہاں بیشتر بوسیدہ اور نیم پختہ مکانات تھے۔ ہر طرف گہرا سناٹا تھا۔ بستی اندھیرے میں قبرستان کی طرح اجاڑ معلوم ہو رہی تھی۔ سانولے خان ایک تنگ گلی میں داخل ہوا۔ اس کے پیچھے پیچھے میں بھی آگے بڑھنے لگا۔ اندھیرا اس قدر زیادہ تھا کہ سانولے خان مجھے دھندلی پرچھائیں کی طرح لگ رہا تھا۔

ہم دونوں سنبھل سنبھل کر قدم رکھتے ہوئے آہستہ آہستہ گلی کے اندر چل رہے تھے۔ کوئی سو قدم ہم اسی طرح چلتے رہے۔ پھر ایک مکان کی دیوار کے قریب سانولے خان رک گیا اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے بولا۔ ''آگے جانے کی ضرورت نہیں۔'' وہ چند لمحے خاموش کھڑا سن گن لیتا رہا۔ جب کوئی آہٹ سنائی نہیں دی تو وہ دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

ذرا دیر بعد آہستہ آہستہ دروازے کھٹ کھٹانے کی آواز ابھرنے لگی۔ اسی وقت کسی کی کھنکار بھی سنائی دی پھر آہستہ سے دروازہ کھلا اور دبی دبی سرگوشیاں ہونے لگیں۔

سانولے خان میرے پاس آیا اور آہستہ سے بولا۔ ''میرے ساتھ چلو'' میں اس کے ہمراہ چلتا ہوا ایک مکان کے دروازے پر پہنچا۔ وہ اندر داخل ہوا۔ میں بھی اندر چلا گیا۔ فوراً ہی کسی نے جھٹ سے دروازہ کا بولٹ چڑھا دیا۔ وہاں بالکل اندھیرا تھا۔

ہم دونوں سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتے ہوئے ایک کمرے میں پہنچے یہاں ایک موم بتی جل رہی تھی۔ میں نے دیکھا ہم دونوں کے علاوہ کمرے میں ایک شخص اور بھی موجود تھا۔ وہ ادھیڑ عمر تھا اور پستہ قد کا کچھ گول مٹول سا تھا۔ اس کی توند خوب آگے لٹکی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ کچھ بھونچکا سا ہو گیا۔ سانولے نے مسکرا کر فوراً اسے اطمینان دلایا۔

''سیٹھ! یہ اپنا ہی آدمی ہے۔''

وہ اپنے گندے دانت نکال کر ہنسنے لگا۔ ''اچھا اچھا بیٹھو۔ پر بڑی ہشیاری کی ضرورت ہے۔ سالا لوگ کتے کی طرح سونگھتا پھرتا ہے۔'' وہ اپنے مخصوص کاروباری لہجے میں بات کر رہا تھا۔ سانولے خان جو ہمیشہ پریشانی کی موقع پر مسخرہ پن کرنے لگتا تھا' اسے چھیڑنے لگا۔

''سیٹھ گھبرانے کی ضرورت نہیں' ہم پکڑے جائیں گے تو تم کو بھی ہمارے ساتھ جیل کاٹنا پڑے گی۔ مزے کی گزرے گی' یہ تمہاری ساری توند وند ایک دم پچک کر رہ جائے گی۔ ٹھیک ہے نا؟''

وہ بگڑ کر بولا۔ ''تم سالا بر وبر بدماسی کی بات کرتا ہے۔ اپن کو تمہاری یہ مسکری بازی بالکل پسند نہیں۔'' وہ دیر تک بڑبڑاتا رہا۔
سانولے اس کو منانے لگا۔ ''یار سیٹھ' تو تو مذاق میں بگڑ جاتا ہے۔ اچھا اب کام کی بات کرو۔'' سیٹھ کو شاید اسی بات کا انتظار تھا۔
فوراً راضی ہو گیا' اس نے سامنے رکھے ہوئے۔ ٹرانزسسٹر ریڈیو پر ہاتھ پھرا کر چاروں طرف سے دیکھا اور سوکھا سامنہ بنا کر بولا۔

''سانولے' یہ تم آج کیا کنڈم مال اٹھا لایا' یہ تو ایک دم گڑ بڑ گھٹالا ہے۔''

سانولے گردن ہلا کر بولا۔ ''واہ استاد یہ ایک ہی کہی۔ سیدھی سیدھی معاملہ کی بات کرو۔ سیٹھ اپنے سے یہ ٹرکیں نہیں چلیں گی۔''

وہ کہنے لگا۔ ''دیکھو بابا' یہ مشینری کا کام بڑا کھترناک ہے۔ کسٹمر لوگ اسے کھریدتے ہوئے ڈرتا ہے۔''

سانولے خان کے لیے یہ پہلا موقع نہیں تھا۔ وہ ان کاروباری ہتھکنڈوں کو خوب سمجھتا تھا۔ کہنے لگا ''سیٹھ بات ٹھیک کرو' موسیٰ بھائی ابراہیم جی کا گھر یہاں سے دور نہیں۔ وہ خوشی خوشی سودا کر لے گا۔ ایک بات بولو۔ خریدو گے کہ نہیں؟'' اتنا کہہ کر سانولے ٹرانزسٹر اٹھانے لگا۔ وہ جھٹ سے بولا۔

''تم اپن سے کس مافک بات کرتا ہے سانولے خان' تمہارا ہمارا لین دین ہے تو اسے کھریدیں گا اور جو مال لائیں گا وہ بھی کھریدیں گا۔''

''تو پھر بولو' کیا دیتے ہو؟ ایک دم فسٹ کلاس چیز ہے۔''

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ چپ چاپ گھر کے اندر چلا گیا۔ ذرا دیر بعد نکلا تو اس کے ہاتھ میں سو روپے کا نوٹ تھا۔ سانولے اتنی قیمت پر ٹرانزسٹر بیچنے کے لیے آمادہ نہ تھا۔ بڑی دیر تک حجت ہوتی رہی۔ آخر سوا روپے پر سودا ہوا۔ اس میں سے بھی اس بوڑھے گھاگ نے ایک روپیہ سانولے کی خوشامد کر کے توڑ ہی لیا۔

وہاں سے نکل کر ہم دونوں سیدھے ایک ایرانی ہوٹل میں پہنچے۔ سانولے اس وقت بادشاہ بنا ہوا تھا۔ آرڈر پر آرڈر دے رہا تھا۔ دونوں نے خوب ڈٹ کر کھانا کھایا۔ کئی بار چائے بھی پی۔ نیند نے پھر مجھے پریشان کرنا شروع کر دیا۔ لہٰذا میں نے اس سے کہا۔

''بھئی اب لیٹنے کا کچھ بندوبست ہونا چاہیے۔''

وہ جھوم کر بولا' ہاں جی لیٹنے کا بندوبست بھی ہو گا اور ایسا ٹھاٹھ دار کہ تمہاری طبیعت پھڑک اٹھے گی۔''

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ میں نے سوچا' اس سے اچھا اور کیا پروگرام ہو گا۔ جھٹ آمادہ ہو گیا۔ سانولے نے کاؤنٹر پر جا کر بل ادا کیا اور ہم دونوں باہر آ گئے۔ ایرانی ہوٹل سے ذرا فاصلے پر پان کی دکان تھی اور ابھی تک کھلی تھی۔ سانولے خان سیدھا وہاں

پہنچا۔لمبی سی ایک ڈکار لے کر اس نے پنواڑی سے بڑے رعب کے ساتھ کہا۔

''استاد دو میٹھے پان تو بناؤ۔ایک میں چھالیا ذرا زیادہ ڈالنا۔''

پنواڑی نے دو پان لگا دیئے اور بے تکلفی سے آنکھ مار کر بولا۔''آج تو بڑے زوروں پر نظر آ رہے ہو۔رنگ کیا ہے؟''

سانولے نے زور کا قہقہہ لگایا۔''ابے اپنے اوپر کب رنگ نہیں رہا۔لا اندر سے دو سگریٹ بھی نکال۔لگے دم مٹے غم۔''

وہ رازدارانہ انداز میں بولا۔''یار دھیرے بول'' اس نے چاروں طرف چوکنا نظروں سے دیکھا اور الماری کے پیچھے سے دو سگریٹ نکال کر سانولے کو دیں۔

سانولے نے اس کے قریب منہ لے جا کر سرگوشی کی یہ سگریٹ تو مل گئیں پر اس وقت کچھ معاملہ بھی گٹھ سکتا ہے۔''اس نے بدمعاشی سے آنکھ دبا کر جیب کھنکھنا دی۔

پنواڑی بولا۔''وہ تو میں پہلے ہی تاڑ گیا تھا۔مگر تم نے دیر کر دی۔معاملہ مشکل ہی سے بنے گا۔''

سانولے نے ڈپٹ کر کہا۔''اب زیادہ نخرہ نہ کرو۔سالے تم نے پھر یہ دکان اب تک کیوں کھول رکھی ہے؟ پبلک کو گھسا پٹی پڑھاتے ہو۔''وہ بے حیائی سے ہنسنے لگا۔

''یار سانولے خاں تو تو سر ہو جاتا ہے۔بابا ناراض نہ ہو۔تیرے لیے کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑے گا۔''

پنواڑی نے گردن باہر نکال کر ہوٹل کے سامنے کھڑے ہوئے رکشاؤں میں سے ایک کو اشارے سے قریب بلایا۔جب وہ آ گیا تو اس نے آہستہ سے کہا۔''یہ دونوں تمہارے ساتھ جائیں گے' کہہ دینا کہ اپنے ہی آدمی ہیں اور دیکھ بے تکرار مت کرنا جو دے دیں وہی لے لینا۔''جب رکشا والا چلا گیا تو پنواڑی نے سانولے سے کہا۔''اس کو دو روپے دے دینا۔''سانولے نے جیب سے پانچ کا ایک نوٹ نکالا اور اس کے ہاتھ پر رکھ کر بولا۔

''یار میں یہ جھنجٹ نہیں پالتا تو خود اس سے نبٹ لینا۔''

پنواڑی کی خوشی سے باچھیں کھل گئیں' کہنے لگا۔''تم فکر نہ کرو۔جاؤ اب دیر کیوں کر رہے ہو۔''

ہم دونوں رکشے پر جا کر سوار ہو گئے اور رکشا چل دیا۔سانولے نے جیب سے دو سگریٹیں نکالیں' ایک خود سلگائی اور دوسری میرے منہ میں لگا کر بولا۔''لمبا کش نہ لگانا''میں نے سگریٹ سلگا کر پہلا ہی کش لیا تھا کہ دم گھٹنے لگا۔سگریٹ کے دھوئیں سے عجیب سی بو آ رہی تھی۔ایسی بو جو عام سگریٹوں کی بو سے تیز بھی تھی اور اس میں کڑواہٹ بھی تھی۔

میں نے دو تین بار کھانس کر جلدی سے پوچھا۔ ''اماں یہ کیسی سگریٹ ہے؟''

وہ لا پرواہی سے بولا ''میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ لمبا کش نہ لگانا۔ ذرا تیز سگریٹ ہے۔''

میں آہستہ آہستہ سگریٹ پیتا رہا۔ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ میرا سینہ سلگ رہا ہے' گردن کی رگیں تن رہی ہیں اور آنکھوں کے سامنے کالے کالے پردے لہرا رہے ہیں۔ میں نے گھبرا کر قمیض کی بٹن کھول دیئے۔ ہوا لگی تو پردے اور بھی تیز سے لہرانے لگے۔ ان کے ساتھ ہی میں بھی جھومنے لگا۔ ایک بار جھونک میں آ کر سانولے پر آ گیا۔

وہ زور سے قہقہہ لگا کر بولا۔ ''بڑے زوروں پر جا رہے ہو یار معلوم ہوتا ہے کہ رنگ چڑھ گیا ہے۔''

میں جھٹ سے سنبھل کر بیٹھ گیا اور اس سے پوچھنے لگا۔ ''بھئی سانولے یہ کس تمباکو کی سگریٹ ہے؟'' مجھے اپنی آواز اس طرح معلوم ہوئی جیسے میں کہیں دور سے بول رہا ہوں۔

''میری جان اسے چرس کہتے ہیں' کہو مزہ آ گیا۔''

چرس کا نام سنتے ہی میں ایک دم گھبرا گیا۔ اس وقت رکشا بجلی کے ایک کھمبے کے نیچے سے گزر رہا تھا۔ میں نے روشنی میں دیکھا۔ سانولے کی آنکھیں جنگلی کبوتر کی طرح سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ جھوم جھوم کر اپنی بھونڈی آواز میں گا رہا تھا۔ ''لگے دم مٹے غم'' سانولے خاں اس وقت مجھے بہت خوفناک معلوم ہوا۔ پتہ نہیں وہ اس وقت مجھے کہاں لیے جا رہا تھا۔ پنواڑی سے اس نے اشاروں ہی اشاروں میں جو باتیں کی تھیں وہ میرے لیے معمہ نہیں تو کم از کم عجیب و غریب ضرور تھیں۔ اس طرح سوچتے سوچتے یکبارگی میرے جسم کے اندر سے ایک رو نکلی اور اس طرح سر پر پہنچی کہ میں لڑکھڑا کر آگے کو جھک گیا۔ میری آنکھیں بند ہو گئی تھیں۔ اسی وقت میں نے سانولے کی آواز سنی' وہ کہہ رہا تھا۔

''اماں' تم تو بالکل مرزا پھویا ہو۔''

میں نے جلدی سے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ سڑک کے ایک موڑ پر اندھیرے میں رکشا کھڑا تھا۔ سانولے نے مجھے سنبھال کر اتارا۔ رکشے والا کہہ رہا تھا۔ ''میں ابھی آیا'' اور وہ اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

ہم دونوں سڑک کے کنارے خاموش کھڑے رہے۔ ذرا دیر بعد وہ واپس آیا سانولے سے بولا ''چلئے جی'' ہم دونوں اس کے پیچھے پیچھے چل دیے۔ ایک سہ منزلہ عمارت کے قریب رک کر اس نے دروازہ آہستہ سے کھولا اور ہم تینوں زینہ طے کرتے ہوئے تیسری منزل کے ایک فلیٹ میں پہنچ گئے۔

سامنے ایک کشادہ کمرہ تھا جس میں روشنی تھی۔ خاصا سجا سجایا کمرہ تھا۔ دیواروں پر نیم برہنہ لڑکیوں کی بڑی بڑی تصویریں لگی تھیں' جن کی سڈول پنڈلیاں' خاص زاویے سے نظر آ رہی تھیں۔ کمرے میں ایک طرف ایک پرانا صوفہ سیٹ پڑا تھا۔ جس پر بھاری بھر کم جسم ایک ادھیڑ عمر عورت بیٹھی تھی۔ ہم دونوں کو اس نے چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا اور صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کر کے بولی۔

''اس وقت ہم کسی کو اندر نہیں دیتے۔ بارہ بجے اور پھاٹک بند زیادہ سے زیادہ ساڑھے بارہ۔ تم سلیمان کے جاننے والے ہو' اس لیے ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ لیکن آئندہ آنا تو جلدی آنا۔''

اس خرانٹ نائیکہ نے اچھا خاصا لیکچر دے ڈالا۔ سانولے بھی اس وقت چوکڑی بھولا ہوا تھا۔ بالوں کو کریدتے ہوئے آہستہ سے بولا۔ ''نہیں بائی جی آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ وہ بات یہ ہوئی۔'' مگر اسے زیادہ صفائی پیش کرنے کی ضرورت نہ پڑی۔ اسی وقت کمرے میں دو لڑکیاں داخل ہوئیں۔ ایک خاصی بھرے بھرے جسم کی تھی اور دوسری کچھ بیمار نظر آ رہی تھی۔ دونوں شاید ابھی ابھی میک اپ کر کے آئی تھی۔ چہرے پر پاؤڈر کھریا مٹی کی طرح لپا ہوا تھا۔ جلدی کا جل پھیل گیا تھا اور لپ اسٹک کے دھبے رخساروں کے نچلے حصے پر صاف نظر آ رہے تھے۔

میں نے نظریں چرا چرا کر دونوں کو دیکھا۔ مجھے وہ بڑی پھوٹی ہوئی سی معلوم ہوئیں۔ البتہ سانولے اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے دونوں کو اس طرح دیکھ رہا تھا' جیسے '' ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ'' والا اشتہار پڑھ رہا ہو لیکن ادھیڑ عمر نائیکہ نے دیر تک دیکھنے کا موقع نہیں دیا' پوچھنے لگی۔

''تو پھر کیا ارادہ ہے؟''

سانولے نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''کہو استاد کیا کہتے ہو؟'' مجھے خاموش دیکھ کر وہ بڑی بے حیائی سے بولا۔ ''اماں تم کو شرمائے جا رہے ہو تم سے تو یہ عورتیں اچھی ہیں' کیسے دیدے نکالے دیکھ رہی ہیں۔ بس تم بھی ایک دم فٹافٹ تیار ہو جاؤ۔''

میں نے جلدی سے کہا۔ ''میں کیوں شرمانے لگا۔'' اور میں نے دونوں لڑکیوں کی جانب نظریں اٹھا دیں۔ ایک تو خاموش رہی لیکن جس کا جسم ذرا گداز تھا وہ بڑے بھدے پن سے اٹھلا کر بولی۔ ''اے اس طرح دیکھو گے تو ہم کو نظر لگ جائے گی۔'' اور دوسری کی پیٹھ کے پیچھے منہ چھپانے لگی۔ عجیب چھچھورپن کا مظاہرہ تھا مگر سانولے اس ادا پر مر مٹا۔ جھوم کر بولا۔

''بائی جی! اب معاملے کی بات کرو۔''

وہ بولی' 'چلو پہلے تم کو جگہ بھی دکھا دوں اس کے بعد بات ہوگی۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور ہم دونوں کو لیے ہوئے کمرے سے

باہر آ گئی۔

سامنے مختصر سی چھت تھی۔ اس کے ایک سرے پر راہداری تھی جس سے گزر کر ہم دونوں ایک سائبان کے قریب پہنچ گئے۔ عورت نے سوئچ دبا کر روشنی کی تو میں نے دیکھا کہ سائبان کے پیچھے لکڑی کے تختوں کی دیواریں کھڑی کر کے کئی چھوٹے کیبن بنا دیے گئے ہیں۔ ہر کیبن میں پلنگ پڑا تھا اور میز کرسی بھی موجود تھی۔ بالکل سستے قسم کے ہوٹلوں کا سا بندوبست تھا۔

عورت کہنے لگی۔ ''اس وقت تو یہی ملیں گے۔ سارے کمرے بک ہو چکے ہیں۔ لیکن تم کو یہاں بھی ہر چیز مل جائے گی۔ شراب چاہو گے تو وہ بھی مل جائے گی۔ دیسی شرابوں میں ہمارے پاس صرف ہر بیجنا ہے۔ اس کے علاوہ کھانے پینے کا بھی انتظام ہو جائے گا۔ مگر اس کا بل آرڈر کے ساتھ ادا کرنا پڑے گا۔'' اس نے قدرے توقف کیا' پھر مڑ کر سانولے خاں کی طرف غور سے دیکھا۔ ''تم اطمینان سے یہاں رات بسر کر سکتے ہو۔ خطرے کی کوئی بات نہیں۔ ہم بڑی پابندی سے پولیس کو اس کا بھتا پہنچا دیتے ہیں۔ ویسے تھانیدار صاحب بھی اکثر مہمانوں کے ہمراہ دل بہلانے آ جاتے ہیں۔''

اس نے ساری تفصیلات ایک ہی سانس میں بتا دیں۔ بڑی منجھی ہوئی کاروباری عورت تھی۔ وہ ہم دونوں کو پھر اسی کشادہ کمرے میں لے آئی۔ سانولے نے دونوں لڑکیوں کو للچائی ہوئی نظروں سے گھور کر دیکھا اور پوچھنے لگا۔

''اب جو کچھ اور بات رہ گئی ہے وہ بھی کہہ ڈالو۔''

''پورے ڈیڑھ سو روپے ہوں گے۔ سوچ لو' سمجھ لو۔''

سانولے کہنے لگا۔ ''بائی جی! یہ تو بہت ہے' اب رات تو سمجھو گزر رہی چکی ہے۔''

وہ اسی طرح سنجیدگی سے بولی۔ ''ہمارے ہاں بھاؤ تاؤ نہیں ہوتا۔ بس ایک بات رقم رکھو اور مال اٹھاؤ۔''

سانولے اس کے انداز سے پھر بھی متاثر نہیں ہوا۔ ہنس کر بولا۔ کہو تو اسی روپے سیدھے ہاتھوں سے تمہاری نذر کروں۔'' وہ منجھے ہوئے تماش بینوں کے انداز میں بات کر رہا تھا۔

عورت رضامند نہ ہوئی کہنے لگے۔ ''ایک بار ہم نے کہہ دیا کہ بھاؤ تاؤ کرنا ہو تو کہیں اور چلے جاؤ۔ شہر میں بہت چکلے موجود ہیں۔'' یا تو وہ اسی طرح بات کرنے کی عادی تھی یا ہم دونوں کا پھٹیچر حلیہ دیکھ کر اس طرح بات کر رہی تھی۔ لیکن وہ جس قدر طنطنے کا مظاہرہ کر رہی تھی' سانولے اسی قدر بے تکلف ہوتا جا رہا تھا۔ وہ انکار کرتی رہی اور وہ اس کے انکار پر پانچ روپے بڑھاتا گیا لیکن سو روپے پر بولی رک گئی۔

آخر جب کسی طرح سودا نہ پٹا تو ہم دونوں اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ سانولے نے واپسی پر دس روپے ہرجانے کے طور پر دینا چاہے تو نائیکہ نے روپے لینے سے انکار کر دیا۔ زینے کے دروازے تک ہم دونوں کو پہنچانے آئی۔ نہ اس نے کسی خفگی کا اظہار کیا نہ ناک بھوں چڑھائی۔

سڑک پر آ کر ہم نے دیکھا کہ رکشا والا ابھی تک وہاں کھڑا تھا۔ دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ کام بنا نہیں۔ قریب آ کر کہنے لگا۔ "اجی میرا تو پہلے ہی آپ لوگوں کو یہاں لانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ ان سالیوں کے تو بڑے دماغ چڑھے ہوئے ہیں۔ پھر آج کل تو کہیں باہر کے فوجیوں کا جہاز آیا ہوا ہے۔ اس لیے ان کے نخروں میں اور بھی گرم مسالہ پڑ گیا ہے' ان کی سچ پوچھیے تو جی آمدنی ہی ان سے ہے۔ سالیاں بالکل میمیں بن گئی ہیں ایک دم۔" وہ سانولے کی کدورت دور کرنے کے لیے الٹی سیدھی ہانک رہا تھا کہ لگے ہاتھوں کچھ مل جائے تو اور اینٹھ لوں۔ سانولے واقعی کچھ نڈھال اور چپ چپ نظر آ رہا تھا۔ اس کی بات کاٹ کر بولا۔

"مار سالیوں کو گولی' چل تو ہم دونوں کو پرانی نمائش چھوڑ دے۔"

میں نے کہا۔ "سانولے میرا کہنا مانو تو تم جا کر ٹھہر جاؤ۔ میں تو اب کہیں جا کر پڑ رہوں گا۔ اس کے بجائے تم مجھے دس روپے دے دو۔"

مگر وہ آمادہ نہ ہوا' کہنے لگا۔ "یار تم نے کمال کر دیا۔ بھئی حد ہو گئی۔ تم نے سانولے خاں کو اتنا نیچ کیوں سمجھ لیا۔ یار ہم تو یاروں کے یار ہیں۔ اب تو جہاں جائیں گے ساتھ ہی جائیں گے۔" اور وہ اچک کر رکشا پر بیٹھ گیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر برابر بٹھاتے ہوئے بولا۔ "چلو اب چل کر کہیں سونے کا انتظام کرتے ہیں۔"

رکشا چل دیا اور سانولے خان جھوم جھوم کر اپنی ڈھنڈگی آواز سے گانے لگا۔ اب وہ پھر فارم میں آ گیا تھا۔

پرانی نمائش کے پاس پہنچ کر اس نے رکشا والے کو ایک روپیہ دیا اور مجھے اپنے ساتھ لیے ہوئے لکڑی کے ایک کیبن کے نزدیک پہنچ کر پکارنے لگا۔ "کلن! اماں کلن سو رہے ہو؟"

اندر سے کسی نے پوچھا۔ "کون ہے جی؟"

سانولے بے تکلفی سے بولا۔ "ابے بھسنڈ کے میں ہوں سانولے۔"

کلن کھانستا ہوا اٹھا اور دروازہ کھول کر بولا۔ "اس وقت کہاں سے آ رہے ہو؟"

سانولے کہنے لگا۔ "فی الحال تو تمہارے کیبن کے اندر سونے کا ارادہ ہے' سخت نیند آ رہی ہے۔" کلن نے کوئی جواب نہیں دیا اور سر

جھکا کر سوچنے لگا۔

سانولے نے ڈپٹ کر کہا۔ "ابے سوچ کیا رہا ہے۔ دروازے سے ہٹ میں اندر آ رہا ہوں۔" وہ جلدی سے بولا "ٹھہر تو یار! اندر تیری بھابھی لیٹی ہے۔" سانولے نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا ابے کیا تیری گھر والی آ گئی؟ سالے تم دونوں ہی بے غیرت ہو۔ کہاں تو کل تک طلاق طلاق ہو رہی تھی اور آج پھر کیبن آباد ہے۔"

کلن کہنے لگا۔ "اماں اب تم سے کیا کہوں سب نے مل کر"

اسی وقت اندر سے ایک عورت کی آواز ابھری۔ "بھائی سانولے! دیکھو پھر انہوں نے وہی باتیں شروع کر دیں، جس کی نوسو دفعہ غرض پڑی تھی، وہ خوشامد کر کے لایا تھا، میں کسی کے پاس سفارش۔"

کلن نے جلدی سے صفائی پیش کی۔ "نیک بخت تو نے میری بات تو پوری سنی ہوتی۔"

مگر وہ بڑی تیز طرار عورت تھی۔ اس نے کلن کی ایک نہ سنی بس اپنی ہی کہتی رہی۔ سانولے نے دونوں کو ڈانٹا اور دس روپے کا ایک نوٹ کلن کو دے کر بولا۔ "میری طرف سے بچوں کو دے دینا۔"

کلن کہتا ہی رہا۔ اماں پان تو کھالو۔" مگر وہ وہاں نہ ٹھہرا۔

اب ہمارے سامنے پھر وہی مسئلہ تھا کہ رات کہاں کاٹی جائے۔ میں تو تھا ہی گھرا، مگر سانولے کا بھی کوئی ٹھور ٹھکانا نہ تھا۔

ہم دونوں آگے بڑھے۔ مگر زیادہ دور نہ گئے۔ سڑک کے کنارے رکشا والوں کا ایک اڈا تھا، یہاں چھوٹا سا الاؤ بھی دہک رہا تھا جس کے گرد رکشا والے بیٹھے تھے۔ پاس ہی ساوار سنبھالے ایک چائے والا بھی موجود تھا۔ ہم دونوں نے اس سے چائے کی ایک ایک پیالی اور وہیں الاؤ کے پاس بیٹھ کر پینے لگے۔ اس وقت چائے نے بڑا مزہ دیا۔

سانولے کچھ دیر وہاں بیٹھا رہا پھر کچھ سوچ کر بولا۔ "چل یار ایک جگہ اور چلتے ہیں۔ یہاں اوس میں تو دونوں کا پلیتھن نکل جائے گا" اس بار بھی اس نے پوری بات نہیں بتائی۔ رکشا لیا اور دونوں چل دیئے۔

پٹیل پاڑے کی ایک سنسان گلی کے پاس اس نے رکشا رکوایا اور کرایہ دے کر گلی کے اندر گھس گیا ابھی چند ہی قدم کا فاصلہ طے کیا تھا کہ ہمارے چہروں پر ٹارچ کی روشنی لہرائی اور کسی نے آہستہ سے پوچھا۔ "کون؟"

سانولے شوخی سے بولا "پیا بالم"

اس دفعہ اس آدمی نے لہجے پر زور دے کر کہا۔ "ٹھیک سے بولو۔ کس کے پاس جانا ہے؟"

سانولے پر اس کے ٹوکنے کا کوئی اثر نہ ہوا' برابر آگے بڑھتا گیا اور قریب جا کر بولا۔ "ابے آج تیری ڈیوٹی ہے۔ سالے اب چچا کو پہچانو گے بھی نہیں۔" اور اس نے فوراً سانولے کو پہچان لیا۔

"اماں' خان صاحب تم ہو! یار میں نے کہا اتنی رات گئے یہ کون آ دھمکا۔"

سانولے پوچھنے لگا۔ "کیا رنگ ڈھنگ ہے؟"

وہ بولا "آج بڑے زوروں کا معرکہ ہے۔"

وہ ہم دونوں کو ٹھہر کر برابر والے مکان میں چلا گیا۔ واپسی پر ہم اس کے اندر پہنچ گئے۔ یہ ایک لمبا کمرہ تھا۔ آمنے سامنے کی دو دیواروں کے طاقوں میں لیمپ روشن تھے۔ پھر بھی روشنی کچھ دھندلی اور مٹیالی سے لگ رہی تھی۔ کمرے کی فضا تمباکو کے دھوئیں سے گھٹی ہوئی تھی۔ سامنے دری پر کئی آدمی بیٹھے تھے اور پاگلوں کی طرح بے تکان بول رہے تھے۔ بال بکھرے ہوئے۔ چہرے پر خوف ناک حد تک اجاڑ۔ اس گھٹی ہوئی فضا میں تاش بٹ رہے تھے اور داؤں لگ رہے تھے۔

اس قمار خانے کو دیکھ کر مجھے جتنی گھبراہٹ معلوم ہوئی' سانولے کا چہرہ اتنا ہی کھل اٹھا۔ وہ مجھے اپنے ہمراہ لیے ہوئے آگے بڑھا اور ہنستا مسکراتا جواریوں کے جمگھٹے میں شامل ہو گیا۔ جیب سے اس نے دس کا ایک نوٹ نکال کر رکھ دیا اور چلانے لگا۔

"دو روپے پر دہلا اندر"

برابر سے آواز آئی۔ "پتہ مار کر دو روپے پر دہلا باہر"

سانولے بولا "اور لگاؤ' پورے پانچ کر لو۔"

اس شخص نے کہا۔ "چلو یہ ہی سہی" پھر تاش بانٹنے والے سے بولا۔ "پھینک دہلا باہر"

تاش برابر بٹتے رہے۔ سانولے نے ایک دوسرے جواری سے بھی داؤں لگایا۔ وہ اب بڑے تال سر کے ساتھ کہہ رہا تھا۔ "دہلا اندر' پنجہ باہر" اتنے میں بانٹنے والے کے ہاتھ سے اینٹ کا دہلا نکل کر سامنے گرا۔ سانولے نے تاش اٹھایا اور بے اختیار اسے چوم لیا۔ "ہے جیو میرے راجا" تھوڑی دیر بعد دوسرا داؤں بھی جیت گیا۔ اس نے جلدی سے سارے روپے سمیٹ کر سامنے کر لیے۔ ایک طرف سے آواز آئی۔

"ابے ذرا دیکھ کے پہلی جیت منگائے بھیک"

سانولے نے گھور کے اس کی طرف دیکھا۔ "دیکھ بے ہاتھ پر بولا تو سالے وہ لگاؤں گا جھانپڑ کی بتیسی باہر نکل پڑے گی۔"

میرے لیے یہ سب کچھ دلچسپ بھی تھا اور حیرت انگیز بھی۔ جواری ہار رہے تھے اور جیت رہے تھے اور ہار رہے تھے۔ سگریٹ اور بیڑی پر لمبے لمبے کش لگ رہے تھے۔ جس کے دھوئیں نے کمرے کی فضا دھندلی کر دی تھی۔ سانولے کچھ دیر تک تو مجھ سے کچھ نہ کچھ بات کرتا رہا۔ اس کے بعد کھیل میں وہ اس طرح الجھا کہ تن من کا ہوش نہ رہا۔ ادھر کچھ دیر تو جوئے کا یہ ہنگامہ مجھے اچھا لگا۔ لیکن رفتہ رفتہ دلچسپی کم ہوتی گئی اور نیند کا غلبہ بڑھنے لگا۔ مجھے خبر نہیں کہ کب سویا البتہ جب آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا۔ سانولے مجھے جھنجھوڑ کر جگا رہا تھا۔

''یار تو تو گھوڑے بیچ کر سوتا ہے۔''

میں بڑی گہری نیند میں تھا۔ اس کا اس طرح جگانا بڑا شاق گزرا۔ بادل نخواستہ اٹھنا پڑا۔

کمرے کے اندر ابھی لوگوں کی ملی جلی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ تاش بٹ رہے تھے اور روپے کھنک رہے تھے۔ لیکن سانولے نے پلٹ کر کسی طرف نہ دیکھا۔ مجھے ساتھ لیے ہوئے باہر آ گیا۔ اندھیری گلی عبور کر کے جب ہم دونوں سڑک پر پہنچے تو رات کا اندھیرا ابھی تک ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ بحیرہ عرب سے آنے والی ہوائیں اور بھی زیادہ ٹھنڈی معلوم ہو رہی تھیں سانولے اس وقت بالکل خاموش تھا۔ اس کا چہرہ پتھر کے مجسمے کی طرح ٹھوس نظر آ رہا تھا۔ نہ اس پر دکھ تھا نہ مسرت' البتہ اس کی آنکھیں اور بھی زیادہ سرخ ہو رہی تھیں۔ چلتے چلتے میں نے خاموشی سے اکتا کر پوچھا۔

''میں تو سو گیا تھا۔ بعد میں تمہارا کھیل کیسا رہا؟''

وہ کہنے لگا۔ ''تمہارے پاس کچھ ہو تو چل کر چائے پلا دو۔''

میں نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ ''کیا سب ہار آئے؟ تم نے تو حد کر دی۔''

''چھوڑ یار! جوئے میں اور کیا ہوتا ہے؟ ہار جیت۔ چل پہلے مجھے ایک چائے پلا۔ سالا سر میں درد ہو رہا ہے۔''

مجھے اس کی اس بات پر سخت تاؤ آیا۔ دل ہی دل میں کہا' دس روپے مانگتا رہا تو سالا ہر بار ٹال گیا۔ اب جیب میں دو چار آنے پڑے ہیں' اس میں بھی ساجھا لڑا رہا ہے اور رات بھر جگایا گھاٹے میں۔ جوں جوں مجھے اس بات کا خیال آتا میرا غصہ اور بھی بڑھتا جاتا۔ اب ہم دونوں خوجہ جماعت خانے سے آگے بڑھ کر سولجر بازار جانے والی سڑک پر آ گئے تھے۔ ہر طرف سناٹا تھا اور کہر کا دھندلا دھندلا غبار اور اس سرمئی غبار میں سڑک کے دونوں طرف بنی ہوئی خوبصورت عمارتیں اونگھتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ کائنات کی ہر چیز خوابیدہ تھی صرف ہم دونوں جاگ رہے تھے جن کے لیے نہ سر چھپانے کا کوئی ٹھکانہ تھا نہ کوئی منزل اور رات اتنی آہستہ چل

رہی تھی جیسے کبھی ختم نہ ہوگی۔

اسی طرح بے تکی باتیں سوچتے سوچتے میں نے سانولے کی جانب دیکھا۔ وہ ابھی تک بت کی طرح خاموش تھا۔ مجھے اس وقت وہ بڑا غلیظ اور قابل نفرت معلوم ہوا۔ اگر میں اس کے ساتھ یوں ہی چلتا رہوں گا تو یہ نفرت اور بڑھتی جائے گی۔ چنانچہ میں نے اس سے کہا۔

"اچھا بھئی سانولے میں تو اب ایک جگہ اور جاؤں گا۔"

میں سڑک کے ایک موڑ پر مڑنے لگا تو سانولے نے چونک کر کہا۔ "یار! ایسی بات مت کہو اب تم بھی اس کڑکی میں اپنا ساتھ چھوڑ دو گے۔ نہیں جی یہ نہیں ہوسکتا۔"

میں نے غور کیا۔ میری اس بات نے اس کو خاصا اداس اور دل شکستہ کر دیا تھا۔ مگر اب میں اس کے ساتھ زیادہ دیر ٹھہرنا نہ چاہتا تھا۔ آخر جب میں کچھ دور اس کے ساتھ ساتھ چلنے کے بعد ایک جانب مڑ گیا تو اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

میں نے بے رخی سے جھٹکا دے کر اپنا ہاتھ چھڑایا اور اس کے ہمراہ آگے جانے پر آمادہ نہ ہوا تو اچانک اس نے مجھے خونخوار نظروں سے گھور کر دیکھا اور بلی کی طرح جھپٹ کر میرا گلا دبوچ لیا۔ میں نے اس کی گرفت سے چھوٹنے کے لیے اس کے لمبے بال دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیے اور اس طرح ہم دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔

سڑک بالکل سنسان تھی۔ اونچی اونچی عمارتیں خوابیدہ تھیں۔ رات اژدھے کی طرح رینگ رہی تھیں اور ہم دونوں ایک دوسرے کو وحشیانہ انداز سے مار رہے تھے۔ نوچ کھسوٹ رہے تھے۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ میں سانولے کو گرا کر اس کے سینہ پر چڑھ بیٹھا اور تابڑتوڑ گھونسے مارنے لگا۔ اس نے جل کر مجھے دو تین گالیاں دیں اور نہ جانے کس طرح شلوار کے نیفے سے لوہے کی وہ سلاخ نکالی جس کی وہ کمائی کا ٹھیکرا کہا کرتا تھا۔ اس نے سلاخ میری کمر میں اڑا کر چاہا کہ گوشت کے اندر اتار دے۔ لیکن میں نے سلاخ جھپٹ سے چھین کر ایک طرف پھینک دی۔ ایک بار پھر میں نے اسے مارنا شروع کر دیا۔ مارتے مارتے میرا دم پھول گیا۔ آخر اس نے نیچے سے زور کیا اور مجھے گرا دیا۔ میں لوہے کی سلاخ اٹھانے کے لیے لپکا لیکن لڑکھڑا کر گر پڑا۔ سانولے سے بھی اٹھ کر اس طرف بڑھا نہیں گیا۔

ہم دونوں بھینسوں کی طرح ہانپ رہے تھے، منہ کھلے تھے اور سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ کپڑے جگہ جگہ سے پھٹ گئے تھے۔ چہرے خاک میں لتھڑے ہوئے تھے۔ رات کے پچھلے پہر سنسان سڑک پر ہم بھوتوں کی مانند خوفناک نظر آ رہے تھے۔ ہانپتے

ہانپتے میں وہیں لیٹ گیا اور نڈھال ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔

کچھ دیر بعد میں نے دیکھا۔ سانولے برابر بیٹھا میری پیٹھ سہلا رہا تھا۔ اس نے رسان سے کہا۔ "ناک سے سانس لو ناک سے" اس کے لہجے میں شفقت تھی۔ میری طبیعت اب ذرا سنبھل چکی تھی۔ مجھ سے ایک لفظ نہ کہا گیا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ مجھے گردن جھکائے خاموش بیٹھا دیکھ کر وہ بولا۔ "اٹھ یار' اب عورتوں کی طرح کب تک نخرے کرے گا۔" اس نے میرا بازو پکڑ کر کھڑا کر دیا اور کندھا تھپتھپا کر بولا۔

"آدمی تو بھی کس بل کا ہے' مزا آ گیا۔ پر یار کپڑے پھٹ گئے۔ یہ برا ہوا۔"

میں کچھ اس قدر خفیف ہو رہا تھا کہ اس بار بھی مجھ سے کچھ کہا نہ گیا۔ مگر وہ اسی طرح بے تکلفی سے باتیں کرتا رہا۔ اس کے ہاتھ میں لوہے کی خم دار سلاخ دبی تھی۔ اسے انگلیوں میں گھماتے ہوئے بولا۔ "استاد گھبرائے کیوں جا رہے ہو۔ ابھی تو رات ہے۔ چلو کہیں موقع لگاتے ہیں۔ فکر کاہے کی' جب تو ہے تو کیا غم۔" مجھ سے انکار کرتے نہ بن پڑا اور میں اس کے ہمراہ ایک ویران سڑک پر مڑ گیا۔

کچھ دیر تک ہم دونوں یونہی چلتے رہے پھر ایک مقام ایسا آ گیا جہاں اندھیرا بہت گہرا تھا ہر سو ہو کا عالم تھا۔ سانولے نے چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا گھوم پھر کر سن گن لی اور بندر کی طرح اچھل کر ایک بنگلے کی چار دیواری پر چڑھ گیا۔ ہاتھ پکڑ کر اس نے مجھے بھی اوپر چڑھا لیا۔ پرانی وضع کا بنگلہ تھا اور گھنے درختوں سے ڈھکا ہوا بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔

سانولے خان آہستہ سے پھسل کر نیچے اتر گیا اور آن کی آن میں نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ کئی منٹ گزر گئے۔ اندھیرے کا جال اسی طرح پھیلا رہا۔ اچانک رات کے سناٹے میں کتے کے زور زور سے بھونکنے کی آواز سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی سانولے خان کی دلدوز چیخیں ابھریں۔ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر میں جھٹ سے کود کر سڑک پر آ گیا اور سرپٹ بھاگنا شروع کر دیا۔

اس روز کے بعد سے آج تک سانولے خاں کو میں نے دیکھا' خدا معلوم جیل میں ہے یا ابھی تک آوارہ گرد کتوں کی طرح راتوں کو گھومتا پھرتا ہے۔

◆◆◆

ہفتے کی شام

کمرے کا دروازہ کھلتے ہی وہ اندر آ گئی۔ پہلے اس نے کمرے کا جائزہ لیا پھر دالان کی طرف دیکھنے لگی۔ جھٹ پٹا وقت تھا۔ باہر اندھیرا پھیل چکا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''بھابی ہیں؟''

میں نے جواب دیا۔ ''جی نہیں! وہ اپنے کسی رشتہ دار کے یہاں گئی ہیں۔ کل واپس آئیں گی۔''

وہ ذرا دیر چپ چاپ کھڑی کچھ سوچتی رہی' پھر دروازے کی جانب مڑتے ہوئے بولی۔ ''اچھی بات ہے۔'' لیکن وہ کمرے سے باہر نہ گئی۔ دہلیز پر ٹھٹک کر رہ گئی۔

اس دفعہ اس نے میری طرف نظریں اٹھا کر دیکھا۔ ''آج ان کے آنے کا کوئی امکان نہیں؟ ان سے ایک ضروری کام تھا۔''

میں نے کہا۔ ''نہیں' آج وہ نہیں آ سکیں گی۔''

لمحہ بھر توقف کرنے کے بعد وہ بولی۔ ''آپ اس وقت میرے لیے پچاس روپے کا بندوبست کر سکیں گے؟''

میں تذبذب میں پڑ گیا۔ روپے تو میرے پاس تھے۔ لیکن وہ اپنی ضرورت کے لیے تھے' قرض دینے کے لیے نہیں تھے۔ میں نے اس کے چہرے کی جانب دیکھا۔ اس کے چہرے پر ایسی کوئی علامت نہیں تھی جسے دیکھ کر ہمدردی یا خدا ترسی کا کوئی جذبہ پیدا ہو۔ وہ خاموش کھڑی میرے جواب کا انتظار کر رہی تھی۔ مجھ سے انکار کرتے نہ بن پڑا۔ میں نے چپ چاپ اٹھ کر سوٹ کیس نکالا۔ پچاس روپے نکالے اور اسے دے دیے۔ اس نے روپے لے کر شکریہ ادا کیا۔ انگلی سے انگوٹھی اتاری اور سامنے میز پر ڈال دی۔

''اسے رکھ لیجیے' میں ۲۱ تاریخ کو واپس لے جاؤں گی۔''

اس کی یہ حرکت مجھے کچھ عجیب سے معلوم ہوئی۔

میں نے کہا۔ ''اس کی کیا ضرورت ہے۔ روپے جب جی چاہے واپس کر دیجیے گا۔''

میں نے انگوٹھی اٹھا کر اس کی طرف بڑھا دی۔ لیکن وہ اسے واپس لینے پر آمادہ نہ ہوئی۔

میں نے جب زیادہ اصرار کیا تو کہنے لگی۔

''اچھا تو پھر یہ روپے رکھ لیجیے۔ میں کہیں اور سے انتظام کر لوں گی۔''

آخر مجھے اس کی بات ماننا پڑی۔ حالانکہ اس کی یہ حرکت کچھ اچھی نہیں لگی۔

وہ جس طرح خاموشی سے کمرے میں داخل ہوئی تھی اسی طرح باہر چلی گئی۔ میں نے انگوٹھی اٹھا کر دیکھی۔ اچھی خوبصورت وضع کی بنی ہوئی تھی۔ میں نے سوچا کہ لڑکی کا مذاق بڑا ستھرا ہے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میری اس سے اس طرح بات چیت ہوئی۔ یوں وہ میرے گھر میں اکثر آیا جایا کرتی تھی۔ میں اس محلہ میں نووارد تھا لہٰذا پاس پڑوس کے لوگوں کے متعلق میری معلومات کچھ زیادہ نہیں تھیں۔

مجھے اس کے بارے میں صرف اتنا معلوم تھا کہ سرکاری کوارٹروں کی دوسری جانب میدان میں مہاجرین کی جو جھگیاں تھیں' انہی میں سے کسی میں وہ رہتی تھی۔ اس کے گھر میں کوئی بھی ایسا نہیں تھا جسے مردوں کے زمرے میں شامل کیا جائے۔ ایک چھوٹا بھائی تھا جو مشکل سے دس سال کا ہوگا۔ اس کے علاوہ دو چھوٹی بہنیں تھیں اور ماں باپ اور بڑا بھائی فسادات میں مارے گئے تھے۔ ماں اور بہنیں پردہ کرتی تھیں۔ شروع شروع میں جب وہ یہاں آئی تھی تو برقع پہن کر باہر نکلتی تھی۔ ادھر کچھ مدت سے برقع اتار کر رکھ دیا تھا۔ گھر بھر کا خرچ کیسے چلتا تھا۔ یہ ایک راز تھا۔ کسی کو اس علم نہیں۔ اس کی ماں کہتی تھی کہ لاہور میں لڑکی کا ایک ماموں رہتا ہے جو روپے پیسے سے وقتاً فوقتاً ان کی مدد کرتا رہتا ہے۔

یہ باتیں بھی مجھے اس طرح معلوم ہوئیں کہ میں جس کوارٹر میں رہتا ہوں وہ ایک سرکاری ملازم کے نام الاٹ ہے' تنخواہ میں گزارا نہیں ہوتا۔ لہٰذا اس نے یہ کوارٹر مجھے کرائے پر دے دیا اور خود جھگی ڈال کر سامنے میدان میں رہنے لگا۔ تا کہ کبھی اسٹیٹ آفس والے آ کر تحقیقات کریں تو فوراً کوارٹر میں پہنچ کر یہ ثابت کر سکے کہ وہ خود یہاں رہتا ہے۔

ذرا دیر بعد میں سگریٹ خریدنے باہر گیا تو پروویژن اسٹور کے پاس نیاز صاحب مل گئے۔ وہ میرے پڑوس میں رہتے ہیں۔ کسی دفتر میں ہیڈ کلرک ہیں۔ ادھیڑ عمر کے آدمی ہیں' معاشرہ کی اصلاح کے زبردست حامی ہیں۔ محلہ میں انہوں نے اصلاح المسلمین کے نام سے ایک انجمن بھی قائم کر رکھی ہے۔ ہر اتوار کو باقاعدگی سے اس کے اجلاس ہوتے ہیں۔ محلے کے بہت سے رہنے والے اس انجمن کے ممبر ہیں۔ ان ہی کے کوارٹر کے ایک حصہ میں انجمن کا دفتر ہے اور اسی میں ایک چھوٹا سا دارالمطالعہ بھی ہے۔ نیاز صاحب انجمن کے صدر بھی ہیں۔ اس علاقے میں رہنے والے سب ہی ان کی عزت کرتے ہیں۔ اس روز مجھ پر وہ کچھ زیادہ ہی مہربان نظر آتے تھے۔ بڑے سرپرستانہ انداز میں مشورے دیتے رہے۔ سیاست پر وہ بہت کم بات کرتے ہیں۔ (غالباً سرکاری ملازم ہونے کے باعث) البتہ اخلاقی زبوں حالی کا ان کو بڑا قلق ہے چنانچہ اخلاقیات کا درس دے رہے تھے۔ بات کرتے کرتے اچانک مجھ سے

پوچھنے لگے۔

"یہ عورت عائشہ جو نیم کے پیڑ تلے رہتی ہے' آپ سے اس کی کب سے جان پہچان ہے؟"

میں نے کہا۔"جب سے یہاں آیا ہوں' اس وقت سے گھر میں آنے جانے لگی ہے۔"

کہنے لگے۔"دیکھئے اس کا اس طرح آپ کے گھر میں آنا جانا مجھے قطعی پسند نہیں۔ وہ محلے میں کچھ نیک نام نہیں اور آپ ٹھہرے عزت دار آدمی ۔۔۔۔۔۔۔ایسی عورتوں کو زیادہ منہ لگانا ٹھیک نہیں۔"

اگرچہ عائشہ میں مجھے ایسی کوئی علامت نظر نہیں آئی۔ لیکن میں ذرا دبو آدمی ہوں۔ کسی سے الجھنے کی مطلق کوشش نہیں کرتا۔ لہٰذا میں نے ان کی ہاں میں ہاں ملا دی۔"آپ کا خیال بالکل درست ہے۔ میں خود بھی اسے اچھا نہیں سمجھتا۔"

کہنے لگا۔"اچھا سمجھنے سے کام نہیں چلے گا۔ آپ فوراً گھر میں تاکید کر دیں اور اس کا آنا جانا بالکل بند کر دیں۔ میں نے سنا ہے کہ وہ جرائم پیشہ لوگوں سے ملی ہوئی ہے۔ اسی طرح گھروں کے اندر جا کر ٹوہ لگاتی ہے اور پھر چوری کروا دیتی ہے۔ جب سے یہ یہاں آئی ہے۔ کئی کوارٹروں میں نقب زنی اور چوری کی وارداتیں ہو چکی ہیں۔"

میں نے چہرے پر زبردستی حیرت کے آثار پیدا کرتے ہوئے کہا۔"اچھا! تو یہ اتنی خطرناک لڑکی ہے۔ مجھے تو اس کے بارے میں کچھ ایسا وہم وگمان بھی نہیں ہوا۔"

وہ فوراً بولے۔"اسی لیے تو میں نے عرض کیا کہ اس کا آنا جانا بند کرا دیجئے۔ آپ خود غور کیجئے کہ گھر میں کوئی مرد موجود نہیں۔ چار پانچ آدمیوں کا کنبہ ہے۔ آخر اتنے بڑے کنبے کا خرچ کس طرح چلتا ہے۔ پھر یہ دیکھئے کہ کس ٹھاٹھ سے رہتی ہے۔ کوئی دیکھے تو یہی کہے کہ کسی بڑے گھرانے کی عورت ہے۔"

ان کی یہ بات البتہ قابل توجہ تھی کہ عائشہ رہتی بڑی سج دھج سے تھی۔ جدید وضع کے ترشے ہوئے بال۔ صاف ستھرا سلیقہ سے سلا ہوا لباس۔ چہرے پر ہلکا میک اپ۔ خاص طرح دار لڑکی تھی۔ اس کے سامنے محلہ کے کلرکوں کی بیویاں منہ بسورتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔

نیاز صاحب میرے دروازے تک باتیں کرتے کرتے آ گئے۔ وہ برابر عائشہ کی برائیاں کرتے رہے۔ اسے ہر طرح خطرناک اور بدکردار ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ لیکن ایک بات میں نے غور کی اور وہ یہ تھی کہ وہ عائشہ کا تذکرہ "لڑکی" کی بجائے "عورت" کہہ کر کرتے تھے۔ حالانکہ عائشہ کا سن ان کی بڑی بیٹی سے زیادہ نہ ہوگا۔

بہرحال عائشہ کا خطرناک اور آوارہ ہونا میرے لیے ایک انکشاف ضرور تھا۔ رفتہ رفتہ اس کے متعلق اور بھی بہت سے انکشافات ہوئے۔

مجھے جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ کوارٹروں میں رہنے والے عائشہ کے متعلق بڑی خراب رائے رکھتے ہیں۔ نفرت اور بدگمانی کے باوجود ہر شخص اس کے ذکر میں دلچسپی کا اظہار ضرور کرتا۔ ویسے عائشہ کے بارے میں ہر ایک کی جداگانہ رائے ہے۔ مثلاً فدا احمد جس کا کوارٹر بالکل میری دیوار سے ملحق ہے' اس کا خیال ہے کہ عائشہ کا ذریعہ معاش بلیک میلنگ ہے۔ اس سلسلہ میں وہ شہر کے ایک سیاسی لیڈر کا نام بھی لیتا ہے (کم از کم میرے لیے کسی ایسے نام کا اظہار کسی طرح بھی خطرے سے خالی نہیں) اس کا کہنا ہے کہ ایک زمانہ میں عائشہ کی ان سے آشنائی تھی' پھر آپس میں ان بن ہو گئی۔ لیڈر کچھ اس طرح اس پر فریفتہ تھا کہ انہوں نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اسے کتنے ہی عاشقانہ خطوط لکھ ڈالے۔ یہ خطوط ابھی تک عائشہ کے پاس موجود ہیں۔ اب وہ تو کسی اور لڑکی میں دلچسپی لے رہے ہیں لیکن یہ خطوں کی دھمکی دے کر ان سے کچھ نہ کچھ رقم اینٹھ لاتی ہے۔

فدا احمد کے بیان میں کس قدر صداقت ہے اسے وہی بہتر سمجھ سکتا ہے یا عائشہ جانتی ہے۔ البتہ میں فدا احمد کے متعلق صرف اسی قدر جانتا ہوں کہ وہ ٹائپسٹ ہے۔ معمولی تنخواہ ملتی ہے۔ کنبہ بڑا ہے۔ اس لیے دفتر کے اوقات کے علاوہ کچھ پارٹ ٹائم دھندہ بھی کرتا ہے۔ یہ مکانوں کو پگڑی پر اٹھانے کا کاروبار ہے۔ اس دلالی سے اب تک اتنی آمدنی ہو چکی ہے کہ وہ ایک پلاٹ لے کر اس پر مکان بنوانے کے متعلق منصوبہ بنا رہا ہے۔

لیکن صفدر خان جو فدا احمد ہی کے دفتر میں کام کرتا ہے' قسمیں کھا کھا کر کہتا ہے کہ عائشہ الفنسٹن اسٹریٹ کی ایک دکان پر سیلز گرل ہے اس نے خود اسے کام پر کام کرتے دیکھا ہے۔ بلکہ ایک آدھ بار اس سے کچھ سامان بھی خرید کر لایا ہے۔ فدا احمد کی بات سے اسے صرف اختلاف ہی نہیں بلکہ کبھی کبھی جھنجلا کر گالیاں دینے پر اتر آتا ہے۔ وہ عائشہ کی حمایت میں اکثر محلے والوں سے بھی لڑ چکا ہے۔ ایک بار تو اس نے مجھے اپنے اعتماد میں لیتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا کہ یہ سب لوگ عائشہ سے اس لیے جلتے ہیں کہ وہ کسی کو منہ نہیں لگاتی۔ شروع شروع میں جب وہ یہاں آئی تھی تو ہر شخص اس کے خاندان سے ہمدردی جتاتا تھا۔ خود نیاز صاحب انجمن اصلاح المسلمین اسی غرض سے قائم کی تھی پہلے اس کا نام اصلاح مہاجرین تھا جس کے ذریعہ نیاز صاحب نے محلے بھر سے چندہ جمع کیا تھا۔ دفتر کے لیے اپنا کمرہ دیا۔ عائشہ کو انہوں نے شعبہ خواتین کا سیکرٹری چنا۔ ان دنوں ان کے گھر میں عائشہ کی آمد و رفت بہت زیادہ تھی۔ پھر نہ جانے کیوں وہ اس سے سخت ناراض ہو گئے اور اس کے ساتھ ہی مہاجرین کی امدادی تحریک بھی ختم ہو گئی اور انجمن اصلاح مہاجرین

کی بجائے ان کے کوارٹر پر اصلاح المسلمین کا بورڈ نظر آنے لگا۔ پہلے وہ اسے بہت ذہین اور صاحب کردار کہتے تھے۔ اب آوارہ اور خطرناک بتاتے ہیں۔ صفدر خان یہ سب کچھ اس لیے کہتا ہے کہ خود اس کی بہن کسی دفتر میں ٹائپسٹ ہے۔ علاوہ اس کے وہ یہ بھی جانتا ہے کہ وہ جس طرح عائشہ کے لیے سب کو برا بھلا کہتا رہتا ہے اس کی اطلاع کسی نہ کسی طور اسے بھی پہنچ جاتی ہوگی۔ اس طرح وہ اس کی ہمدردی حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

صفدر خان کی طرح عائشہ کا ایک اور بھی ہمدرد ہے۔ اس کو یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ وہ اسے بہن کی طرح سمجھتا ہے۔ یہ پستہ قد منحنی جسم کا ایک کلرک ہے۔ اس کا نام انوار ہے۔ عائشہ کے متعلق اس کا بیان سب سے مختلف ہے۔ وہ کہتا ہے کہ عائشہ بہت نیک اور محنتی لڑکی ہے۔ بے چاری لاوارث ہے۔ جن دنوں وہ یہاں آئی تھی سارا خاندان فاقوں پر فاقے کر رہا تھا۔ آخر اس نے اپنے ایک دوست کے ذریعہ کسی فرم میں ملازمت دلوادی۔ اس کا کام صرف اس قدر ہے کہ وہ گھر گھر جا کر یہ تحقیقات کرتی ہے کہ لوگ کون سا ٹوتھ پیسٹ استعمال کرتے ہیں۔ اس کے پاس ایک سوالنامہ ہوتا ہے جس کے ذریعہ وہ معلومات حاصل کرتی ہے۔ اس طرح کمپنی یہ جاننا چاہتی ہے کہ پاکستان میں ٹوتھ پیسٹ کی کتنی کھپت ہے تا کہ وہ اس کے مطابق حکومت سے یہ مطالبہ کرے کہ اسے زیادہ مال امپورٹ کرنے کی اجازت دی جائے۔ لیکن صفدر خان کی طرح وہ عائشہ کے لیے خم ٹھونک کر لڑنے مرنے پر تیار نہیں ہو جاتا۔

وہ ایک خاموش کارکن کی طرح اس کی بھلائی کا خواہاں ہے۔ پرسوں کے واقعہ کے بعد میرا خیال ہے کہ انوار بھی اپنی رائے بدل دے گا۔ ہوا یہ کہ جس بس سے میں دفتر جا رہا تھا اس میں انوار بھی اگلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ صدر کے قریب ایک بس اسٹینڈ پر اس نے عائشہ کا ٹکٹ بھی خرید لیا لیکن ذرا دیر بعد کنڈیکٹر نے پیسے واپس کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کا ٹکٹ پیچھے لیا جا چکا ہے۔" تو عائشہ نے مڑ کر انوار کی طرف دیکھا اور جھنجھلا کر بولی۔ "نہیں میں اپنا ٹکٹ خود لوں گی۔" میں نے دیکھا انوار کا چہرہ خفت سے سفید پڑ گیا تھا۔ خیریت یہ ہوئی کہ اس نے مجھے نہیں دیکھا ورنہ اور خفیف ہوتا۔

عائشہ نے جو کچھ کیا وہ درست تھا یا غلط؟ اور انوار نے جو حرکت کی تھی وہ کس جذبہ کے تحت تھی؟ یہاں اس سے بحث نہیں۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ ٹوتھ پیسٹ کی کھپت کے اعداد و شمار اکٹھا کرنے کے سلسلہ میں اس نے عائشہ کی جس ملازمت کا ذکر کیا تھا وہ تھی خوب۔ کچھ انوکھی بھی اور حیرت انگیز بھی۔

لیکن اس سے بھی زیادہ دلچسپ بات جس شخص نے بیان کی وہ خود بھی بڑا عجیب و غریب ہے۔ میں اسے آرٹسٹ کہوں تو بے جا نہ ہوگا۔ حالانکہ وہ اس بات پر مصر ہے کہ اسے انٹلیکچوئل سمجھا جائے۔ حال اس کا یہ ہے کہ سیاست پر بات کریں تو سیاست دان، فلسفہ پر

بات کریں تو فلسفی' سائنس کی بات کریں تو سائنس دان۔ غرضیکہ وہ اچھا خاصا تجریدی فن کا نمونہ ہے کہ آپ جس عنوان سے چاہیں اسے یاد کر سکتے ہیں۔ اس کی شخصیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

وہ پائپ کا کش لگا کر لوگوں کو اس طرح مرعوب کرنے کی کوشش کرتا ہے جیسے ابھی عقیدت سے سب کے سر اسکے سامنے جھک جائیں گے۔ لیکن دن بھر فائلوں سے الجھنے والے دفتری قسم کے لوگ اس سے ذرا بھی مرعوب نہیں ہوتے۔ وہ اسے انٹلیکچوئل کی بجائے الو کا پٹھا سمجھتے ہیں۔ یہی بے چارے کے ساتھ ٹریجڈی ہے۔ سابقہ اس کا پاکستانیوں سے ہے (جو پس ماندہ قوم کہلانے میں فخر محسوس کرتے ہیں) اور رکھ رکھاؤ فرانس کے آرٹسٹوں کا سا ہے جہاں مشہور بنگالی مصور زین العابدین کی ''بھینس'' کی دم میں نمدا نہیں بلکہ بلی باندھ کر تصویر کو مکمل کیا جاتا ہے۔

بہر حال ایک دن مجھے وہ آرٹسٹ مل گیا۔ بڑی اونچی اونچی باتیں کر رہا تھا۔ اسی اثناء میں عائشہ سامنے سے آتی ہوئی نظر آئی۔ آرٹسٹ نے مجھے روک لیا' کہنے لگا۔ ''میں اس لڑکی کا مطالعہ کرنا چاہتا ہوں۔ صاحب اس کی چال میں کیا ردھم ہے۔'' مجھے اس طرح راستہ میں کھڑے ہو کر کسی نوجوان لڑکی کو دیکھنا بڑا معیوب معلوم ہوا۔ ابھی اس نے چال میں ردھم دیکھا تھا۔ اندیشہ تھا کہ کہیں آرٹسٹک موڈ میں سرتال نہ دینا شروع کر دے۔ وہ ٹھہری تیز طبیعت کی لڑکی۔ آرٹسٹ تو سرتال ہی دیتا رہ جاتا اور وہ اسے تگنی کا ناچ نچانا شروع کر دیتی۔

خیریت ہوئی کہ وہ حد سے آگے نہ بڑھا۔ جب وہ چلی گئی تو مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''بڑا پرفیکٹ ماڈل ہے۔ اس ملک میں کسی چیز کی قدر نہیں۔ بھلا غور تو کیجئے کہ کسی آرٹسٹ کا اس قدر اعلیٰ ماڈل اور اسے تختہ مشق بنایا جائے کاروباری مقاصد کے لیے۔'' بات چونکہ میری سمجھ میں پوری طرح نہیں آئی لہٰذا میں نے پوچھا۔ ''کاروباری مقاصد سے آپ کا کیا مطلب ہے؟''

وہ ہنسنے لگا۔ ''اوہو' آپ غلط سمجھے۔ میں اس کے چال چلن کے بارے میں کوئی بات نہیں کر رہا تھا۔ غالباً آپ کو علم نہیں' یہ لڑکی ایک ایڈورٹائزنگ کمپنی میں کام کرتی ہے۔ وہاں اسے ماڈل بنا کر اشتہارات تیار کئے جاتے ہیں' یہی جو آپ نے لائف بوائے صابن اور ڈالڈا گھی کے دیکھے ہیں۔ اس بے چاری کو کبھی ماں' کبھی بیوی اور کبھی نوکرانی کے روپ میں پبلسٹی کی غرض س پیش کیا جاتا ہے۔'' اس کی بات سن کر میں چونک پڑا۔ یہ ماڈل کی بھی خوب رہی۔

محلے میں اس طرح لوگ طرح طرح کی قیاس آرائیاں کیا کرتے۔ لیکن عائشہ سب سے بے نیاز خاموشی سے ان کے سامنے سے گزر جاتی۔ اس آن بان سے کہ سب دیکھتے رہ جاتے۔ لیکن میں نے غور کیا کہ اس کے خلاف نت نئے اسکینڈل تیار کرنے والوں میں

ایوب سب سے پیش پیش تھا۔ بظاہر وہ بڑا ہنس مکھ اور زندہ دل آدمی معلوم ہوتا ہے۔ اچھا لباس پہنتا ہے۔ بہترین سگریٹ پیتا ہے اور عام طور پر ٹیکسی میں آتا جاتا ہے۔ حالانکہ وہ بھی محض ایک کلرک ہے لیکن لوگ کہتے ہیں کہ اس کے سسرال والے بڑے مالدار ہیں۔ اس کی بیوی وہیں رہتی ہے اور وہ خود کوارٹر میں تنہا رہتا ہے۔

صفدر خان نے جو مکانوں کی دلالی بھی کرتا ہے' اس سے کہا بھی کہ کوارٹر کا آدھا حصہ کرایہ پر اٹھا دو۔ مگر وہ قطعی راضی نہ ہوا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ کئی کئی روز اس کے کوارٹر میں تالا پڑا رہتا یا کبھی کبھار اس کا کوئی دوست وہاں آ کر ٹھہر جاتا۔ البتہ اسکی بیوی ہفتہ میں ایک آدھ بار وہاں ضرور آتی تھی۔ مگر وہ بھی رات بھر کے لیے۔ ویسے ایوب اچھا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ کبھی مل جاتا تو بڑی خندہ پیشانی سے پیش آتا۔ لیکن جہاں عائشہ کا ذکر آیا' ایوب نے اس کی مٹی پلید کر کے رکھ دی۔ بات بات پر وہ اسے آوارہ اور بدچلن کہتا ہے۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود نہ تو میں عائشہ کو خطرناک اور آوارہ سمجھ سکا۔ اور نہ ہی اس کے بے عیب اور بے داغ ہونے پر یقین آیا۔ اتنی بات ضرور ہے کہ وہ مجھے بھی کچھ عجیب و غریب لڑکی معلوم ہوئی۔

اس روز بھی کچھ ایسا اتفاق ہوا۔ میں گھر میں تنہا تھا کہ وہ آ گئی۔ آتے ہی اس نے پچاس روپے نکالے اور میری طرف بڑھا دیئے۔ میں نے روپے لے کر تکلفاً ایک آدھ جملہ ادا کیا اور غور سے اس کی جانب دیکھا۔ بظاہر وہ کسی طرح بھی عجیب و غریب نہیں معلوم ہوتی تھی۔ عام لڑکیوں کی طرح بات کرنے میں حجاب محسوس کر رہی تھی بلکہ تنہا ہونے کے خیال سے کچھ گھبرائی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ میں بات کرنے کے موڈ میں تھا لیکن اس نے ایسا موقع ہی نہیں دیا۔

"انگوٹھی واپس دیجیے گا؟"

میں چپ چاپ اٹھا اور انگوٹھی نکال کر اس کے حوالے کر دی۔ اس نے شکریہ ادا کیا اور فوراً واپس چلی گئی۔ میں نے غور کیا کہ اس روز ۲۱ تاریخ ہی تھی۔

انہی دنوں کا ذکر ہے۔ ایک روز جب دفتر سے لوٹا تو میں نے دیکھا کہ وہ میری بیوی سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ باتیں کچھ گھریلو پریشانیوں اور مہنگائی کے متعلق تھیں۔ میں نے اس سے یوں ہی پوچھ لیا۔

"یہ تو بتایئے' کیا آپ کسی دفتر میں ملازم ہیں؟"

وہ کچھ گھبرا سی گئی۔ پھر اس نے خفیف ہونے کے انداز میں کہا۔ "دفتر میں کام کرنے کے قابل ہوتی تو پھر بات ہی کیا تھی۔ ہمارے ابا نے ہمیں اتنی تعلیم ہی کب دلوائی۔ ان کا خیال تھا کہ لڑکیاں پڑھ لکھ کر آوارہ اور بے لگام ہو جاتی ہیں۔ مرتے دم تک ان کا

یہی خیال تھا۔"

وہ خاموش ہوگئی۔

دراصل میں جو بات پوچھنا چاہتا تھا وہ اب بھی نہ کہہ سکا تھا۔ آخر میں نے جھجکتے ہوئے دبی زبان سے اس کا بھی اظہار کردیا۔"تو آخر یہ آپ لوگوں کا خرچ کس طرح چلتا ہے؟"

اس دفعہ وہ مسکرا دی۔"آج میرے متعلق آپ اتنی بہت سی باتیں جاننے کے لیے اتنے پریشان کیوں ہیں ۔۔۔۔۔۔ خیریت تو ہے؟"

میں کچھ کھسیانہ سا ہوگیا۔"یوں ہی میرا خیال ہے اس میں کوئی بری بات تو نہیں۔"

وہ بتانے لگی۔"پہلے ہم لوگ جب یہاں آئے تھے تو ہمارے ایک ماموں تھے۔ وہ کچھ نہ کچھ مدد کردیا کرتے تھے۔ پھر انہوں نے بھی ہاتھ کھینچ لیا۔" وہ کچھ اداس ہوگئی۔"آج کل کے زمانہ میں کون کسی کی مدد کرتا ہے۔ آخر جب بہت برے دن آگئے تو اماں نے یہ کیا پاس پڑوس سے کچھ کپڑے لے آئیں۔ ہم سب بہنیں مل کر سی ڈالتیں۔ کچھ عرصہ تک اسی طرح کام چلتا رہا۔ اب میں نے یہ کیا ہے کہ کوٹھیوں اور بنگلوں میں جاکر خود سلائی کے آرڈر لے آتی ہوں۔ بہت سی گھریلو عورتیں درزیوں کو ناپ دیتے ہوئے شرماتی ہیں۔ اس لیے ہم کو اچھا خاصا کام مل جاتا ہے۔ مشینیں خریدنے کے لیے کچھ روپے ہوجائیں تو میں باقاعدہ درزی خانہ کھول لوں گی۔" اس نے بڑی سادگی سے ساری بات کہہ دی تھی جس پر شبہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

بات آئی گئی ہوگئی۔ عائشہ کی آمدورفت اسی طرح میرے گھر میں جاری رہی۔ لوگوں کی مخالفت کے باوجود میں نے اس سے ایک لفظ نہیں کہا۔ اس کے بعد محلے میں بہت سی تبدیلیاں ہوگئیں۔

فدا احمد کی شادی ہوگئی۔ وہ اب زیادہ تر گھر ہی میں رہتا۔ عائشہ کی حمایت میں لوگوں سے الجھنے کا اسے موقع ہی نہیں ملتا۔ آرٹسٹ قسم کا نوجوان انٹلکچوئل سے اچانک بیمہ کمپنی کا ایجنٹ بن گیا۔ نیاز صاحب کے متعلق لوگوں میں چرچے شروع ہوگئے تھے کہ انجمن نے جو فنڈ مہاجرین کے لیے اکٹھا کیا تھا' عرصہ سے اس کا کوئی حساب کتاب نہیں ملا۔ بلکہ یہاں تک کہ اس رقم سے انہوں نے اپنے منجھلے لڑکے کو جوتوں کی دکان کھلوادی تھی جسے اس نے کچھ ریس کورس میں اور کچھ بالاخانوں پر نچھاور کردیا۔

لیکن یہ ساری باتیں دبی زبان سے کہی جارہی تھیں۔ پھر ایک روز رات گئے محلہ بھر میں کھلبلی مچ گئی۔ پولیس نے صفدر خان کے گھر پر چھاپہ مار کر کچھ جواریوں کو گرفتار کرلیا تھا۔ صفدر خان پولیس کی حراست میں کھڑا اپنی بے گناہی کا یقین دلا رہا تھا۔

عائشہ کی جانب سے لوگوں کی توجہ ہٹ کر اب ان ہنگاموں پر لگ گئی تھی۔ ہر طرف انہی کا چرچا تھا۔عائشہ جو پہلے بڑے اہتمام سے نکلتی تھی' اب اس میں بھی بڑا فرق آ گیا تھا۔اب اس کی چال میں نہ پہلی سی آن بان تھی اور نہ چہرے پر آب وتاب۔جس سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ دکانوں پر کھڑے ہوئے لوگ اس کے متعلق جو گفتگو کیا کرتے تھے اس کا اسے پورا پورا احساس ہے۔لیکن اب وہ نکلتی تو کوئی نوٹس نہ لیتا۔اسے دیکھ کر مختصر سے بازار میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک کوئی کھلبلی نہ مچتی۔

اچانک وہ بالکل غائب ہوگئی۔لوگوں میں پھر اس کا چرچا شروع ہوگیا۔کوئی پندرہ بیس روز بعد وہ نظر آئی تو بہت کمزور معلوم ہو رہی تھی۔چہرے پر زردی تھی اور جسم مرجھایا ہوا لگتا تھا۔اب اس کے گھر میں ایک بچے کے رونے کی آواز بھی سنائی پڑتی تھی۔ایوب نے جو ہمیشہ اس کے خلاف کوئی نہ کوئی اسکینڈل کھڑا کیا کرتا تھا' بڑے دعوے سے کہا۔

''دیکھے میں نہ کہتا تھا کہ یہ سالی ایک نمبر حرافہ ہے۔ہسپتال میں حرام کا بچہ جننے گئی تھی۔اب تو اسے گود میں لے کر بھی نکلتی ہے۔''

یہ بات اس نے غلط بھی نہیں کہی تھی۔میں نے خود دیکھا کہ وہ ایک ننھے سے بچے کو گود میں لے کر غالباً ڈاکٹر کے یہاں جایا کرتی تھی۔ایک دفعہ پھر مجھے اپنی رائے تبدیل کرنا پڑی۔

کچھ عرصہ بعد کا ذکر ہے۔ایک رات اس کا چھوٹا بھائی آیا۔کہنے لگا۔''باجی نے بلایا ہے۔''میں نے طبیعت خراب ہونے کا بہانہ کر دیا۔

ذرا دیر بعد پھر آیا۔کہنے لگا کہ کھڑے کھڑے ایک بات سن کر چلے جایئے گا۔بادل نخواستہ مجھے جانا پڑا۔اس کے گھر میں جانے کا یہ میرا پہلا اتفاق تھا۔یہ مٹی کی بنی ہوئی دیواروں کا گھروندا تھا۔پرانے ٹین اور پھوس کی چھت تھی۔اندر جا کر میں نے دیکھا کہ آگے دالان تھا اور اس کے پیچھے ایک کوٹھری تھی۔مجھے دیکھتے ہی اس نے کہا۔

''آخر آپ آ ہی گئے۔''

میں نے جواب دیا۔''پہلے یہ بتایئے' خیریت تو ہے؟''

وہ کہنے لگی۔''آپ سے ذرا کام تھا۔بات بعد میں کروں گی۔آپ چائے پی لیجئے۔''

رات کے دس بجے چائے پینے کا کوئی موقع ومحل نہیں تھا۔میں سوچ ہی رہا تھا کہ کیا جواب دوں کہ وہ جھٹ سے بول پڑی۔''اچھا یہ بتایئے کہ آپ سگریٹ کون سی پیتے ہیں؟''پھر میرے جواب کا انتظار کئے بغیر اس نے اپنے بھائی سے کہا۔

''دیکھو جمیل! اماں سے پیسے لے کر سگریٹ لے آؤ۔کہنا' جو سب سے بڑھیا سگریٹ ہو وہی دینا۔''اس نے مڑ کر میری طرف

دیکھا۔"قینچی مارکہ سگریٹ ٹھیک رہے گی نا؟" اور پھر اس نے وہی سگریٹ لانے کی ہدایت کی۔

مجھے بڑھیا سگریٹ کے اس انتخاب پر کچھ ہنسی بھی معلوم ہوئی۔ مگر ضبط سے کام لیا۔ مبادا اس کی دل آزاری ہو۔ منع بھی کیا لیکن اس نے سگریٹ منگوا ہی لی۔

ذرا دیر بعد چائے آ گئی۔ اس کے ساتھ سستے قسم کے بسکٹ بھی تھے۔ میں پیٹ کا یونہی مریض ہوں۔ بسکٹ دیکھ کر روح فنا ہو گئی مگر اس نے اتنا اصرار کیا تو ان کو بھی برداشت کرنا پڑا۔ میں چائے پیتا رہا اور برابر سوچتا رہا کہ جاڑے کی اس سرد رات میں یہ "ٹی پارٹی" کس تقریب میں کی جا رہی ہے۔ اسی اثناء میں کوٹھری کے اندر سے بچے کے رونے کی آواز سنائی دی۔ وہ کہنے لگی۔

"اماں اسے دودھ پلا دیجئے۔ میں نے بوتل میں دودھ گرم کر کے بھر دیا ہے۔"

لیکن بچہ برابر روتا رہا۔ عائشہ کی ماں اسے چکارتی رہی۔ پھر بڑبڑانے لگی۔ "خواہ مخواہ کی میرے سر مصیبت ڈال دی ہے۔ کم بخت کسی طرح چپ ہی نہیں ہوتا۔"

وہ جھٹ سے بولی۔ "اے ہے اماں! اتنی سی معصوم جان کو ایسا نہ کہو۔"

وہ جل کر بولی۔ "تو پھر لو تم خود ہی سنبھالو۔ میرے بس کا روگ نہیں۔"

عائشہ نے جلدی سے کوٹھری میں جا کر اسے گود میں اٹھا لیا اور کندھے سے لگا کر دالان میں ٹہلنے لگی۔ میں نے چائے پی کر کہا۔

"اچھا اب بتائیے کیا بات ہے؟"

کہنے لگی۔ "ابھی بتاتی ہوں۔ ذرا یہ ننھا سو جائے۔"

وہ پھر چپ چاپ ٹہلنے لگی۔ میں خاموش بیٹھا قینچی مارکہ "بڑھیا سگریٹ" پیتا رہا۔ اسی دوران میں اس کے بھائی نے آ کر کہا۔

"باجی رکشا نہیں ملا بس اسٹینڈ پر بھی نہیں ہے۔"

وہ آہستہ سے بولی۔ "اچھا اب تم اپنے بستر پر جا کر لیٹ جاؤ۔" پھر مجھ سے کہنے لگی۔ "مجھے ایک جگہ جانا ہے۔ اگر آپ میرے ساتھ چل سکیں تو بڑی مہربانی ہو گی۔" اس نے بڑی عاجزی سے کہا۔

میں طرح طرح کی بدگمانیوں کے باوجود انکار نہ کر سکا۔ اس نے کوٹھری میں جا کر کمبل اوڑھا اور بچہ کو اس کے اندر دبکا کر بولی۔

"میرے ساتھ آئیے۔" میں چپ چاپ اس کے ساتھ ہو لیا۔

باہر کہر کا دھندلکا پھیلا تھا۔ سردی اب اور بڑھ گئی تھی۔ اس وقت گیارہ کا عمل ہو گا۔ محلے پر بالکل سناٹا چھایا تھا۔ کوارٹروں کے اندر

روشنیاں بجھ چکی تھیں۔ مجھے خوف معلوم ہو رہا تھا۔ طرح طرح کے وسوسے ستاتے تھے۔ پتہ نہیں وہ اس وقت کہاں جا رہی تھی۔ جب تک کوارٹروں کا سلسلہ جاری رہا' وہ مجھ سے دور دور چلتی رہی۔

سڑک پر پہنچ کر وہ میرے قریب آ گئی۔ مگر کوئی بات چیت نہ ہوئی۔ وہ بھی خاموش رہی اور میں نے بھی بات کرنے کی کوشش نہ کی۔

چلتے چلتے ہم دونوں گرجا گھر کی جانب جانے والی سڑک پر مڑ گئے۔ سڑک بالکل سنسان تھی اور اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ کچھ دور ہم سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے چلتے رہے۔ آخر گرجا گھر کا پھاٹک آ گیا۔ وہاں پہنچ کر وہ ٹھہر گئی۔ راستہ بھر اس نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ گرجا کے پھاٹک پر پہلی بار اس نے مجھ سے صرف اتنا کہا۔ ''آیئے اندر آیئے۔'' پھاٹک کھول کر وہ احاطہ میں داخل ہو گئی۔

میں اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

گرجا گھر کی عمارت تک جانے والے راستہ پر بجری بچھی ہوئی تھی جو ہمارے قدموں کی رگڑ سے آواز پیدا کر رہی تھی۔ ہر طرف ہو کا عالم طاری تھا۔ کہیں ذرا بھی آہٹ معلوم ہوتی تو کسی انجانے خوف سے دل زور زور سے دھڑکنے لگتا۔ ایسا محسوس ہوتا کہ ابھی اندھیرے سے نکل کر کوئی سامنے آ جائے گا۔

ہم دونوں سہمے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔

گرجا گھر کے صدر دروازے پر پہنچ کر اس نے مجھ سے کہا۔ ''آپ یہاں درختوں تلے ٹھہر جایئے۔ میں ابھی آتی ہوں۔'' میں نے غور کیا کہ اس کی آواز کپکپا رہی تھی۔

گرجا گھر کے بڑے ہال میں دھندلی دھندلی روشنی تھی جو دریچوں کے شیشوں سے چھن چھن کر کہر کے نیلگوں دھندلکے میں تحلیل ہوتی جا رہی تھی۔ گرجا کے سب دروازے بند تھے۔ صرف ایک کھلا تھا۔ وہ بچے کو کمبل میں لپیٹے ہوئے آگے بڑھی۔ دروازے میں داخل ہوئی اور ہال کے اندر چلی گئی۔

میں دم بخود کھڑا اسی جانب تک رہا تھا۔ ایک منٹ گزرا' دوسرا گزرا' تیسرا گزرا' میری سراسیمگی میں برابر اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اچانک گرجا گھر کا گھنٹا رات کے پر ہول سناٹے میں زور زور سے بجنے لگا۔ میں اور خوف زدہ ہو گیا۔ چاہا کہ بھاگ کھڑا ہوں۔ عین اس وقت عائشہ دروازے سے نکل کر جھپاک سے میرے پاس آ گئی۔ گھبراہٹ اور بدحواسی کے عالم میں وہ مجھ سے ٹکرا گئی۔ میں نے

اسے سنبھالا۔اس کا جسم بری طرح کانپ رہا تھا۔

اس نے تھرتھرائی ہوئی آواز میں کہا۔"آیئے چلیں۔" اور تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی چلنے لگی۔ میں بھی اسی رفتار سے چلنے لگا۔ پھاٹک کے قریب پہنچ کر میں نے سنا۔گرجا گھر کے اندر کسی ننھے بچے کے رونے کی آواز گونج رہی تھی۔

جب ہم دونوں پھاٹک سے گزر کر باہر سڑک پر آ گئے تو ذرا اوسان بجا ہوئے۔ میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔"کیا تم نے بچے کو وہیں چھوڑ دیا۔"

اس نے مختصر سا جواب دیا۔"ہاں"

تھوڑی دور تک ہم پھر خاموش چلتے رہے۔آخر جب گرجا گھر دور ہو گیا تو میں نے پھر دریافت کیا۔"تم نے اسے وہاں کیوں چھوڑ دیا؟"

وہ آہستہ سے بولی۔"اس کے علاوہ اور کرتی بھی کیا؟"

مجھے اس کا جواب سن کر جھنجھلاہٹ معلوم ہوئی۔"اس طرح ننھے سے بچے کو چھوڑتے ہوئے تم کو کچھ دکھ نہیں ہوا؟"

وہ چلتے چلتے رک گئی۔پھر اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔"مجھ کو سچ مچ بڑا دکھ ہے۔"

اندھیرے میں اسے دیکھ نہیں سکا۔میرا خیال ہے کہ وہ رو رہی تھی۔لیکن مجھے نہ تو اس پر ترس آیا اور نہ اب جھنجھلاہٹ معلوم ہو رہی تھی۔میں نے بے چین ہو کر اس سے پھر پوچھا۔

"آخر تم نے اپنے بچے کو اس طرح گرجا گھر میں کیوں ڈال دیا؟"

"میرا بچہ!" اس دفعہ اس کی آواز صاف تھی۔لہجے میں استعجاب بھی تھا۔

"تمہارا نہیں تو پھر کس کا بچہ تھا؟"

"اسی لیے تو میں نے اسے وہاں چھوڑ دیا۔" لمحہ بھر رک کر اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔"آپ میری بات کا یقین کریں اور اگر آپ یقین نہ بھی کریں تو کیا ہوتا ہے۔میں کس کس کو یقین دلاتی پھروں گی کہ وہ میرا بچہ نہیں تھا۔میری ناک میں گوشت بڑھ گیا تھا۔ اس کا آپریشن کرانے کے لیے ہسپتال میں داخل ہو گئی تھی۔وہیں ایک عورت کے بچہ ہوا تھا۔وہ بہت بیمار تھی۔آخر بے چاری مر گئی۔"

"اس کا کوئی عزیز و اقارب نہیں تھا۔" میں نے کرید کر پوچھا۔

"نہیں' کوئی نہیں تھا' بالکل لاوارث تھی۔میں نے کوشش کر کے کسی نہ کسی طرح بچے کو لے لیا تھا۔" اس نے بات کرتے کرتے

ایک بار پھر ٹھنڈی سانس بھری۔ ''آپ نے اسے دیکھا نہیں' بڑا خوبصورت بچہ تھا۔ ہائے! اب میں اسے کیسے دیکھ سکوں گی۔ کتنی محنت سے تو اسے حاصل کیا تھا۔ اور کس طرح چوروں کی طرح جا کر گرجا گھر میں ڈال کر بھاگی ہوں۔ مڑ کر دیکھا بھی نہیں۔''

میں چپ چاپ سنتا رہا اور وہ بڑے جذباتی انداز میں بولتی رہی۔ ''میں نے جب جھولے میں ڈالا تو اس میں پڑا ہوا وہ کیسا اچھا لگا۔ پھر میں نے گھنٹا بجانے کی رسی کو کھینچنے کے لیے پکڑا تو اللہ قسم ایک بار تو جی چاہا کہ رسی چھوڑ کر اسے اٹھا کر بھاگ آؤں۔ مگر پھر وہی مصیبت دھری تھی۔ خدا کرے یہ سب لوگ مر جائیں' جنھوں نے اسے مجھ سے جدا کرا دیا۔ مسلمان کا بچہ عیسائی بن جائے گا۔ اب ان کے دل میں ٹھنڈک پڑ جائے گی۔'' اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

مجھے معلوم نہیں کہ اس کی باتوں میں کتنی صداقت تھی۔ مگر اتنا ضرور ہے کہ اس وقت مجھے اس کی باتوں پر پورا پورا یقین آ گیا تھا۔ راستے بھر وہ سسکیاں بھرتی ہوئی میرے ساتھ ساتھ چلتی رہی۔ میں نے اس سے پھر کچھ نہیں پوچھا۔

اس رات مجھے دیر تک نیند نہیں آئی۔ یکا یک دروازے پر کسی نے دستک دی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا' دیکھا' سامنے منیر کھڑا تھا۔ میں نے گھبرا کر پوچھا۔ ''خیریت تو ہے؟''

وہ ہنسنے لگا۔ ''اماں' سب خیریت ہی ہے۔ یہ بتاؤ کہ تمہارے پاس کچھ سگریٹ وگریٹ تو نہیں ہوگی؟''

میں نے جل کر کہا۔ ''اتنی رات گئے تم اپنے گھر سے یہاں سگریٹ ہی مانگنے آئے تھے۔ کچھ تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔''

وہ کہنے لگا۔ ''گھر سے کہاں آ رہا ہوں۔ آج تو تمہارے قریب ہی ہوں۔''

میں نے پوچھا۔ ''وہ کیوں؟''

مسکرا کر بولا۔ ''کچھ ایسی ہی بات ہے۔ آج کچھ اپنا پروگرام ہے۔ پہلے سگریٹ نکالو۔ میرے پاس ختم ہو گئی ہے۔ پھر تم کو دکھاؤں گا کہ کیا فرسٹ کلاس لونڈیا ہے۔'' وہ اوباش طبع لوگوں کی طرح باتیں کر رہا تھا۔

میں نے کمرے میں جا کر سگریٹ کا پیکٹ اٹھایا اور لا کر اسے دے دیا۔ وہ چلتے چلتے کہنے لگا۔ ''جی چاہے تو چلے آنا' رات کو کچھ تمہارا بھی بھلا ہو جائے گا۔ یہیں ۵۳ نمبر کوارٹر میں۔''

میں چونک پڑا۔ یہ تو ایوب کا کوارٹر تھا۔ میں نے اسے روک کر جھجکتے ہوئے کہا۔ ''اس میں تو ایوب رہتا ہے۔''

وہ کہنے لگا۔ ''ہاں وہی رہتا ہے۔ کیوں اس میں تعجب کی کون سی بات ہے؟''

میں نے کہا۔ ''بھئی وہ تو بڑا بھلا آدمی ہے۔''

''بھلا آدمی ہے!'' وہ ہنسنے لگا۔ ''تم بھی بس یونہی رہے۔ اتنے عرصے سے یہاں رہتے ہو تم کو یہ بھی پتہ نہیں کہ وہ سالا کیا کام کرتا ہے۔ نوکری تو وہ صرف اس کوارٹر کے لیے کئے ہوئے ہے' پیسے تو زیادہ چارج کرتا ہے مگر ہوٹل سے زیادہ محفوظ جگہ ہے۔''

میں نے زیادہ پوچھنا مناسب نہ سمجھا اس لیے کہ اگر بیوی نے یہ باتیں سن لیں تو خواہ مخواہ بدمزگی پیدا ہو جانے کا ڈر تھا۔

کئی دن بعد کا ذکر ہے۔ یہ ہفتے کی شام تھی۔ میں نے سوچا کہ آج سیکنڈ شو سینما دیکھوں گا۔ اسی اثناء میں نیاز صاحب کا پیغام ملا کہ میں ان سے فوراً مل لوں۔ ان کے گھر گیا تو دیکھا کہ بہت سے لوگ اکٹھا ہیں۔ معلوم ہوا کہ انجمن کا کوئی ہنگامی اجلاس ہے۔ اس روز حاضرین کی تعداد معمول سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ یہ میں نے اس لیے کہا کہ اس سے قبل جب صفدر خان مجھے یہاں زبردستی کھینچ کر لایا تھا۔ تو اس روز بہت کم لوگ تھے۔

کچھ دیر بعد اجلاس کی کارروائی شروع ہوگئی۔ بات صرف اتنی تھی کہ ڈپٹی کمشنر کو ایک درخواست بھیجنے کی تجویز تھی جس میں یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ عائشہ ایک آوارہ قسم کی عورت ہے جس کی موجودگی سے محلے کے نوجوانوں کے اخلاق بگڑنے کا اندیشہ ہے۔ یہ شریف لوگوں کی بستی ہے۔ یہاں سے ایسی بدچلن اور بدکردار عورت کو فوراً نکالا جائے۔

ایوب نے تقریر کرنے کے سے انداز میں دیر تک اخلاق پر باتیں کیں۔ نیکی اور گناہ پر بحث کی اور آخر میں محلے میں عائشہ کی رہائش پر زبردست احتجاج کیا۔ اس کے بعد نیاز صاحب نے ایک ٹائپ شدہ درخواست نکالی جو پہلے ہی سے تیار رکھی تھی۔ سب سے اس پر دستخط کرنے کے لیے کہا گیا۔ میرا ارادہ تھا کہ میں وہاں سے کھسک جاؤں یا پھر دستخط کرنے سے انکار کردوں۔ لیکن میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ میں دبو اور کمزور طبیعت کا آدمی ہوں لہٰذا کچھ بھی نہ کر سکا اور چپ چاپ درخواست پر دستخط کر کے چلا آیا۔

سینما پہنچا تو معلوم ہوا کہ کھیل شروع ہو چکا تھا۔ کچھ دیر تک بازاروں میں ٹہلتا رہا اور جب واپس پہنچا تو میں نے دیکھا کہ مہاجرین کی جھگیوں کی سمت سے عورتوں کے زور زور سے رونے کی آواز آرہی تھی اور وہاں محلہ بھر جمع تھا۔ میں بھی وہاں پہنچ گیا۔ سب لوگ عائشہ کے گھر کے سامنے ہجوم کی صورت میں کھڑے تھے۔ اندر اس کی بہنیں رو رہی تھیں۔ بین کر رہی تھیں۔ بھائی سسکیاں بھر کر ماں کو گھر کے اندر کھینچ کر لے جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ نہ رو رہی تھی نہ چیخ رہی تھی۔ ایک ایک کا ہاتھ پکڑ کر کہہ رہی تھی۔

''ذرا ان لڑکیوں کو سمجھاؤ' بھلا میری بچی کہیں مرسکتی ہے؟''

''ارے مراد خان! کہیں عائشہ بھی مرسکتی ہے۔ وہ تو جمیل کے لیے جوتا لے کر ابھی آتی ہوگی۔''

''آخر تم لوگ یہاں کیوں کھڑے ہو؟ مجھے اس طرح گھور کیوں رہے ہو؟ ابھی عائشہ کو آنے دو۔ وہ تم سب کو ڈانٹ کر بھگا دے

گی۔میرے گھٹنوں کے درد کے لیے بازار سے انجکشن لینے گئی ہے۔ابھی آتی ہوگی۔بس ابھی۔"

وہ اسی طرح بہکی بہکی باتیں کررہی تھی۔اورلوگ سرگوشیاں کررہے تھے کہ بے چاری بڑھیا کا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ہجوم کے بیچ میں ایک کانسٹیبل کھڑا تھا جو ہسپتال سے یہ اطلاع لے کر آیا تھا کہ عائشہ ایک تیز رفتار موٹر سے زخمی ہوکر ہسپتال پہنچتے پہنچتے ختم ہو گئی۔

اس کے ہاتھ میں ایک تھیلا تھا۔جس کے اندر سے عائشہ کی دیوانی ماں نے ایک ایک چیز نکال کرزمین پر بکھرادی تھی۔اس میں جوتے کا ایک ڈبہ تھا'انجکشن تھے' کچھ کپڑا اور سلائی کا سامان تھا۔سب لوگ دم بخود تھے۔سارا محلہ تماشائیوں کی طرح وہاں اکٹھا تھا۔مجھ سے یہ تماشانہیں دیکھا گیا۔بے ساختہ میری آنکھیں بھرآئیں اور میں آنسو پونچھتا ہوا'وہاں سے سیدھا گھرآ گیا۔

◆◆◆

خلیفہ جی

آخری آدمی جو اس کی میز پر سے اٹھ کر گیا' وہ ساتواں دلال تھا۔ اب رات کے دس بجنے والے تھے۔ ایرانی ہوٹل کا ہنگامہ سرد پڑتا جا رہا تھا۔ ہال کے اندر بیٹھے ہوئے لوگ اٹھ اٹھ کر گھروں کو جانے لگے۔ میزیں رفتہ رفتہ خالی ہوتی جا رہی تھیں۔ لیکن محکمہ اطلاعات کا اپر ڈویژن کلرک عتیق اللہ خاموش بیٹھا ہوا سوچ رہا تھا کہ اب کیا کیا جائے؟ اس نے چائے کی پانچویں پیالی ختم کر کے دوسرے پیکٹ کا آخری سگریٹ سلگایا اور گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

ذرا ہی دیر بعد ایک شخص اس کی میز کے قریب آیا اور کرسی کھسکا کر بیٹھ گیا۔ عتیق اللہ نے اس کی جانب کوئی توجہ نہ دی۔ اسی طرح فکر مند بیٹھا رہا۔ نو وارد نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا اور جھک کر آہستہ سے کہا۔

''فسٹ کلاس فلیٹ ہے' لیں گا؟''

اس دفعہ عتیق اللہ نے اس کی جانب گہری نظروں سے دیکھا اور گردن ہلا کر اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔ وہ آدمی کہنے لگا۔

''دیکھو سیٹھ' ہم کوئی فھرا نہیں ڈالتا' جو بات ہے صاف صاف ہے۔ دو کمرے ایک بڑا ہے' ایک جرا چھوٹا۔ وشٹ اوپن۔ پگڑی صرف دو ہجار' پچاس روپیہ دلالی کا۔ ابھی چل کر دیکھ سکتے ہو۔ کراچی کے اندر اتنا سستا فلیٹ نہیں ملیں گا سیٹھ۔'' وہ خالص دلالوں کے لہجے میں اپنی بات کہتا رہا۔ عتیق اللہ گم صم بیٹھا' دل ہی دل میں ایک بار پھر جیب کے اندر پڑے ہوئے روپوں کو گننے لگا۔ اب تو ۲۲۰ سے بھی کم رقم رہ گئی تھی۔

اسے خاموش دیکھ کر دلال نے پوچھا۔ بولو سیٹھ کیا کہتے ہو؟'' عتیق اللہ نے تھکے ہوئے انداز میں جواب دیا۔ ''نہیں بھئی' اتنی پگڑی کا فلیٹ ہم نہیں لے سکتے۔''

دلال نے گاہک پھنسانے کی ایک آخری کوشش کی۔ ''آخر تم کتنے کا فلیٹ لیں گا؟''

عتیق اللہ نے جھنجھلا کر کہا۔ ''تم پگڑی کی بات کرتے ہو' یہاں اس کی گنجائش نہیں' پھر بات کیسے ہو؟''

دلال نے مزید بات نہیں کی۔ کچھ دیر دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ پھر وہ بغیر کچھ کہنے سنے اٹھا اور ایک طرف چلا گیا۔ لیکن اس کے جاتے ہی قریب کی میز پر بیٹھا ہوا ایک اور شخص اٹھ کر اس کے پاس آ گیا۔ اس نے بغیر کسی تمہید کے پوچھا۔

"مکان چاہیے ہے؟"

عتیق اللہ نے اس دفعہ بھی رضامندی کا اظہار کر دیا۔ "ہاں چاہیے تو ہے؟"

وہ بے تکلفی سے بولا "بہت پریشان معلوم ہوتے ہو۔"

عتیق اللہ اس کی بات صاف نظر انداز کر گیا۔ کاروبار میں وہ ہمدردی کا قائل نہ تھا۔ کہنے لگا۔ "چائے پیو گے؟" اس نے جواب دیا۔ "نہیں! ابھی چائے پی ہے۔"

"تو پھر سگریٹ پیو" اس شخص نے انگلیوں کے درمیان سلگتی ہوئی سگریٹ سامنے کر دی۔

عتیق اللہ اس عرصے میں کاروباری ڈھنگ سے بات کرنے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ کہنے لگا۔ "پگڑی کے ہزار ہوگی؟"

وہ بگڑ کر بولا "اگر پگڑی کی بات کرنا ہے تو دلال سے بات کرو۔"

عتیق اللہ اس کے جواب پر چونک پڑا۔ پہلی بار اس نے غور سے اجنبی کو دیکھا۔ سر پر لمبے لمبے بال' چہرے پر گھنی مونچھیں۔ دھاری دار میلی سی ریشمی قمیض اور خوب گھیر دار لٹھے کی شلوار۔ وضع قطع سے وہ بڑا طرح دار غنڈہ معلوم ہوتا تھا۔ عمر بھی کچھ زیادہ نہیں تھی۔ پچیس چھبیس سے زیادہ نہ ہوگی۔

عتیق اللہ نے دریافت کیا۔ "کیا کرتے ہو تم؟"

وہ اسی بانکپن کے ساتھ تیوری پر بل ڈال کر بولا۔

"تم کو مکان چاہیے یا کچھ اور؟" عتیق اللہ بہت ٹپٹایا' کہنے لگا۔ "اس میں بگڑنے کی کون سی بات ہے۔ میں نے تو یونہی پوچھ لیا۔"

مگر اس آدمی کے انداز میں فرق نہ آیا۔ "تو پھر کام کی بات کرو۔"

محکمہ اطلاعات کے کلرک نے اس دفعہ ہتھیار ڈال دیے۔ "اچھا یوں ہی سہی' مگر یہ تو بتاؤ کہ مکان کیسا ہے' کہاں ہے' کس طرح ملے گا؟"

"یہ باتیں تم بعد میں بھی پوچھ سکتے ہو۔ پہلے تم میرے ساتھ چلو۔"

عتیق اللہ کے پاس اب کوئی عذر پیش کرنے کی گنجائش نہ تھی۔ وہ چپ چاپ اٹھا۔ کاؤنٹر پر جا کر پے منٹ کیا اور غنڈوں کی سی وضع قطع کے اسی آدمی کے ساتھ رکشا میں سوار ہو کر چل دیا۔

مختلف سڑکوں کا چکر کاٹنے کے بعد رکشا سولجر بازار میں ایک مکان کے سامنے جا کر ٹھہرا۔ عتیق اللہ نے رکشا کا کرایہ دینا چاہا تو اس نے روک دیا اور اصرار کر کے خود ہی کرایہ بھی ادا کیا۔ آگے بڑھ کر مکان کا دروازہ کھولا اور عتیق اللہ سے کہنے لگا۔ ''اندر آ جاؤ''

وہ خاموشی سے مکان میں داخل ہو گیا۔

مکان کے اندر گھپ اندھیرا تھا۔ نہ کوئی آہٹ تھی نہ آواز۔ شہر کے اس قدر بارونق علاقہ میں واقع ہونے کے باوجود یہ مکان بالکل ویران معلوم ہو رہا تھا۔ ایک لمبی سی تاریک راہداری عبور کر کے دونوں جب ایک کمرے کے سامنے پہنچے تو وہ شخص بڑبڑانے لگا۔ ''معلوم ہوتا ہے ابھی تک کوئی نہیں آیا۔'' اس نے کمرے کا دروازہ کھولا اور ماچس جلا کر دیوار کے قریب رکھے ہوئے لیمپ کو روشن کر دیا۔ عتیق اللہ دہلیز پر پہنچ کر ٹھٹکا۔ اس ویران مکان میں آ کر وہ کچھ خوف زدہ ہو گیا تھا۔

اس شخص نے اونچی آواز سے اسے مخاطب کیا۔ ''یار! وہاں کیوں کھڑے ہو؟''

عتیق اللہ سہما سا کمرہ میں داخل ہو گیا۔ اس نے دیکھا' کمرہ بڑا گندہ تھا۔ فرش پر میلی سی دری بچھی تھی جس پر جا بجا سگریٹ اور بیڑیوں کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ دیواروں پر جگہ جگہ پان کی گلکاریاں تھیں۔ کہیں پنسل سے فلمی گیتوں کے بول لکھے ہوئے تھے' کہیں مختلف قسم کی بھونڈی شکلیں بنی تھیں۔

عتیق اللہ خاموشی سے فرش پر جا کر بیٹھ گیا۔ اس شخص نے کوئی بات نہیں کی۔ دری کا کونا پلٹ کر نیچے سے ایک رجسٹر اٹھایا' قمیض کی جیب میں لگا ہوا قلم نکال اور رجسٹر کے ورق الٹ پلٹ کر ان پر کچھ لکھنے لگا۔

لیمپ کی روشنی میں بیٹھا ہوا اجنبی' جو وضع قطع سے صاف غنڈہ معلوم ہوتا تھا' اس پراسرار مکان کی ویرانی میں عتیق اللہ کو اور بھی زیادہ خطرناک نظر آنے لگا۔ آدھ گھنٹہ گزر گیا مگر کوئی نہ آیا۔ اور نہ اس شخص نے اس دوران میں اس سے کوئی بات کی۔ وہ بڑی محویت کے ساتھ رجسٹر دیکھتا رہا۔

عتیق اللہ کی بے چینی برابر بڑھتی جا رہی تھی۔ آخر وہ اکتا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس شخص نے اس دفعہ گردن اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

''کہاں چلے؟''

''اب تو رات بہت ہو گئی' کل آ جاؤں گا۔''

عتیق اللہ نے چاہا کہ وہاں سے کھسک جائے مگر اس شخص نے جانے نہ دیا۔ تیکھی نظروں سے گھور کر دیکھا۔ پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھاتے ہوئے بے تکلفی سے بولا۔ ''یار تم بھی نہ جانے کیسے آدمی ہو' ذرا دیر اور ٹھہر جاؤ۔ خلیفہ جی اب آتے ہی ہوں گے۔'' مجبوراً اسے

بیٹھنا پڑا۔

وہ شخص عتیق اللہ سے بے نیاز ہو کر پھر رجسٹر دیکھنے میں مشغول ہو گیا۔ رات اب گہری ہوتی جا رہی تھی۔ سناٹا بڑھ گیا تھا۔ باہر سڑک پر آمد و رفت کم ہو چکی تھی۔ آخر گیارہ بجے کے قریب راہداری میں قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ کوئی سنبھل سنبھل کر چل رہا تھا۔ چاپ رفتہ رفتہ قریب آتی جا رہی تھی۔ پھر کوئی زور سے کھنکارا۔ عتیق اللہ نے مڑ کر دیکھا۔ ادھیڑ عمر کا ایک شخص کمرے کے دروازے پر نمودار ہوا۔ لیکن عتیق اللہ کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ وہ پستہ قد' گٹھے ہوئے جسم اور گھنی مونچھوں کے ساتھ بڑا خوفناک نظر آ رہا تھا۔

رجسٹر پر جھکے ہوئے آدمی نے اس کی طرف دیکھا اور فوراً اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ''خلیفہ جی! اندر آ جاؤ' یہ اپنے ہی آدمی ہیں۔''

وہ اندر آ کر اطمینان سے بولا۔ ''پہلے تو کبھی دیکھا نہیں۔'' اتنا کہہ کر وہ تھکا ہوا سا دیوار سے ٹیک لگا کر دری پر بیٹھ گیا۔ ''آج تو ان سالوں نے اپنی ذلیل کرا دی۔''

کمرے میں کچھ دیر تک خاموشی رہی پھر خلیفہ جی نے کہا۔ ''ابے بختیار! یہ لنڈے ابھی تک کیوں نہیں آئے؟ نہ جانے سالے کہاں جا کر مر گئے۔ کسی حرام کے تخم کا پتہ نہیں۔''

بختیار نے رسان سے کہا۔ ''آتے ہی ہوں گے خلیفہ جی''

اس دفعہ خلیفہ جی نے عتیق اللہ کو مخاطب کیا۔ ''کیوں جی یہ بختیار تمہارا کوئی رشتے دار و شتے دار لگے ہے؟''

عتیق اللہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ بختیار بیچ میں بول اٹھا۔ ''نہیں خلیفہ جی' ان سے تو آج ہی ملاقات ہوئی ہے۔''

خلیفہ نے مشتبہ نظروں سے عتیق اللہ کو دیکھا۔ بختیار فوراً اس کی نظروں کے بدلے ہوئے انداز کو بھانپ گیا۔ کہنے لگا۔ ''خلیفہ جی یہ رہنے کو مکان چاہتے ہیں۔ بیچارے بہت پریشان تھے۔ دلالوں کے چکر میں پڑ گئے تھے۔ میں کوئی ہفتہ بھر سے ان کو دیکھ رہا تھا۔ جب دیکھو کوئی نہ کوئی دلال ساتھ ہے۔ چائے چل رہی ہے۔ سوڈا لیمن آ رہا ہے۔ سگریٹ سلگ رہے ہیں۔ سیٹھ سیٹھ کہہ کے سالوں نے اچھے خاصے پیسے کٹوا دیئے اور کام ذرا بھی کر کے نہ دیا۔''

خلیفہ جی نے بختیار کی باتیں سن کر عتیق اللہ سے ہمدردی کا اظہار کیا۔

''ارے میاں! تم کہاں ان دلالوں کے پھیر میں پڑ گئے۔ یہ تو سالے حجامت کر کے رکھ دیتے ہیں۔'' پھر وہ بختیار کی جانب متوجہ ہوا۔ ''اچھا کیا کہ ان کو یہاں لے آیا۔ اپنے پاس دو تین کمرے بیکار ہی پڑے ہیں۔ کسی کا بھلا ہو جائے۔ اپنا کیا جاتا ہے۔''

بختیار جھٹ سے بولا ''یہی تو میں نے بھی سوچا۔ پھر ایک بار خلیفہ جی تم نے کہا بھی تھا۔''

خلیفہ نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ "ہاں جی یاد آیا' مکان کا اس طرح آج کل کے زمانہ میں خالی رہنا ٹھیک نہیں۔"

خلیفہ جی نے کرتے کی جیب سے بیڑی کا بنڈل نکال کر ایک بیڑی سلگائی اور بنڈل عتیق اللہ کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے نرم لہجے میں کہا۔ "میں نے آج بہت سگریٹ پی ڈالی۔ اس وقت بالکل جی نہیں چاہ رہا ہے۔" خلیفہ نے مزید اصرار نہیں کیا۔ بیڑی کا بنڈل اور ماچس سامنے دری پر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ ایک پیر اٹھا کر دوسرے پر رکھ لیا۔ اور سر جھکا کر کچھ سوچنے لگا۔ تھوڑی دیر تک وہ اسی طرح بیٹھا سوچتا رہا۔ پھر شلوار کے نیفے کو ٹٹولتے ہوئے بڑبڑانے لگا۔ "اس سالے نے تو کمر میں گھاؤ ڈال دیا۔" اس نے نیفے میں اڑسا ہوا لمبا سا چاقو نکالا اور دری کے نیچے رکھتے ہوئے بولا۔

"ہاں جی تم کو مکان چاہیے ہے۔"

عتیق اللہ پہلے ہی سہما ہوا تھا۔ چاقو دیکھ کر اور بھی خوفزدہ ہو گیا۔ جی چاہا کہ ہاتھ جوڑ کر انکار کر دے۔ نہیں بابا! میں تمہارے مکان سے باز آیا۔ مگر اب اس کا موقع نہیں تھا۔ دبی زبان سے بولا "مکان کے لیے تو مدت سے سرگرداں ہوں۔ دلال ہزاروں کی پگڑی مانگتے ہیں۔ اپنے پاس اتنی رقم نہیں۔"

خلیفہ جی ایک دم سنبھل کر بیٹھ گیا۔ "اجی ان کی ایسی کی تیسی۔ تم ابھی جا کر اپنا سامان لے آؤ۔ اور یہ آگے کے دو کمرے لے لو۔" خلیفہ جی نے اپنی بات ختم ہی کی تھی کہ اسی اثنا میں دو نوعمر لڑکے ہنستے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔

"سلام خلیفہ جی"

"سلام خلیفہ جی"

وہ خلیفہ جی کے سامنے ادب سے سر جھکا کر بیٹھ گئے۔ وہ بڑے رعب دار لہجے میں بولا۔ "کیوں بے! کہاں سے آ رہے ہو بڑی باچھیں کھلی ہوئی ہیں۔ کچھ کام وام بھی کیا یا یوں ہی بے فضول مستی دکھا رہے ہو۔ لاؤ' کیا لائے؟" دونوں نے جیبیں ٹٹولیں اور نوٹ اور ریزگاری نکال نکال کر خلیفہ جی کے سامنے ڈالنے لگے۔

وہ ان کو اٹھا کر گنتے ہوئے کہنے لگا۔ "ابے یہ تو پورے پچیس بھی نہیں۔"

ان میں سے ایک بولا "آج تو اپنا اڈہ بالکل خالی تھا۔"

خلیفہ جی بگڑ کر بولا۔ "سالو تم ڈیوٹی پر تھے ہی کب؟ میں ابھی چکر لگا کر آ رہا ہوں۔ ملی اور کلوا تو دکھے تھے' باقی کسی حرام خور کا پتہ نہیں تھا۔ ہزار دفعہ کہا کہ بس اسٹینڈ پر دفتروں کی چھٹی کے وقت کے علاوہ ۸ سے ۹ بجے رات تک بھی کام ہوتا ہے۔ پر تمہارے تو

دھیان کہیں اور ہی ہوتے ہیں۔" وہ آنکھیں نکال کر ذرا دیر تک دنوں کو ڈانٹتا رہا۔

اسی اثنا میں دروازے پر ایک لڑکا اور نمودار ہوا۔ سانولی رنگت' بدن پر صرف بنیان اور گندہ نکر' بال ایکٹروں کی طرح الجھے ہوئے' ہونٹوں پر پان کی دھڑی' وہ سگریٹ کا کش لگاتا ہوا آگے بڑھا۔ مگر خلیفہ جی پر نظر پڑتے ہی اس کی سٹی گم ہوگی۔ سہا ہوا سا دور کونے میں جا کر بیٹھ گیا۔

خلیفہ جی نے ڈپٹ کر کہا۔ "ابے منہ چھپا کر کیوں بیٹھ رہا ہے۔ سالے ادھر سامنے تو آ۔ آج بھی کوئی بہانہ بتا کرنے کا ارادہ ہے؟"

وہ کھسک کر روشنی میں آ گیا اور اس طرح بولنے لگا جیسے منمنا رہا ہو۔ "نہیں خلیفہ جی! قسم لے لو جو آج کچھ کام کیا ہو۔ ایک موقع لگا تھا مگر ہاتھ خالی گیا۔ سالا خواہ مخواہ فیل مچانے لگا۔"

خلیفہ جی نے یقین نہ ماننے کے سے انداز میں کہا۔ "ابے تو کیا بھوریا واں نہیں تھا؟"

اتنے میں بھوریا بھی آ گیا۔ خلیفہ جی نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔ "کیوں بے! یہ امامی ٹھیک کے رہا ہے؟"

وہ بگڑ کر بولا "خلیفہ جی' یہ صفا جھوٹ بول رہا ہے۔ یہ تو سالا ایکٹر ہے ایکٹر۔ جب اس نے کام کیا تو میں جھٹ اس کے پاس پہنچ گیا تھا۔ مگر اس نے تو میری طرف دیکھا ہی نہیں۔ میں نے اشارہ بھی کیا کہ رقم ادھر کھسکا دے۔ لیکن یہ فوراً نو دو گیارہ ہو گیا۔"

خلیفہ جی کہنے لگا۔ "اور یہ تو کے رہا تھا کہ ہاتھ خالی گیا۔"

بھوریے نے اس کی طرف گھور کر دیکھا۔ "لو اور سنو' میں نے خود اس کے ہاتھ میں بٹوہ دیکھا تھا۔ خلیفہ جی یہ سالا اپنے اس حرامی پن سے ایک دن سب کو پھنسوائے گا۔"

خلیفہ کا چہرہ غصہ سے سرخ پڑ گیا۔ غضب ناک ہو کر گرجا۔ کیوں بے حرامی! اب یہ بلف چالیں تو ہم سے چلے گا۔ ادھر آ آدم خور' تیری تو ۔۔۔۔۔۔۔! " خلیفہ نے ایک موٹی سی گالی دی۔

امامی گڑگڑانے لگا۔ "خلیفہ جی! یہ بے فضول الزام لگا رہا ہے۔ باپ قسم! میں نے ایک لفظ جھوٹ نہیں کہا۔

خلیفہ جی نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ بختیار سے مخاطب ہوا۔ "ابے بختیار! اس حرام کے تخم کے لگا دو ٹھڈ۔ سالا اپنے فلاشمین کرنے لگا ہے۔"

بختیار نے جھپٹ کر ایک ہی ٹھڈ لگایا تھا کہ امامی چیں بول گیا۔ "ارے مر گیا خلیفہ جی' ابھی بتاتا ہوں۔" وہ فرش پر اوندھے منہ گر

پڑا۔

بختیار کو دوسرا ٹھڈا لگانے کی ضرورت نہ پڑی۔ امامی سسکیاں بھر کر کہنے لگا۔ ''خلیفہ جی! سچ کہہ رہا ہوں۔ گیارہ روپے ملے تھے۔ دس اس سالی بانو نے رکھ لیے۔ میں نے بہت کہا پر وہ باز نہ آئی' کہنے لگی۔ جانہیں دیتے۔ کہہ دینا خلیفہ جی سے کہ بانو نے رکھ لیے ہیں۔ ایک روپیہ بچا تھا اس میں سے ۱۳ آنے یہ رہے۔'' اس نے اپنی جیب سے کچھ ریزگاری نکال کر سامنے ڈال دی۔

خلیفہ جی نے خونخوار نظروں سے اسے دیکھا۔ ''تو یوں کہہ کہ سالے تو پھر اس نکٹی کے پاس گیا تھا۔ اب وہ تیری ماں سے بھی بڑی ہوگی۔ سالے اس کے چکر میں پڑ گیا تو کھونٹی پر لٹکانے کے قابل بنا دے گی۔ لاکھ دفعہ کہا کہ تو نکھیائی کے پاس مت جایا کر' پر تجھے تو سالے جوانی چڑھ رہی ہے جوانی۔ لگواؤں ابھی دو ٹھڈا اور۔''

امامی بھوں بھوں کر کے رونے لگا۔ ''مر جاؤں گا خلیفہ جی! میری توبہ' جواب کبھی اس حرام زادی کے پاس جاؤں۔'' خلیفہ جی اس کو بری طرح گالیاں دینے لگا۔

اس عرصہ میں اور بھی جیب کترے آ گئے تھے۔ ان میں ادھیڑ عمر کے گھاگ جیب کترے بھی تھے۔ مضبوط پٹھوں والے نوجوان بھی تھے اور دبلے پتلے' پھرتیلے' کم سن لڑکے بھی تھے۔ کمرے کے اندر اب خاصی چہل پہل ہو گئی تھی۔ ہنسی مذاق ہو رہا تھا۔ باتیں ہو رہی تھیں۔ ایک دوسرے پر آوازے کسے جا رہے تھے۔ جنہوں نے لمبا ہاتھ مارا تھا' وہ بڑھ چڑھ کر باتیں بنا رہے تھے۔ جو خالی ہاتھ لوٹے تھے' وہ جھینپے سے بیٹھے تھے۔

خلیفہ جی ہر اک سے باری باری رقم وصول کرتا جا رہا تھا۔ بختیار اسے رجسٹر میں درج کر رہا تھا۔ خلیفہ جی کسی کو شاباش دیتا' کسی کو گالیاں دیتا۔ کسی کو صرف سمجھا بجھا دیتا۔ عتیق اللہ کو یہ ساری باتیں بڑی تعجب خیز معلوم ہوئیں۔ کچھ تو اس لیے کہ یہ سب کچھ اس کے لیے بالکل نیا تھا اور کچھ اس لیے کہ جو بھی آتا اسے کسی قدر حیرت سے دیکھتا۔ اس کی نئی بشرٹ اور ریڈی میڈ کارڈرائے کی پتلون کا جائزہ لیتا۔ پھر آپس میں اس کے متعلق کانا پھوسی ہوتی۔ اس وقت اسے سخت جھنجھلاہٹ ہوتی کہ خواہ مخواہ یہ سب اسے بھی جیب کترا سمجھ رہے ہیں۔

جب ساری رقم اکٹھا ہو گئی تو خلیفہ جی نے اس میں سے ۲۵ فیصدی علیحدہ کر کے بقیہ روپے تمام جیب کتروں میں تقسیم کر دیئے۔ لیکن ان میں بھی درجہ بندی اور حفظ مراتب تھا۔

درجہ اول: ۲۵ فیصدی

درجہ دوم: ۱۵ فیصدی

درجہ سوم: ۱۰ فیصدی

سب کو خرچ دینے کے بعد اس نے ایک لڑکے کو آواز دی۔ "ابے فیاض! ملاباری سے گیارہ سنگل چائے کے لیے تو جا کر کہیو اور ہاں ایک پیکٹ کیپسٹن سگریٹ کا بھی کہہ دیجو۔"

ذرا ہی دیر بعد باہر چائے والا چائے لے کر آ گیا۔

جب چائے کے دور سے فراغت ہو گئی تو خلیفہ جی عتیق اللہ کی طرف متوجہ ہوا۔ "ہاں جی تو اب تمہارا کام ہو جانا چاہیے۔ بھئی معاف کرنا' ان سے نہ نبٹتا تو یہ سب جان کھا جاتے۔ چلو میں تم کو کمرے دکھادوں۔"

اس نے اٹھ کر لیمپ ہاتھ میں لیا اور دونوں طویل راہداری سے گزر کر ایک کمرے کے سامنے پہنچ گئے۔ یہ کمرہ مکان کے باہری رخ پر تھا۔ عتیق اللہ نے دیکھا' کمرہ خاصا کشادہ اور صاف ستھرا تھا۔ دوسرا کمرہ بھی ویسا ہی تھا۔ دونوں کمرے پختہ بھی تھے اور ہوادار بھی۔

خلیفہ جی کہنے لگے۔ "کمرے تم نے دیکھ لیے' اب اپنا سیتا کرلو۔ میری مانو تو ان کمروں میں تمہاری مزے سے گزر بسر ہو سکتی ہے۔"

عتیق اللہ نے جواب دیا۔ "خلیفہ جی' کمرے تو بہت اچھے ہیں اور میرے گزارے کے لیے کافی ہیں۔" اس نے قدرے تامل کے بعد دبی زبان سے کہا۔ "کرایہ اس کا کتنا ہوگا؟"

خلیفہ جی ہنسنے لگے۔ "اماں' تم بھی کیا بات کر رہے ہو' کرایہ اس کا کیا ہوگا۔"

مگر عتیق اللہ نہ مانا۔ اصرار کر کے بولا "پھر بھی کچھ نہ کچھ تو کرایہ دینا ہی ہوگا۔"

خلیفہ جی بدستور ہنستا رہا۔ "اچھا جی یوں کرو کہ ہر مہینہ کی پہلی تاریخ کو تم چائے پانی کر دیا کرو۔ بس یہی دس پانچ روپے لگا کر۔ اس طرح یہ لمڈے بھی خوش ہو جائیں گے اور تم کو بھی اطمینان ہو جائے گا کہ پھوکٹ میں نہیں رہتے۔"

وہ اس بات پر رضامند ہو گیا۔ "خلیفہ جی جیسی آپ کی مرضی۔"

اس کے بعد خلیفہ جی نے مکان کے سلسلہ میں اپنی کچھ شرطیں بھی بتائیں۔ بڑے مشفقانہ لہجے میں بولا۔ "دیکھو جی اپنے کسی ملنے جلنے کو کبھی رات کے وقت یہاں نہ بلانا۔ دوسری بات یہ کہ مکان کا دروازہ کسی وقت بند نہیں رکھنا۔ تم اپنے کمروں میں تالا ڈال سکتے

ہو۔اس کے علاوہ کسی کے بہکائے سکھائے میں آ کر مکان کو الاٹ کرانے کی کوشش نہ کرنا۔ورنہ اس کا نتیجہ بہت برا نکلے گا۔تم ہمارے یار ہو جب تک جی چاہے رہو۔"

عتیق اللہ نے ساری شرطیں بلا حیل و حجت منظور کرلیں۔

جب ساری باتیں طے ہو گئیں تو خلیفہ جی نے مشورہ دیا۔"میرا کہا مانو تو ابھی جا کر اپنا سامان لے آ ؤ۔" عتیق اللہ بھی یہی چاہتا تھا۔خلیفہ جی نے فوراً اپنے دو شاگردوں کو بلایا اور عتیق اللہ کے ساتھ کر دیا۔اسی رات وہ سامان اٹھوا کر اس مکان میں آ گیا۔

اس قدر آسانی سے مکان مل جانے پر عتیق اللہ کو خوشی بھی ہوئی اور خوف بھی دامن گیر تھا۔پولیس کا خوف' بدنامی کا خوف اور سب سے بڑا یہ کوف کہ کہیں وہ بھی ان کے ساتھ رہ کر جرائم پیشہ نہ بن جائے۔لہٰذا شروع شروع میں تو وہ بہت پریشان رہا اور دوسرا مکان حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔مگر نہ تو اسے کوئی اور مکان ہی مل سکا اور نہ اس کی تنخواہ میں اتنی گنجائش تھی کہ کسی ہوٹل میں رہائش اختیار کر سکے۔لیکن پریشانی کا یہ دور زیادہ مدت تک نہ چل سکا۔رفتہ رفتہ وہ اس ماحول سے مانوس ہوتا جا رہا تھا۔تمام جیب کترے اسے عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔راہ میں کہیں مل جاتے تو بڑے تپاک سے سلام کرتے۔چائے پینے کے لیے اصرار کرتے۔بڑی مشکل سے وہ ان سے پیچھا چھڑاتا۔لیکن وہ سگریٹ پلائے بغیر تو اسے جانے ہی نہ دیتے۔

خلیفہ جی کا رویہ بھی بہت دوستانہ تھا۔وہ ہفتہ میں دو چار بار ضرور اس کے پاس آتا بڑے گھریلو انداز میں باتیں کرتا۔عام طور پر یہ ملاقاتیں شام کو ہوتی تھیں۔مگر بڑی مختصر۔اس لیے کہ کوئی نہ کوئی جیب کترا اس عرصہ میں آ جاتا۔اسے دیکھتے ہی خلیفہ جی اٹھ کر کھڑا ہو جاتا۔اس موقعہ پر وہ ہمیشہ کہا کرتا۔"اچھا عتیق بھائی' زندگی رہی تو کل پھر ملیں گے۔اب اپنے دفتر کا ٹیم ہو گیا۔" اس دفتر والی بات پر عتیق کو بڑی ہنسی آتی۔اس کے علاوہ خلیفہ جی کی اپنی اور بھی ایسی ہی مخصوص اصطلاحات تھیں۔وہ اس مکان کو ہیڈ کوارٹر' ۱۰ بجے رات کے وقت کو دفتر کا ٹیم' سب کے مل بیٹھنے کو میٹنگ اور جیب کتروں کو کاریگر کہا کرتا۔خلیفہ جی کی کچھ خفیہ اصطلاحات بھی تھیں جن کو خاص خاص موقعوں پر استعمال کرتا تھا۔

جب کوئی نیا جیب کترا ان کی ٹولی میں شامل ہوتا تو اس روز خاص طور پر جشن منایا جاتا۔پانچ سیر مٹھائی' ہار پھول' سگریٹ اور چائے کا بندوبست کیا جاتا۔اس روز سارے جیب کترے سر شام ہی اڈے پر لوٹ آتے اور جب سب اکٹھا ہو جاتے تو خلیفہ جی باقاعدہ وضو کرتا۔اگر بتی سلگاتا اور نیاز دے کر مٹھائی کا ایک ٹکڑا گروہ کے نو وارد ممبر کو اپنے ہاتھ سے کھلاتا اور اپنے سر پر سے ٹوپی اتار کر ذرا دیر کے لیے اسے پہنا دیتا۔اس کے بعد نیا جیب کترا سب سے بغل گیر ہوتا۔اسے ہار پھول پہنائے جاتے۔شیرینی تقسیم ہوتی

اور پھر ہنسی مذاق اور قہقہے شروع ہو جاتے۔

ایسی ہر تقریب میں شرکت کے لیے عتیق اللہ کو اصرار کر کے بلایا جاتا۔ لیکن عتیق اللہ کو اس روز بڑا لطف آتا جب خلیفہ جی سب کی نئے سرے سے ڈیوٹیاں مقرر کرتا تھا۔ یہ تبدیلی ہر پندرہ روز کے بعد ہوتی تھی۔ خلیفہ جی کسی کو اس سے زیادہ مدت تک ایک جگہ نہیں رکھتا تھا۔ لہٰذا کسی کو ریلوے اسٹیشن پر' کسی کو بنک پر' کسی کو ہوائی اڈے پر تعینات کیا جاتا۔ اس میں زیادہ تر سینئر قسم کے جیب کترے ہوتے تھے۔ نئے رنگروٹ عام طور پر بازاروں اور بس کے اڈوں پر لگائے جاتے تھے۔

خلیفہ جی جب ڈیوٹی مقرر کرتا تو اس روز گرہ کٹی کے فن پر باقاعدہ لیکچر دیتا۔ نئے نئے گر اور نت نئے ہتھکنڈے بتاتا۔ عتیق اللہ نے اندازہ لگایا کہ سوسائٹی کے مختلف طبقوں کیک افراد کی نفسیات خلیفہ جی بڑی اچھی طرح سمجھتا تھا۔ چنانچہ ایک روز ایسا ہوا کہ ملی نے ایک سرکاری افسر کی جیب صاف کی۔ بڑا خوش تھا کہ ہاتھ مار لیا۔ مگر بٹوے سے صرف دو روپے اور کچھ ریزگاری نکلی۔ خلیفہ جی کو پتہ چلا تو ملی کو خوب ڈانٹا۔ پھر پوچھنے لگا۔ "ابے یہ کام تو نے کہاں کیا تھا؟"

وہ بولا "دفتر کے پاس جب وہ اپنی گاڑی میں بیٹھ رہا تھا۔"

خلیفہ جی سر پر ہاتھ مار کر بولا "بھئی کمال کر دیا' اس بھتنی والے نے۔ بھلا یہ بھی کوئی کاریگر کا موقع تھا۔ ابے ایسے شخص کی جیب پر ہاتھ کی صفائی اس وقت دکھائی جاتی ہے جب وہ بازار میں موٹر پر سے اتر کر کسی دکان میں داخل ہو رہا ہو۔ وہ بھی مہینہ کی شروع تاریخوں میں ورنہ ان کے کنے کچھ نہیں ہوتا۔"

اسی طرح ایک بار بھورے نے ایک عورت کے پرس پر ہاتھ مارا۔ ہاتھ اوچھا پڑا۔ پٹتے پٹتے بال بال بچ گیا۔ خلیفہ جی اس کی بھی خبر لی۔ کہنے لگا "ابے الو کے پٹھے! میں ہزار بار کہا کہ عورت پر کبھی ہاتھ نہ ڈالنا۔ وہ تو سالی یوں ہی چوکس چلتی ہے۔ پاس سے گزرو تو اس کے بدن میں گدگدی دوڑ جاتی ہے۔ ایسے کے ہاتھ لگانے کی کہاں گنجائش۔ پھر سالیاں فیل ایسا مچاتی ہیں کہ جان بچانا مشکل ہو جاتا ہے۔ خبردار جو آئندہ ایسا کیا ورنہ سالے خاں کسی روز صاف دھر لیے جاؤ گے۔"

خلیفہ جی صرف نام کا خلیفہ نہیں تھا' اپنے فن میں ماہر تو وہ تھا ہی اس کے علاوہ اپنے تمام شاگردوں کے رگ و ریشہ سے پوری طرح واقف تھا۔ ہر ایک کی فطرت اور خو بو کا اسے بخوبی اندازہ تھا۔ اس کی اس سوجھ بوجھ پر تو عتیق اللہ ایک بار دنگ رہ گیا۔ ہوا یہ کہ ایک روز عتیق اللہ نے گھڑی کو بہت تلاش کیا۔ جب نہ ملی تو شام کو خلیفہ جی سے تذکرہ کیا۔ وہ کہنے لگا۔

"گھبرانے کی کوئی بات نہیں' مل جائے گی۔"

عتیق اللہ چپ ہو گیا۔

خلیفہ جی جھنجھلا کر اپنے جیب کتروں کو گالیاں دینے لگا۔ ''عتیق بھائی' میرے یاں بعض لمڈے سالے بڑے حرامی ہیں۔ بات یہ ہے کہ یہ مہینے کی آخری تاریخیں ہیں۔ اپنے لوگوں کا حساب یہ ہے کہ آٹھ دس تاریخ تک تو کشٹر ڈھونڈنا نہیں پڑتا۔ جس کے بھی ہاتھ ڈال دیا' کچھ نہ کچھ لے ہی نکلے۔ پھر بیس بائیس تاریخ کو شاکر کو بھانپنا پڑتا ہے۔ اور اس کے بعد کی نہ پوچھو۔ وہ کھلکھلا کر ہنسا۔ ''تم سے سچ کہ رہا ہوں کہ بھائی اکثر تو اپنی جیب بھی سنبھال کر چلنا پڑتی ہے۔''

اس کی بات سن کر عتیق اللہ کو بھی ہنسی آ گئی۔

رات ہوئی اور جب سب جیب کترے اکٹھا ہوئے تو خلیفہ جی نے اونچی آواز میں کہا۔ ''آج دن میں عتیق بھائی کی گھڑی کسی اپنی ماں کے یار نے پار کر دی۔ سالے نے میری ناک کٹوا دی۔'' اتنا کہہ کر اس نے سب کے چہروں کا بغور جائزہ لیا۔ سب چپ بیٹھے تھے۔ خلیفہ جی ایک ایک کے چہرے کو' آنکھوں کو' اس کی ہر حرکت کو دیکھ رہا تھا۔ کمرے کے اندر بالکل خاموشی تھی۔ کئی منٹ اسی عالم میں گزر گئے۔ ناگاہ' خلیفہ جی نے ڈپٹ کر کہا۔

''ابے فیضو! ادھر سامنے تو آ''

فیضو سہا ہوا سا اٹھ کر خلیفہ جی کے سامنے آ گیا۔ خلیفہ جی نے چیخ کر کہا۔ ''کیوں بے حرام کے تخم تیری تو!'' اس نے گالی دے کر بختیار سے کہا۔ ''پلا سالے کو کریلے کا پانی۔''

بختیار نے نہ جانے کہاں سے ڈھونڈ کر ایک گندی سی شیشی نکالی۔ جس میں ہرا ہرا عرق بھرا ہوا تھا۔ اس نے بڑھ کر بڑی بے رحمی سے فیضو کو پچھاڑا اور اس کے سینہ پر سوار ہو گیا۔ ملی نے زبردستی فیضو کا منہ کھول دیا۔ بختیار نے شیشی کھول کر کئی قطرے اس کے حلق میں ٹپکا دیئے۔ فیضو ہاتھ جوڑ کر غیں غیں کرنے لگا۔ خلیفہ جی بولا ''چھوڑ دو سالے کو'' دونوں نے اسے چھوڑ دیا۔ فیضو ابکائیاں لینے لگا۔

خلیفہ جی نے ڈپٹ کر پوچھا۔

''کہاں ہے گھڑی؟''

وہ جلدی سے بولا ''نیں روپے میں ایک جگہ رکھی ہے۔ ابھی جا کر لاتا ہوں۔''

خلیفہ جی نے ملی سے کہا۔ ''ابھی جا سالے کے ساتھ''

ملی فوراً فیضو کے ساتھ اٹھ کر چلا گیا۔ کوئی گھنٹہ بھر بعد عتیق اللہ کو اس کی گھڑی واپس مل گئی۔

عتیق اللہ کو اس مکان میں رہتے ہوئے اب دو مہینہ سے زیادہ ہو گئے تھے۔ وہ تمام جیب کتروں کی عادتوں سے اور ان کی اصطلاحات سے بخوبی واقف ہو گیا تھا۔ یہیں آ کر اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ شہر میں جیب کتروں کے مختلف گروہ تھے جنہوں نے اپنے اپنے حلقے بانٹ رکھے تھے۔ سب میں ایک طرح کا باہمی سمجھوتہ تھا۔ کوئی کسی کے علاقے میں جا کر کام نہیں کرتا تھا۔ چنانچہ ایک بار ایسا ہوا کہ خلیفہ جی دن بھر کی کمائی وصول کر رہا تھا۔ عین اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ سب گھبرا گئے۔ خلیفہ جی کے اشارے پر بختیار باہر گیا۔ سب کے چہرے فق ہو رہے تھے۔ مگر جب بختیار ایک چھریرے بدن کے نوجوان کو اندر لے کر آیا تو گھبراہٹ جاتی رہی۔ خلیفہ جی ہنس کر بولا۔

''میرے یار' تو نے تو خواہ مخواہ کی کھلبلی مچا دی تھی۔ خیریت تو ہے؟ آج ادھر کیسے نکل آیا؟'' نووارد نے کہا ''استاد نے کہلوایا ہے کہ تمہارا ایک آدمی ہمارے علاقے میں کام کر گیا ہے۔ یہ بہت بری بات ہے۔''

خلیفہ جی نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ ''ہاں جی' یہ بہت بری بات ہے۔'' پھر اس نے گھور کر اپنے شاگردوں کو قہر آلود نظروں سے دیکھا۔ ''ابے تم میں سے کون گیا تھا استاد کلن کے علاقے میں آج؟''

بھوریا منمنا کے بولا۔ ''خلیفہ جی وہ ایسا ہوا۔۔۔۔۔۔''

خلیفہ جی بات کاٹ کر ایک موٹی سی گالی دی اور پوچھنے لگا۔ ''سالے وہ کیا تجھ سے پتلا موتتے ہیں جو تو وہاں اپنی باندگی دکھانے گیا تھا۔ خیر اس دفعہ چھوڑے دے رہا ہوں۔ اب جو یہ حرکت سننے میں آئی تو سالے سمجھ لینا کہ منہ میں پیشاب کروا دوں گا۔''

وہ گڑگڑانے لگا۔ ''نہیں خلیفہ جی' اب کے جو ایسا کروں تو جو تمہارا جی چاہے کرنا۔''

خلیفہ جی نے پوچھا۔ ''کتنی رقم لایا تھا؟''

وہ بولا ''تین سو اٹھائیس روپے تھے۔'' خلیفہ نے نووارد سے پوچھا۔ ''کیوں جی یہ ٹھیک کہہ رہا ہے؟''

وہ کہنے لگا ''ہاں خلیفہ جی' اتنی ہی رقم ہو گی۔''

خلیفہ نے فوراً بختیار سے کہا۔ ''نکالو جی روپے اور ان کا حساب بے باک کرو۔''

بختیار نے ۳۲۸ روپے نکال کر استاد کلن کے آدمی کو دے دیئے۔ اس نے روپے لے کر گنے اور ۸۲ روپے خلیفہ کی جانب بڑھا کر بولا۔ ''خلیفہ جی یہ لو اپنا کمیشن' ۲۵ فیصدی سے اتنے ہی بنتے ہیں۔ تم اپنا حساب لگا لو۔''

خلیفہ جی نے کہا۔ ''بختیار کو دے دو۔''

جب وہ جانے لگا تو خلیفہ جی نے روک کر کہا۔ "دیکھو جی استاد کلن سے میرا سلام کہنا۔ ان کو سمجھا دینا کہ یہ لمڈے بڑے حرامی ہیں۔ آئندہ جو بھی ایسی بگاڑ کی صورت پیدا کرے' سالے کی کس کے کندی کروں گا' کھال میں بھس بھروا دوں گا۔ کہنا' کبھی کبھار ادھر بھی نکل آیا کرو۔ بہت دن سے دیکھا نہیں۔ موقع ملا تو خود آؤں گا۔"

وہ سلام کر کے رخصت ہو گیا۔

انہی دنوں کا ذکر ہے۔ عتیق اللہ ایک نئی الجھن میں مبتلا ہو گیا۔ بات یہ تھی کہ جب پچھلا مکان خالی ہونے والا تھا تو اس نے اپنے بال بچوں کو بڑے بھائی کے پاس کوئٹہ بھیج دیا تھا۔ لیکن کچھ عرصے سے بیوی نے واپس آنے کا سخت تقاضا شروع کر دیا تھا۔ ہر خط میں یہی لکھا ہوتا کہ وہ آنے کے لیے تیار بیٹھی ہے' جیٹھانی سے اس کی بالکل نہیں بن رہی تھی۔ آئے دن تو تو میں میں ہوتی۔ آخر اس نے ایک روز ہمت کر کے یہ مسئلہ خلیفہ جی کے سامنے رکھ دیا۔

وہ ہنس کر بے نیازی سے بولا "عتیق بھائی' تم نے بھی کمال کر دیا۔ اب تک مجھ سے بتایا بھی نہیں کہ بال بچے وہاں پڑے ہیں۔ نہیں جی' ان کو تکلیف نہیں ہونا چاہیے۔ آج ہی تار دے کر بلا لو۔ میں اپنا دفتر سب سے پیچھے والے کمرے میں لے جاؤں گا۔ تم بالکل فکر نہ کرو۔"

لیکن عتیق اللہ اس کے اس قدر اطمینان دلانے پر بھی مطمئن نہ ہو سکا۔ جھجکتے ہوئے اس نے خلیفہ جی سے دل کی بات کہہ ہی دی۔

"مگر اس دھما چوکڑی میں عورتوں کا رہنا مناسب نہ رہے گا۔"

خلیفہ جی نے بڑے پیار سے ڈانٹ کر کہا۔ "یار! تم بھی کیسے بات کرتے ہو۔ عتیق بھائی! کیا مجال جو کسی نے ادھر آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا۔ سالوں کی چیسے پر رکھ کر بوٹیاں نہ کر دوں گا۔" وہ اس وقت بہت جوش میں آ گیا تھا' اسی لہجے میں بولا "بس جی تم سے کہہ دیا۔ بھابی اور بچوں کو اب کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہیے۔ یار یہ ہمارے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہے کہ وہ اسی طرح پریشانی اٹھائیں۔ رہی ان لمڈوں کی بات تو تم ان کی طرف سے بالکل اطمینان رکھو۔ بدمعاشی کرنے کے لیے بازار میں کچھ کمی ہے جو کوئی سالا گھر پر ہی ڈاکہ ڈالنے کی نیت کرے گا۔"

مگر خلیفہ جی جس قدر مطمئن کرنے کی کوشش کرتا رہا عتیق اللہ اسی قدر غیر مطمئن ہوتا گیا۔ اس نے سوچا کہ یہ لوگ ٹھہرے جرائم پیشہ۔ ان کے قول و فعل کا کیا اعتبار؟ نہ جانے کس وقت کیا حرکت کر بیٹھیں۔ میں ان سے لڑ جھگڑ بھی نہیں سکتا۔ سالے مجھی کو ٹھکانے لگا دیں گے۔ پھر بیوی آ کر یہ رنگ ڈھنگ دیکھے گی تو یہی کہے گی' واہ کیا اچھی جگہ گھر لیا ہے۔ چور اچکوں میں لا کر ڈال دیا۔ عتیق اللہ کی

پریشانی بڑھتی گئی۔

خلیفہ جی نے اس شام کو دونوں کمرے خالی کر دیئے۔ اپنا سامان اٹھا کر سب سے پیچھے کے کمرے میں لے گیا۔ بختیار کو ہدایت کر دی کہ سامنے کے دروازے سے آمد و رفت بند کر دی جائے اور پیچھے گلی میں جو چھوٹا دروازہ کھلتا ہے آئندہ سب لوگ اسی طرف سے آیا جایا کریں۔

اس واقعہ کے تین چار روز بعد ہی بیوی کا ایک اور خط آیا۔ جس میں لکھا تھا کہ وہ عنقریب کراچی پہنچ رہی ہے۔ عتیق اللہ اور بھی پریشان ہو گیا۔ یہ بات بھی خلیفہ جی پوشیدہ نہ رہ سکی۔ اس نے سنا تو خوشی کا اظہار کیا۔ اسی وقت شاگردوں کو بلا کر کہا کہ کمروں کو اچھی طرح صاف کر دیا جائے۔

مگر خلیفہ جی جس قدر سرگرمی کا اظہار کر رہا تھا' عتیق اللہ اسی قدر مشکوک نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ خلیفہ جی اس کے بیوی بچوں کی آمد میں اتنی کیوں دلچسپی لے رہا ہے۔ ضرور کوئی نہ کوئی بات ہے۔ اس سالے خلیفہ جی کا کیا ہے۔ نہ جورو نہ جاتا' اللہ میاں سے ناتا۔ پتہ نہیں کیا حرامزدگی کر بیٹھے۔ سوچتے سوچتے آخر عتیق اللہ کے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔

دن گزرا' رات ہوئی۔ نو بجے کے قریب وہ تھانے پر پہنچا۔ انچارج تھانہ سے ملاقات کی۔ خلیفہ جی کے خفیہ اڈے اور اس کی مجرمانہ سرگرمیوں کی روئیداد سنائی۔ پولیس انسپکٹر نے پوری توجہ سے ایک ایک تفصیل سنی۔ خوش ہو کر بولا۔

''مسٹر عتیق اللہ! میں آپ کا بڑا ممنون ہوں۔ اگر لوگ اسی طرح تعاون کریں تو پولیس جرائم کا یوں چٹکی بجاتے قلع قمع کر سکتی ہے۔''

عتیق اللہ کی موجودگی ہی میں اس نے کانسٹیبل کو بلایا اور ہدایت کی۔ ''دیکھو دیوان جی' دس بارہ جوان فوراً اکٹھا کرو۔ سولجر بازار کے ایک مکان پر چھاپہ مارنا ہے۔ میں خود چلوں گا۔'' ہیڈ کانسٹیبل نے حکم کی تعمیل میں دونوں پیروں کی ایڑیاں جوڑ کر کھٹاک سے سیلوٹ کیا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

انسپکٹر اس کے جانے کے بعد عتیق اللہ کی طرف متوجہ ہوا۔ ''میں آج ہی سب کو پکڑ کر بند کئے دیتا ہوں۔ حرام زادوں نے شہر میں اودھم مچا رکھا ہے۔ کوئی دن نہیں جاتا کہ شہر میں گرہ کٹی کی دس بیس وارداتیں نہ ہوتی ہوں۔''

وہ دیر تک جیب کتروں کو برا بھلا کہتا رہا۔ اس نے عتیق اللہ کا ایک بار پھر شکریہ ادا کیا۔ عتیق اللہ اٹھا اور تھانے سے باہر چلا گیا۔

گھر واپس جانا ابھی مناسب نہ تھا۔ ڈر تھا کہ کہیں خلیفہ جی کو اس پر شبہ نہ ہو جائے۔ وہ جرائم پیشہ آدمی تھا۔ ایسے خطرناک شخص

سے عتیق اللہ دشمنی مول لینا نہ چاہتا تھا۔ لہٰذا وہ اپنے ایک دوست کے پاس چلا گیا۔

گیارہ بجے رات کو وہ اپنے دوست کے گھر سے نکلا تو بہت مطمئن نظر آ رہا تھا۔ لیکن جب وہ خلیفہ جی کے اڈے پر پہنچا تو یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ حسب معمول سارے جیب کترے وہاں موجود تھے البتہ خلیفہ جی غصے سے منہ پھلائے بیٹھا تھا۔ اسے دیکھتے ہی تیوری پر بل ڈال کر روکھے پن سے بولا۔

''تم آ گئے جی!''

عتیق اللہ نے مسکرانے کی کوشش کی۔ ''ہاں خلیفہ جی' کوئٹہ ابھی تار دے کر آیا ہوں۔ شاید پرسوں تک سب لوگ آ جائیں گے۔''

خلیفہ نے ایک لمبی ہوں کی اور اس کی بات نظر انداز کر کے بختیار سے بولا۔ ''ابھی تک گدھا گاڑی نہیں آئی۔ سب سالے نمک حرام ہو گئے ہیں۔ ان کتوں!'' خلیفہ جی ایک سانس میں کئی موٹی موٹی گالیاں بک ڈالیں۔

بختیار جھٹ سے بولا ''خلیفہ جی! میں نے علیا کو بھیجا ہے۔ وہ گدھا گاڑی لے کر آتا ہوگا۔''

خلیفہ جی نے عتیق اللہ کی طرف دیکھے بغیر بختیار سے کہا۔ ''دیکھو جی' گدھا گاڑی آتے ہی سامان لدنا شروع ہو جائے۔''

عتیق اللہ نے سوچا کہ شاید خلیفہ جی اپنا سامان لدوا کر کہیں اور جا رہا ہے۔ لہٰذا اس نے دبی زبان سے پوچھا۔ ''خلیفہ جی! کس کا سامان لدوا رہے ہو؟''

وہ کڑک کر بولا ''تمہارا' اور نہیں تو کیا میرا سامان جا رہا ہے۔ باندھو اپنا بوریا بستر' بہت دن ہو چکی یاری۔''

عتیق اللہ نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس وقت رات کو میں کہاں جاؤں گا؟''

''جہنم میں'' خلیفہ جی غضب ناک ہو کر بولا۔

اس کے غصے کا پارا برابر چڑھتا جا رہا تھا۔ عتیق اللہ نے سوچا۔ یہ تو بہت برا ہوا۔ یہاں تو معاملہ ہی الٹ ہو گیا۔ اس نے بگڑی بات سنبھالنے کی کوشش کی۔ ''مگر خلیفہ جی' تم اچانک اس قدر ناراض کیوں ہو گئے۔ آخر ہوا کیا؟'' خلیفہ جی نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ گھنی مونچھیں پھڑکنے لگیں۔ اسی عالم میں بولا۔

''ابے تو سمجھتا ہے کہ میں کچی گولیاں کھیلے ہوئے ہوں۔ تیرے ایسے نہ جانے کتنے ٹانگ تلے سے نکال دیے' تو مجھ سے داؤں کرنے چلا تھا۔''

عتیق اللہ نے حواس باختہ ہو کر کہا۔ ''مگر خلیفہ جی۔۔۔۔۔۔۔!''

خلیفہ جی نے آگے بولنے کا اسے موقع ہی نہ دیا۔ غضب ناک ہو کر زور سے چیخا۔ "نمک حرام کی ایسی کی تیسی۔ اب تو میری آنکھوں کے سامنے سے دفان ہو جا۔ ورنہ بختیار سے دو ٹھڈ لگواؤں گا تو سالے خاں' ہسپتال میں نظر آؤ گے۔ سوچا تھا کہ چلو بھئی شریف آدمی ہے' پڑا رہے گا سالا اپنا کیا لیتا ہے۔ مگر تیرے تو نطفے میں فرق ہے۔ میرے خلاف مخبری کرنے تھانے گیا تھا۔ بگاڑ لیا ہوتا میرا کچھ۔ شیخ سادی نے سچ کیا ہے۔ "اصل سے دغا نہیں' کم اصل سے وفا نہیں۔" وہ دیر تک اسی طرح بڑبڑاتا رہا۔ عتیق اللہ سر جھکائے کھڑا رہا کہ شاید خلیفہ جی کو اس کی حالت پر رحم آ جائے۔

اسی اثناء میں گدھا گاڑی آ گئی اور سامان لدنا شروع ہو گیا۔ عتیق اللہ نے ایک بار پھر خلیفہ جی کو منانے کی کوشش کی۔ عاجزی سے بولا "خلیفہ جی ذرا باہر آ کر میری ایک بات تو سن لو۔" خلیفہ جی آنکھیں نیچے کئے ہوئے خاموش لیٹا تھا۔ اس نے آنکھیں کھول کر خون خوار نظروں سے عتیق اللہ کی جانب دیکھا۔

"اے جا رہا ہے یا پلواؤں کریلے کا پانی' سالا خاما خاں چیخ کئے جا رہا ہے۔"

عتیق اللہ کی روح فنا ہو گئی۔ وہ گھبرا کر فوراً کمرے سے باہر نکل گیا۔

◆◆◆

چاند کا داغ

حویلی میں اچانک کھلبلی پڑ گئی۔ سارے ملازم سراسیمگی کے عالم میں ادھر ادھر بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ چپہ چپہ چھان مارا۔ مگر نوری کا کوئی سراغ نہ ملا۔ علی مردان شاہ زخمی شیر کی طرح بپھرا ہوا خواب گاہ کے دروازہ پر کھڑا چیخ رہا تھا۔

”کہاں گئی حرام زادی' اس کی چمڑی ادھیڑ ڈالوں گا۔“

لیکن ”حرام زادی“ اپنی چمڑی سمیت ایسی رفو چکر ہوئی کہ مردان شاہ صرف ابابیل کے پر کی سی گھنی مونچھیں پھڑ پھڑا تا رہ گیا۔ بڑی تفتیش کے بعد اتنا معلوم ہو سکا کہ نوری شام ہی سے غائب ہے۔ اس کے ساتھ ہی اصطبل کے نئے سائیس اللہ ابھایا کا بھی کہیں پتہ نہیں تھا۔

اللہ ابھایا تھا تو سائیس' مگر بہت منجھا ہوا شکاری بھی تھا۔ نشانہ بھی اس کا اچھا تھا۔ جب سے ملازم ہوا تھا ہمیشہ شکار میں علی مردان شاہ کے ساتھ رہتا تھا۔ علی مردان شاہ اس پر مہربان بھی بہت تھا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ شکار کھیلتے ہوئے جھاڑیوں کی اوٹ سے ناگاہ ایک بپھرا ہوا جنگلی سور نکلا۔ علی مردان شاہ عین اس کے سامنے تھا۔ دلدلی علاقہ تھا۔ گھبراہٹ میں مردان شاہ کا پیر اس طور رپٹا کہ لڑکھڑا کر دھڑام سے گرا۔ بندوق ہاتھ سے چھوٹ کر دور چلی گئی۔ علی مردان شاہ جلدی سے اٹھا' مگر جنگلی سور بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔ اللہ ابھایا جھپاک سے آگے بڑھا اور حملہ کرنے سے پہلے ہی اچھل کر سور کی پشت پر سوار ہو گیا۔ ہاتھ میں دبے ہوئے چاقو سے سور کا پیٹ اس طرح چیر ڈالا کہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔

اس بے جگری اور جانثاری پر مردان شاہ اس قدر خوش ہوا کہ اپنی ڈبل بیرل بندوق اللہ ابھایا کو انعام کے طور پر بخش دی۔

مردان شاہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ نوری کو اللہ ابھایا اغوا کر کے لے گیا تو وہ غصے سے دیوانہ ہو گیا۔ سب دم بخود تھے۔ ہراساں اور پریشان تھے۔ صرف مردان شاہ کی گرج دار آوازیں سناٹے میں گونج رہی تھی۔ اس کی دونوں بیویوں نے اپنے اپنے کمروں کے دروازے اندر سے بند کر لیے تھے اور سہمی ہوئی گم صم بیٹھی تھیں۔

مردان شاہ کے نوکروں چاکروں نے گوٹھ کے ایک ایک گھر کی تلاشی لے ڈالی۔ جن لوگوں سے اللہ ابھایا کا میل جول تھا' انہیں ڈرایا دھمکایا گیا' جوتے لگائے گئے۔ ہاتھ پاؤں باندھ کر الٹا لٹکایا گیا' مگر سب بے سود۔ نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا۔

اللہ ابھایا کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ پوچھ گچھ کرنے پر ایک ہاری کی زبانی صرف اتنا معلوم ہوا کہ گوٹھ کے باہر درختوں تلے اللہ ابھایا نظر آیا تھا۔ اس کے ساتھ کوئی عورت بھی تھی جس کا چہرہ اجرک سے چھپا ہوا تھا۔ جھٹپٹے کا وقت تھا۔ اس لیے وہ اسے پہچان نہ سکا۔ دونوں تیز تیز قدموں سے سڑک کی جانب جا رہے تھے۔

یہ اطلاع فوراً علی مردان شاہ کو پہنچائی گئی۔ اس نے اسی وقت اپنے کمدار محمد عرس ملکانی کو طلب کیا اور یہ حکم صادر کیا کہ جس طرح بنے دونوں کو پکڑ لائے۔

محمد عرس ملکانی نے حکم ملتے ہی فوراً جیپ نکلوائی۔ چار قوی ہیکل اور ہوشیار کارندوں کو منتخب کیا اور ان کے ہمراہ جیپ پر سوار ہو گیا۔ سب کے پاس مختلف قسم کا اسلحہ تھا۔ وہ شکاریوں کی طرح مستعد اور چوکس نظر آ رہے تھے۔ ملکانی خود جیپ چلا رہا تھا۔ اس کے زانو پر بھری ہوئی رائفل رکھی تھی۔

جیپ میں مسلح کارندوں کے علاوہ ایک کھوجی بیٹھا تھا۔ اس کا نام بخشل تھا۔ وہ پیروں کے نشانات سے مویشیوں اور انسانوں کا سراغ لگانے کا ماہر تھا۔

محمد عرس نے جیپ اسٹارٹ کی اور وہ ہچکولے کھاتی' گرد کے بادل اڑاتی' کچے راستے پر تیزی سے دوڑنے لگی۔

علی مردان شاہ دیر تک اس سمت دیکھتا رہا جدھر جیپ گئی تھی۔ وہ بوجھل قدموں سے چلتا ہوا' اپنے کمرے میں واپس گیا۔ کچھ دیر بے چینی کے عالم میں ٹہلتا رہا۔ آخر نڈھال ہو کر بستر پر لیٹ گیا۔

حویلی پر گہرا سناٹا طاری تھا۔ کوئی سویا نہیں تھا۔ سب سہمے ہوئے تھے اور جاگ رہے تھے۔ انہیں جیپ کے واپس آنے کا انتظار تھا۔

رات آدھی ہو چکی تھی۔ جیپ پختہ سڑک سے نشیب میں اتر کر ویران اور ریتلے میدان میں پہنچ گئی تھی۔ ریت کے ذرے جگمگ' جگمگ کر رہے تھے۔ چاندنی میں جیپ کا بے ڈول سایہ اونچے نیچے ٹیلوں پر لہرا رہا تھا۔

کھوجی بخشل اگلی نشست پر کمدار محمد عرس ملکانی کے برابر بیٹھا تھا۔ وہ چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ بخشل قدموں کے نشانات دیکھ دیکھ کر ملکانی کو ہدایات دے رہا تھا۔ وہ بار بار جیپ رکواتا۔ نیچے اترتا' ریت پر بکھرے ہوئے نشانات غور سے دیکھتا۔ جھک کر ریت اٹھاتا' اسے سونگھتا' سر جھکا کر کچھ دیر سوچتا' پھر جیپ اسٹارٹ کرنے کا اشارہ کرتا۔ کبھی اسے دائیں طرف لے جاتا' کبھی

بائیں طرف۔کبھی آگے لے جاتا کبھی اچانک پیچھے پلٹنے کی ہدایت دیتا۔محمد عرس ملکانی بلا عذر اس کی ہدایت کے مطابق جیپ دوڑاتا رہا۔

انہوں نے دس بارہ میل کا فاصلہ طے کرلیا۔دور دور تک کہیں آبادی کا نام ونشان نہ تھا۔نہ آدم نہ آدم زاد لق ودق صحرا میں صرف ریت کے ٹیلے سر اٹھائے خاموش کھڑے تھے۔ہوا میں خنکی تھی اور ہلکی ہلکی تھر تھراہٹ۔

رات آہستہ آہستہ گزرتی جارہی تھی اس کے ساتھ ساتھ بخشل کے چہرے پر پریشانی اور گھبراہٹ پھیلتی جارہی تھی۔وہ پرانا اور منجھا ہوا کھوجی تھا۔دور دور تک اس کا شہرہ تھا۔مگر اللہ ابھایا اور نوری کا وہ ابھی تک کھوج نہیں لگا سکا تھا۔اس سے بھی زیادہ پریشان اور ہراساں کمدار ملکانی تھا۔اسے دھڑکا تھا اگر ناکام واپس گیا تو علی مردان شاہ کے غیظ وغضب کا نشانہ بنے گا۔نہ جانے کیا عتاب نازل ہو۔

چلتے چلتے ایک مقام پر بخشل نے جیپ رکوائی۔فوراً نیچے اترا۔آگے بڑھا اور کچھ دور جاکر ٹھہر گیا۔سامنے ریت پر قدموں کے نشانات اجلی چاندنی میں صاف نظر آرہے تھے۔انہیں دیکھتے ہی بخشل کے چہرے سے اطمینان جھلکنے لگا۔وہ واپس جاکر اپنی نشست پر بیٹھا اور جس سمت قدموں کے نشانات گئے تھے ادھر جیپ بڑھانے کا اشارہ کیا۔محمد عرس ملکانی نے اس کی ہدایت پر فوراً عمل کیا۔

قدموں کے نشانات ایک مقام پر پہنچ کر ختم ہوگئے تھے۔آگے ریت کا اونچا ٹیلا تھا۔جیپ اس پر چڑھائی گئی تو ڈگمگا کر الٹتے الٹتے بچی۔لیکن نرم نرم اوس سے بھیگی ہوئی ریت میں دھنس گئی۔اسی وقت ریگزار کے سناٹے میں بندوق چلنے کی خوفناک آواز ابھری۔گولی سنسناتی ہوئی جیپ کے پاس سے گزر گئی۔وہ سنبھلنے بھی نہیں پائے تھے کہ دوسری گولی جیپ کے بونٹ پر لگی۔زوردار دھماکہ ہوا اور سب حواس باختہ ہوگئے۔

وہ جلدی جلدی کود کر جیپ کی اوٹ میں ریت پر لیٹ گئے۔جن کے پاس بندوقیں تھیں انہوں نے گھات لگا کر اس ٹیلے کی سمت فائرنگ شروع کردی جدھر سے گولی چلائی گئی تھی ذرا دیر بعد جوابی فائرنگ شروع ہوگئی۔

نصف گھنٹے تک دونوں طرف سے گولیاں چلتی رہیں۔مگر محمد عرس ملکانی اس صورت حال سے جلد ہی پریشان ہوگیا۔اس نے سوچا اس طرح تو جیپ ٹوٹ پھوٹ کر ناکارہ ہوجائے گی۔دوسری طرف کی تمام گولیاں اسی پر آکر لگ رہی تھیں۔

وہ ریت پر گھسٹتا ہوا آہستہ آہستہ ٹیلے کی جانب بڑھنے لگا۔وہ اس کوشش میں تھا کہ کسی طرح خاموشی سے ٹیلے کے عقب میں پہنچ جائے اور اچانک حملہ کردے۔ملکانی کچھ دور آگے گیا تھا کہ ایک گولی اس کے سر پر سے چیختی ہوئی گزر گئی۔وہ بال بال بچ گیا ورنہ بھیجا

نکل کر باہر آ جاتا۔ ملکانی جہاں تھا وہیں دبک گیا۔

وہ دم سادھے اسی عالم میں ریت پر پڑا رہا۔ چند لمحے بعد اس نے سر ابھارا اور چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ ٹیلے کے نشیب میں ایک سایہ لرزتا ہوا نظر آیا۔ اس نے اپنی رائفل اٹھائی۔ نشانہ باندھا اور گولی چلا دی۔ گولی کی آواز کے ساتھ ہی کوئی زور سے چیخا اور دوسری طرف سے فائرنگ بند ہو گئی۔

کمدار محمد عرس ملکانی جھکا جھکا آگے بڑھا اور ٹیلے کے عقب میں پہنچ گیا۔ اس نے دیکھا' اللہ ابھایا ریت پر پڑا ہے۔ وہ اب ختم ہو چکا تھا۔ گولی اس کی کنپٹی پر لگی تھی اور کھوپڑی پھاڑتی ہوئے نکل گئی تھی۔ چمکتی ہوئی ریت پر لاش کے قریب خون کا بڑا سا دھبا بن گیا تھا۔ نوری خوف سے کانپ رہی تھی۔ ملکانی کو شبہ تھا کہ اللہ ابھایا کے ساتھ اور بھی آدمی ہوں گے۔ لیکن وہاں صرف وہی دونوں تھے۔ اللہ ابھایا کا ہاتھ ابھی تک بندوق کی لبلبی پر تھا۔ اس کی پھٹی پھٹی بے جان آنکھیں نوری کی جانب اٹھی ہوئی تھیں۔

ملکانی نے حقارت سے اللہ ابھایا کے منہ پر زور سے لات ماری۔ نوری کا ہاتھ پکڑا اور گھسیٹتا ہوا جیپ کی طرف چل دیا۔ اللہ ابھایا کی لاش وہیں ریت پر پڑی رہی۔ اس کی آنکھیں ابھی تک کسی کو تلاش کر رہی تھیں۔

تاروں کی چھاؤں میں جیپ بستی میں داخل ہوئی۔ ملکانی نے جیپ حویلی کے سامنے کھڑی ہی کی تھی کہ علی مردان کی آنکھ کھل گئی۔

حویلی کے پھاٹک پر مردان شاہ کا خوفناک چہرہ نظر آیا۔ اس نے گرج کر پوچھا۔ ''لے آئے حرام زادی کو۔''

ملکانی نے ''حرام زادی'' کو اس زور سے دھکا دیا کہ وہ لڑکھڑاتی ہوئی جیپ سے نکلی اور علی مردان شاہ کے سامنے جا کر دھڑام سے گری۔ مردان شاہ نے اسے قہر آلود نظروں سے دیکھا' مڑا اور کمدار ملکانی سے ڈپٹ کر دریافت کیا۔

''اور وہ کہاں ہے نمک حرام؟''

محمد عرس ملکانی نے جھکی ہوئی گردن فخر سے اونچی کی اور نہایت مستعدی سے اپنی کارگزاری سنانے لگا۔ مردان شاہ نے پوری روداد سنی اور نوری کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''اسے کوٹ کے تہہ خانے میں لے جاؤ اور اللہ ابھایا کی لاش کو ٹھکانے لگا دو۔''

فوراً اس کے حکم کی تعمیل کی گئی۔ نوری کو کوٹ کے تہہ خانے میں پہنچا دیا گیا۔ اللہ ابھایا کی لاش قبر کھود کر راتوں رات دفن کر دی گئی۔

علی مردان شاہ تہہ خانے میں پہنچا۔تہہ خانے میں اندھیرا تھا۔سیلن تھی اور ایک طاق میں کانسی کا بوسیدہ چراغ روشن تھا۔اس کی دھندلی دھندلی روشنی میں نوری سہمی ہوئی کھڑی تھی۔اس کے جسم پر کوئی کپڑا نہیں تھا۔

دو کارندے اس کے بازو مضبوطی سے تھامے ہوئے تھے۔نیم تاریک تہہ خانے میں نوری کا ویران چہرہ بالکل سپاٹ نظر آ رہا تھا۔وہ بت کی مانند ساکت تھی۔سیلی ہوئی دیواروں سے تیز بو اٹھ رہی تھی۔

مردان شاہ دروازے پر ٹھہر کر لمحہ بھر تک نوری کے اجڑے ہوئے زرد زرد چہرے کو دیکھتا رہا۔نوری نے ایک بار نظر اٹھا کر علی مردان شاہ کی جانب دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔نوری کے بال چہرے پر بکھرے ہوئے تھے۔آنکھیں خوف زدہ اور بجھی بجھی تھیں۔

مردان شاہ نے پوچھا۔"سب ٹھیک ہے؟"

"ہاں سائیں' سب ٹھیک ٹھاک ہے۔" ملکانی نے مستعدی سے جواب دیا۔

مردان شاہ نے نوری کے قریب جا کر ہاتھ بڑھایا اور اونچی آواز سے کہا۔"لاؤ"

فوراً ہی ایک کارندہ زنبور سنبھالے ہوئے اندر داخل ہوا۔زنبور میں روپے کے برابر لوہے کا دہکتا ہوا گول گول ٹکڑا دبا تھا۔علی مردان شاہ نے زنبور اپنے ہاتھ میں لے لیا۔زنبور کا دستا رلکڑی کا تھا۔مردان شاہ نے دستے کو مضبوطی سے انگلیوں میں دبایا۔لوہے کے سرخ سرخ گول ٹکڑے کو دیکھا۔اس کے چہرے پر وحشت برسنے لگی۔آنکھیں ابل کر ڈراؤنی نظر آنے لگیں۔سانس کی رفتار تیز ہو گئی۔

اس نے بائیں ہاتھ سے نوری کے بال پکڑے اور زور سے اس طرح جھٹکا دیا کہ اس کا چہرہ سامنے آ گیا۔وہ زخمی پرندے کی طرح دونوں کارندوں کی گرفت میں پھڑ پھڑانے لگی۔مردان شاہ نے لوہے کا دہکتا ہوا سرخ سرخ ٹکڑا نوری کے رخسار پر زور سے جما دیا۔

نوری تڑپ کر دردناک آواز میں چیخی۔

مردان شاہ نے ہاتھ ہٹایا تو نوری کے داہنے گال پر روپے کے برابر گول سیاہ نشان ابھر آیا تھا۔وہ چیختے چیختے نڈھال ہو گئی تھی۔

مردان شاہ نے زنبور کارندے کو واپس دے دیا۔لیکن ذرا دیر بعد زنبور پھر اس کے ہاتھ میں آ گیا۔اس میں دبا ہوا لوہے کا گول ٹکڑا انگارے کی مانند دہک رہا تھا۔نوری اسے دیکھتے ہی چیخنے لگی۔

اس دفعہ مردان شاہ نے نوری کو اس طرح داغا کہ لوہے کا دہکتا ہوا سرخ سرخ ٹکڑا اس کے نرم نرم اجلے سینے کے بیچوں بیچ جم

گیا۔ چر چراہٹ کی ہلکی سی آواز ابھری اور کھال جلنے کی بو نیم تاریک تہہ خانے میں پھیل گئی۔ نوری تکلیف سے بے قرار ہو کر دیوانوں کی طرح چیخ رہی تھی۔ اس کا جسم پسینے سے شرابور تھا۔ چہرہ ڈراؤنا ہو گیا۔ گال کے ساتھ ساتھ سینے پر بھی سیاہ نشان ابھر آیا تھا۔

نوری کو چھوڑ دیا گیا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا کر زمین پر بیٹھ گئی۔ یہ تیرھویں لڑکی تھی جس کا بدن مردان شاہ نے دہکتے ہوئے لوہے سے داغا تھا۔

دن نکلنے سے پہلے ہی نوری کو نکال دیا گیا۔ ایسی داغی لڑکی نہ اب حویلی میں رہ سکتی تھی نہ گوٹھ میں۔ اسے کوئی پناہ نہیں دے سکتا۔ سب علی مردان شاہ کے عتاب سے ڈرتے ہیں۔ نہ وہ احتجاج کر سکتی ہے اور نہ تھانے میں جا کر فریاد کر سکتی ہے۔ تھانیدار کا مردان شاہ سے یارانہ ہے۔ وہ اس کے ساتھ بیٹھ کر شراب پیتا ہے' شکار کھیلتا ہے۔ ضرورت پڑنے پر دونوں ایک دوسرے کی ہر طرح سے مدد کرتے ہیں۔

نوری کے جاتے ہی حسب معمول مردان شاہ کے لیے نئی رکھیل کی تلاش شروع کر دی گئی۔ علی مردان شاہ کے پرانے منشی نور محمد گھانگھرو کے مشورے سے محمد عرس ملکانی نے میری ٹاٹری کو بلایا۔ وہ علاقے کا مشہور ہتھاریدار اور پرانا ہسٹری شیٹر تھا۔ چوری اور ڈاکہ زنی کرتا تھا۔ مویشیوں کے ساتھ ساتھ ہاریوں کی نوجوان عورتوں اور لڑکیوں کو اٹھواتا تھا اور چوری کے مال کی خرید و فروخت کرتا تھا۔ اسے بڑے زمینداروں اور وڈیروں کے علاوہ پولیس کی سرپرستی بھی حاصل تھی۔

رات کا ایک پہر گزرا تو میرل ٹاٹری آیا۔ وہ اپنے ہمراہ ایک لڑکی بھی لایا تھا۔ وہ اس کے پانچ ہزار مانگتا تھا۔ مردان شاہ کو لڑکی پسند نہ آئی۔ اسے لڑکی کے شانے کچھ سکڑے سکڑے معلوم ہوئے۔ یوں ناک نقشہ اچھا تھا۔ صندلی رنگ تھا اور آنکھیں ستاروں کی مانند جھلمل جھلمل کرتی تھیں۔

گھنٹے' سوا گھنٹے بعد دوسری لڑکی لائی گئی۔ میرل نے اس کے چار ہزار طلب کئے۔ وہ بھی مسترد کر دی گئی۔ اس کی گردن ضرورت سے زیادہ لمبی تھی۔

کئی لڑکیاں دیکھنے کے بعد مردان شاہ کو جو لڑکی پسند آئی اس کا سودا دس ہزار میں ہوا۔ میرل کو پوری قیمت بھی ادا کر دی گئی۔

یہ لڑکی بہت شرمیلی اور کم گو تھی۔ حویلی کے ملازموں سے اس نے زیادہ میل جول نہ بڑھایا۔ مردان شاہ کی دونوں بیویاں خواہ مخواہ اس سے لڑائی جھگڑا کرتیں' گالیاں دیتیں۔ مارنے پیٹنے سے بھی دریغ نہ کرتیں مگر اس نے نہ کبھی احتجاج کیا اور نہ علی مردان شاہ سے ان

کی شکایت کی۔ ہر نئی لڑکی کی آمد پر حویلی میں جو ہنگامہ برپا ہوتا تھا' اس دفعہ نہ ہوا۔

اس کا نام دوبل تھا۔ مگر مردان شاہ پیار سے بلی کہا کرتا تھا۔ مگر اس میں بلی جیسی کوئی خاصیت نہیں تھی۔ بلی سے زیادہ وہ کبوتری معلوم ہوتی تھی۔ ہر وقت سہمی سہمی' شرمائی شرمائی سی رہتی۔ نہ اس نے کبھی یہ بتایا کہ وہ کہاں سے آئی ہے نہ اپنے گھر بار کا کوئی پتہ نشان دیا۔ حویلی کی خادماؤں نے بہت کریدا مگر وہ ہر بار خاموش ہو جاتی۔

حویلی میں رہتے ہوئے اسے چھ مہینے سے اوپر ہو گئے۔ لیکن اس عرصے میں نہ تو اس کے بارے میں کوئی اسکینڈل مشہور ہوا اور نہ ہی اس نے مردان شاہ کو کبھی شکایت کا موقعہ دیا۔ وہ سدھے ہوئے جانور کی طرح اس کے اشاروں پر چلتی تھی۔ لیکن مردان شاہ نہ معلوم کیوں بات بات پر اس سے ناراض ہو جاتا' گالیاں دیتا' مارتا پیٹتا۔ مگر اس نے کبھی بغاوت نہ کی۔ نہ کبھی رات کے سناٹے میں وہ مردان شاہ کے بیٹوں کے کمروں میں دیکھی گئی' نہ کبھی نوکروں کی کوٹھریوں کے آس پاس نظر آئی۔

علی مردان شاہ روز بروز اس سے بیزار ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں خود بھی اس بیزاری کی کوئی وجہ نہ آئی۔ ایک رات وہ خواب گاہ میں مردان شاہ کے پیر دبا رہی تھی' مردان شاہ کو اس روز نیند نہیں آ رہی تھی۔ الجھن برابر بڑھتی جا رہی تھی۔ یکا یک اس نے پاگلوں کی طرح آنکھیں پھاڑ کر دوبل کی طرف دیکھا اور جھنجھلا کر اس زور سے لات ماری کہ وہ لڑھکتی ہوئی نیچے فرش پر جا گری۔

مردان شاہ زور سے چیخا۔

''باہر نکل جا حرام زادی''

لیکن وہ فرش پر دم بخود پڑی رہی۔ آخر مردان شاہ بستر سے اٹھ کر خود اس کے پاس آیا۔ ہاتھ پکڑا اور گھسیٹتا ہوا دروازے تک لے گیا۔ دروازے کا ایک پٹ کھولا اور دھکا دے کر باہر نکال دیا۔

''یہاں اب آئی تو تیری ٹانگیں توڑ دوں گا۔''

مردان شاہ نے دروازہ بند کیا اور غصے سے بڑبڑاتا ہوا جا کر بستر پر لیٹ گیا۔ نیند اب اور بھی زیادہ اڑ چکی تھی۔ وہ دیر تک بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ دوبل پھر واپس نہ آئی۔ حالانکہ مردان شاہ کو یقین تھا کہ وہ آئے گی ضرور۔ مگر اس کا اندازہ غلط نکلا۔ اسے اور بھی زیادہ غصہ آیا۔

رات کے پچھلے پہر وہ کمرے سے نکل کر باہر آیا۔ ہر طرف گہرا سناٹا چھایا تھا۔ اس نے حویلی کا ایک چکر لگایا۔ مگر وہاں کوئی بھی نظر نہ آیا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس طرف چل دیا جہاں حویلی کے ملازمین کی کوٹھریاں تھی۔ ایک دیوار کے پاس اس اندھیرے میں

کسی کا سایہ نظر آیا۔ مگر جب وہاں پہنچا تو کوئی ہوا کے جھونکے کی طرح اس کے قریب سے گزر گیا۔ مردان شاہ اسے اندھیرے میں پہچان نہ سکا۔ البتہ دوبل کھڑی تھی۔

مردان شاہ نے جھپٹ کر اپنے چوڑے ہاتھوں سے اس کی گردن دبوچی اور گھسیٹتا ہوا اس نیم تاریک تہہ خانے میں لے گیا جس کی دیواریں سیلی سیلی تھیں اور جہاں تیز تیز بساند پھیلی تھی۔ اس نے کانسی کا وہ بھدا چراغ روشن کیا جسے تہہ خانے کے بجائے میوزیم میں ہونا چاہیے تھا۔ علی مردان شاہ نے دروازہ بند کیا۔ دوبل کے سارے کپڑے اتارے۔ طاق میں رکھا ہوا زنبور اور لوہے کا گول ٹکڑا اٹھایا۔ لوہے کے ٹکڑے کو زنبور میں دبایا اور چراغ کی لو سے اسے گرم کرنے لگا۔ وہ چپ چاپ کھڑی رہی۔

جب لوہا دہکنے لگا تو مردان شاہ نے اس کے بال پکڑ کر چہرہ سامنے کیا۔ دوبل نے ذرا بھی مزاحمت نہ کی۔ سہمی ہوئی کھڑی رہی۔ لیکن جب اس نے رخسار پر دہکتا ہوا سرخ سرخ لوہا لگایا تو دوبل کی چیخ نکل گئی۔ اور جب اس نے سینہ داغا تو وہ بے ہوش ہو کر گر پڑی۔

سویرا ہونے سے پہلے جب وہ دوبل کو حویلی سے دھکے دے کر باہر نکال رہا تھا تو اس نے بے لرزتی ہوئی آواز میں گڑگڑا کر پوچھا۔ ''سائیں میں اب کہاں جاؤں؟'' مگر مردان شاہ ذرا بھی متاثر نہ ہوا۔ اس نے پلٹ کر اس کی جانب دیکھا بھی نہیں۔ وہ تیزی سے مڑا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

وہ دن چڑھے تک پڑا سوتا رہا۔ لیکن آنکھ کھلتے ہی اسے اچانک دوبل یاد آ گئی۔ وہ شرمیلی سی لڑکی جسے پیار سے وہ بلی کہتا تھا' مگر وہ بستی سے نکل کر ایسی غائب ہوئی کہ تلاش کرنے پر بھی اس کا کوئی سراغ نہ ملا۔

مردان شاہ تمام دن اداس رہا۔ اب وہ پچھتا رہا تھا کہ اس نے بہت برا کیا۔ دوبل پہلی لڑکی تھی جس کا جسم داغ کر اس نے دکھ محسوس کیا تھا۔

علی مردان شاہ کو اب یہ مراق ہو گیا تھا کہ اکثر راتوں کو اٹھ کر بیٹھ جاتا۔ گھنٹوں رات کے سناٹے میں بیٹھا چاند کو تکا کرتا۔ حویلی میں دوبل کی جگہ نئی رکھیل آ گئی تھی۔ وہ بھرپور جوان تھی اور بڑی طرح دار تھی۔ مگر مردان شاہ کو اس سے زیادہ لگاوٹ یا شیفتگی پیدا نہ ہو سکی۔ اسی کوفت میں وہ بیمار پڑ گیا۔

شروع میں وہ گاؤں کے حکیم سے علاج کراتا رہا۔ مگر جب افاقہ نہ ہوا تو شہر سے ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ اس کے علاج سے بھی مرض میں

کمی نہ ہوئی تو دوسرے ڈاکٹروں سے رجوع کیا گیا۔ علاج معالجہ ہوتا رہا۔ لیکن مردان شاہ کی صحت برابر گرتی جا رہی تھی۔ اس کا جسم زردی مائل ہو گیا تھا۔ چیتے کی طرح تیز چمکتی ہوئی آنکھیں بے رونق ہو گئی تھیں۔ بظاہر اسے کوئی عارضہ نہیں تھا۔ بس کبھی کبھی دورہ پڑتا تھا۔ اس وقت اس پر جنون کی سی کیفیت طاری ہو جاتی۔ منہ سے کف جاری ہو جاتا۔ آنکھوں میں خون اتر آتا اور گھنی مونچھیں ابابیل کے پروں کی طرح پھڑ پھڑانے لگتیں۔

یہ دورہ اس وقت پڑتا جب اسے کوئی نوجوان اور خوبصورت لڑکی نظر آتی۔ علی مردان شاہ کا جی چاہتا کہ اس کا چہرہ داغ دے۔ درد ناک چیخیں ابھریں اور گوشت کے جھلسنے کی تیز بو ہر طرف پھیل جائے۔ اس وقت اسے وہ تمام لڑکیاں یاد آ جاتیں' جن کے نرم و نازک جسموں کو اس نے دہکتے ہوئے لوہے سے داغا تھا۔ ان میں دوبل بھی شامل تھی۔ وہ شرمیلی سی نازک لڑکی جو ہر وقت خوفزدہ نظر آتی تھی اور جو اب قریب کی بستی میں ایک کھنڈر کی دیوار تلے پڑی سسک رہی تھی۔ اس کا جسم سڑنے لگا تھا اور چہرہ دیکھ کر خوف معلوم ہوتا تھا۔

علی مردان شاہ کے علاج معالجے کا سلسلہ چلتا رہا۔ مگر کسی ڈاکٹر یا حکیم کے علاج سے شفا نہ ہوئی۔ مردان شاہ کی طبیعت سنبھلنے کی بجائے بگڑتی گئی۔ انہی دنوں اس کی پہلی بیوی کا بڑا بھائی ایک ماہر نفسیات کو اپنے ہم راہ لایا۔ وہ ادھیڑ آدمی تھا۔ وضع قطع سے خبطی معلوم ہوتا تھا۔ اسے حویلی سے متصل مہمان خانے میں ٹھہرایا گیا جس کے ایک حصے میں اوطاق تھا۔ جہاں ہر شام علی مردان شاہ محفل آرائی کرتا تھا۔ لیکن جب سے وہ بیمار ہوا تھا اوطاق ویران پڑا تھا۔

ماہر نفسیات نے پہلے روز مردان شاہ سے کوئی بات نہیں کی۔ صرف اس کی حرکات و سکنات کا مطالعہ کرتا رہا۔ دوسرے روز مردان شاہ سے اس نے کرید کرید کر اس طرح کے سوالات کئے جیسے عدالت میں وکیل ملزم سے جرح کرتے ہیں۔ مردان شاہ کو ان سوالات سے بڑی الجھن ہوتی۔ کبھی کبھی وہ جھنجھلا کر کھڑا ہو جاتا۔ اپنے بال نوچنے لگتا یا صرف بے بس ہو کر آنکھیں بند کر لیتا اور دیر تک اسی عالم میں بیٹھا رہتا۔ کئی روز تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ ایک روز باتیں کرتے کرتے ماہر نفسیات کو نہ جانے کون سا سراغ مل گیا کہ وہ خوشی سے اچھل پڑا۔ چٹکی بجا کر بولا۔

''شاہ جی! اب آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یوں سمجھئے کہ آپ مرض اب ختم ہو گیا۔ بس چند دنوں کی بات ہے۔''

مردان شاہ کو بھی اس کی باتوں سے قدرے اطمینان ہوا۔ وہ مسکرانے کی کوشش کرنے لگا۔

لیکن علاج ہنوز شروع نہ ہو سکا۔ ماہر نفسیات کو نئے چاند کے طلوع ہونے کا انتظار تھا۔ آخر جب نئے مہینے کا چاند نکلا تو حویلی کی چھت پر سر شام ہی ایک بڑا ٹب رکھوا دیا گیا۔ اس میں صاف ستھرا پانی بھرا تھا۔ ٹب کے نزدیک آمنے سامنے دو آرام کرسیاں ڈال

دی گئیں۔ ایک پر مردان شاہ کو بٹھایا گیا اور دوسرے پر خود ماہر نفسیات بیٹھا۔ مردان شاہ اس کی ہدایت کے مطابق ٹکٹکی باندھے ٹب کے اندر چاند کے عکس کو تکنے لگا۔

یہ سلسلہ نہایت پابندی سے چلتا رہا۔ شروع شروع میں تو مردان شاہ کو تھوڑی دیر بعد فرصت مل جاتی' اس لیے کہ چاند غروب ہوتے ہی دونوں اٹھ جاتے۔ لیکن جب چاندنی راتیں طویل ہو گئیں تو یہ عمل مردان شاہ کو بہت شاق گزرتا۔ اب چاند کا دائرہ روز بروز مکمل ہوتا جا رہا تھا۔ مردان شاہ چاند کو تکتے تکتے اونگھنے لگتا۔ اس کا جسم ڈھیلا پڑ جاتا۔ اور بے چینی کے عالم میں آرام کرسی پر پہلو بدلنے لگتا۔ اسی وقت ماہر نفسیات پانی کی سطح پر کنکری پھینکتا۔ ٹب کے اندر بھرے ہوئے پانی میں ہلکا سا ارتعاش پیدا ہوتا۔ چاند کا جھلکتا ہوا گول مٹول چہرہ شیشے کی مانند ٹوٹ کر چکنا چور ہو جاتا۔ مردان شاہ پر اس کا فوری ردعمل یہ ہوتا کہ اس کی رگ رگ میں ایک نئی حرارت' ایک نئی توانائی آ جاتی۔ اس کی آنکھیں انجانی مسرت سے چمک اٹھتیں۔

ماہر نفسیات خاموش بیٹھا اس کی ہر ہر حرکت کا بغور جائزہ لیتا رہا۔ رات بھر میں وہ بار بار ٹب میں کنکریاں پھینک کر چاند کے ٹکڑے ٹکڑے کرتا رہا۔ ابتدا میں تو اس عمل سے مردان شاہ کو بڑا لطف آتا لیکن چند ہی روز بعد اس کا ردعمل بالکل مختلف ہوا۔

یہ چاند کی اترتی تاریخیں تھیں۔ راتیں بڑی سہانی ہوتیں۔ ہلکی اور خنک ہوائیں سرسراتی ہوئی چلتیں۔ ہر طرف گہری خاموشی چھائی ہوتی۔ ایک ایسی ہی خوبصورت رات کا ذکر ہے۔ ماہر نفسیات نے پانی کی سطح پر کنکری پھینکی تو اس کی یہ حرکت مردان شاہ کو بڑی ناگوار معلوم ہوئی۔ اس کی بھویں تن گئیں۔ وہ خونخوار نظروں سے ماہر نفسیات کو گھورنے لگا۔ مگر زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔ دوبارہ اس نے یہی حرکت کی تو وہ اور بھی پریشان ہو گیا۔ آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ پانی میں کنکری گرنے کے ساتھ ہی مردان شاہ تکلیف سے آنکھیں بند کر لیتا۔

اس روز وہ تمام رات اسی تکلیف سے دوچار ہوتا رہا۔ دوسرے روز اس کی یہ تکلیف اور بڑھ گئی۔ پھر تو یہ عالم ہو گیا کہ ادھر ماہر نفسیات نے کنکری پھینکنے کے ہاتھ اٹھایا اور وہ جھٹ اس کا ہاتھ تھام لیتا۔ کبھی خوشامد کرتا کبھی جھنجھلاہٹ اور خفگی کا اظہار کرتا۔ کبھی اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کرتا۔ مگر ماہر نفسیات اس جانے نہ دیتا۔

یہ سلسلہ بھی کئی دن چلتا رہا۔ اب چاند ڈھلنے لگا تھا اور مردان شاہ رفتہ رفتہ ردعمل کا عادی بنتا جا رہا تھا۔ اس کے لیے ہر عمل اور ہر حرکت عام سی بات بن گئی تھی۔ نہ اس کے چہرے پر کوئی غیر معمولی تاثر ہویدا ہوتا نہ آنکھوں کا انداز تبدیل ہوتا۔ جب یہ مرحلہ آ گیا تو ایک روز ماہر نفسیات نے اعلان کر دیا کہ وہ بالکل صحت مند ہو چکا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اب اس کا جسم پہلے کی طرح فربہ ہو گیا

تھا اور چہرے پر تازگی آ گئی تھی۔

جب مردان شاہ کے صحت یاب ہونے کا مژدہ سنایا گیا تو حویلی میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ہر طرف گہما گہمی پیدا ہوگئی۔ دن بھر لوگ آ آ کر اسے مبارکباد دیتے۔ چھ بکرے ذبح کیے گئے اور ان کا گوشت گوٹھ کے غریب غرباء میں تقسیم کیا گیا۔ مسجد کے ملا کو نیا جوڑا دیا گیا۔ مردان شاہ نے اس روز لباس میں خاص اہتمام کیا تھا۔ رات کو سونے سے پہلے ماہر نفسیات کے ۲۹۶۷ روپے بل کے علاوہ مردان شاہ نے ایک ہزار روپے بطور انعام بھی دیا اور اپنی نئی گڈلک میں بٹھا کر شہر بھجوا دیا۔

میرل ٹاٹری نے اس روز مردان شاہ کے لیے ایک خوش شکل لڑکی بھی مہیا کی تھی۔ وہ شوخ اور کسی قدر نڈر تھی' عمر بھی زیادہ نہ تھی۔ شادی شدہ تھی مگر اس کی شادی کو دو مہینے بھی نہ گزرے تھے۔ اس کا نام جنت تھا۔ میرل اسے منگسیوں کے گاؤں سے اغواء کر کے لایا تھا۔ مردان شاہ نے ایک بہت پسند کیا۔ اس رات وہ جلد ہی اپنی خواب گاہ میں چلا گیا۔

جنت کو حویلی میں آئے ہوئے پانچواں روز تھا۔ رات کے پچھلے پہر مردان شاہ کی آنکھ کھلی تو جنت کمرے سے غائب تھی۔ مردان شاہ سخت برہم ہوا۔ وہ بپھرا ہوا کمرے سے باہر نکلا اور دیوانوں کی طرح اسے تلاش کرنے لگا۔ مگر اس کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اس اطلاع سے حویلی میں ایک بار پھر کھلبلی پڑ گئی۔ ہر شخص خوفزدہ نظر آنے لگا۔

کمدار محمد عرس ملکانی نے ایک بار پھر کارگزاری دکھائی۔ وہ دو ہوشیار اور مستعد کارندوں کے ہمراہ نکلا اور گھنٹہ بھر بھی نہ گزرا تھا کہ جنت کو لا کر علی مردان شاہ کے روبرو پیش کر دیا۔ وہ اسے سٹیشن سے پکڑ کر لایا تھا۔ اسے دیکھتے ہی مردان شاہ کی آنکھوں میں ہمیشہ کی طرح خون اتر آیا۔ اسی وقت اسے سیلی ہوئی دیواروں والے نیم تاریک تہہ خانے میں بھجوا دیا گیا۔ ذرا دیر بعد مردان شاہ بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس نے دیوانگی کے عالم میں لڑکی کے رخسار اور سینے کو دہکتے ہوئے سرخ سرخ لوہے سے داغا اور سویرا ہونے سے پہلے ہی دھکے دے کر حویلی سے نکال دیا۔

لیکن یہ سب کچھ کرنے کے بعد بھی اس کا غصہ کم نہ ہوا۔ اس نے ماہر نفسیات کو ہزاروں گالیاں دیں۔ ایک ملازم کی کمر پر خواہ مخواہ ٹھوکریں ماریں۔ کمرے کے اندر رکھے ہوئے شیشے کے تمام گلاس فرش پر پھینک پھینک کر چکنا چور کر دیئے۔ دیر تک غیظ و غضب کے عالم میں چیختا چلاتا رہا اور پھر نڈھال ہو کر بستر پر دراز ہو گیا۔

کئی روز گزر گئے۔ میرل ابھی تک علی مردان شاہ کے لیے کسی نئی لڑکی کا بندوبست نہیں کر سکا تھا۔ اس روز مردان شاہ کی طبیعت بہت مضمحل تھی۔ وہ تمام دن اپنے کمرے میں پڑا رہا۔ نہ کسی سے بات چیت کی نہ شام لاوو طاق گیا۔ بستر پر آنکھیں بند کیے لیٹا رہا۔

نیند بھی نہیں آ رہی تھی۔

رات آدھی ہوگئی۔حویلی پر گہرا سناٹا طاری تھا۔یکا یک ملی جلی آوازوں کا شور بلند ہوا۔علی مردان شاہ ہڑ بڑا کر اٹھا۔کمرے سے باہر نکلا۔گھبرایا ہوا حویلی سے باہر گیا تو بیرونی دروازے پر کمدار ملکانی مل گیا۔وہ بھی گھبرایا ہوا نظر آ رہا تھا۔اس نے بتایا کہ جنت کے شوہر رانجھو مگسی نے اپنے قبیلے کے ساتھ گوٹھ پر حملہ کر دیا ہے۔

ملکانی نے ٹھیک ہی اطلاع دی تھی۔مگسیوں کا ایک گروہ گاؤں میں داخل ہوگیا تھا۔ان کی تعداد پچاس سے زیادہ نہ تھی۔مگر سب کلہاڑیوں اور ایسے ہی دوسرے ہتھیاروں سے مسلح تھے۔حملہ آوروں کے ہجوم میں رانجھو آگے آگے تھا۔وہ تھا تو ہاری لیکن تگڑا اور سرکش نوجوان تھا۔اس نے جب سے اپنی بیوی جنت کی پٹائی کی تھی' اسی وقت سے انتقام کی آگ میں جل رہا تھا۔

علی مردان شاہ نے کمدار ملکانی کو ضروری ہدایات دیں اور واپس حویلی میں چلا گیا۔مگر وہ خوفزدہ اور پریشان نظر آ رہا تھا۔

حملہ آور شور مچاتے ہوئے اندھیرے میں برابر آگے بڑھ رہے ہوتے۔یکا یک بندوق چلنے کی آواز ابھری۔حملہ آوروں میں کھلبلی پڑ گئی۔کچھ سراسیمہ ہو کر پسپا ہو گئے۔کچھ درختوں کی اوٹ میں دبک گئے۔دوسری بار گولی چلی تو حویلی کے سامنے سے ہجوم چھٹ چکا تھا۔مگر تھوڑی دیر بعد انہوں نے پھر یلغار کر دی۔حویلی سے ایک بار پھر گولیاں چلنے لگیں۔لیکن اس دفعہ دوسری طرف سے پتھراؤ شروع ہوگیا۔پتھر آ آ کر حویلی کی کھڑکیوں اور دروازوں سے ٹکرانے لگے۔ایک پتھر مردان شاہ کے شانے سے چھپلتا ہوا گزر گیا۔وہ بدحواس ہو کر اپنے کمرے میں گھس گیا۔

رات کا اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔باہر ملی جلی آوازوں کا شور برپا تھا۔گولیاں چیخ رہی تھیں اور پتھر دھڑا دھڑا آ آ کر حویلی کے در و دیوار سے ٹکرا رہے تھے۔اسی اثناء میں حویلی کے اندر ملی جلی آوازوں کے ساتھ قدموں کا شور سنائی دیا۔

مردان شاہ کمرے کا دروازہ بند کرنے کے لیے اٹھا ہی تھا کہ اسی وقت کئی آدمی اندر گھس آئے ان میں رانجھو مگسی بھی شامل تھا۔

علی مردان شاہ کو دیکھتے ہی وہ دیوانہ ہوگیا۔تیزی سے آگے بڑھا اور اس کی گردن دبوچ لی۔اٹھایا اور کوئلے کی بوری کی طرح پختہ فرش پر پٹک دیا۔رانجھو نے لاتوں اور گھونسوں سے اس کی مرمت شروع کر دی۔اس کے منہ پر اس زور سے جوتے کی ٹھوکر ماری کہ ایک رخسار کی کھال کٹ گئی۔رخسار سے خون کا فوارہ ابل پڑا۔مردان شاہ زخمی ہوتے ہی بے ہوش ہوگیا۔

جب ہوش آیا تو علی مردان نے دیکھا کہ اس کے اردگرد ملازموں کے علاوہ پولیس والے بھی موجود ہیں۔کمرے میں ہر طرف ٹوٹا پھوٹا سامان بکھرا تھا۔حویلی میں گہری خاموشی تھی' سناٹا تھا۔تھانیدار نے دلجوئی کرتے ہوئے اسے بتایا کہ رانجھو مگسی اور اس کے تین

بھائیوں کے ساتھ کئی دوسرے حملہ آوروں کو گرفتار کرلیا گیا ہے۔ لیکن مردان ش آہ کے چہرے پر ایسی کاری ضرب لگتی تھی کہ اس کا ایک گال پھول کر غبارہ بن گیا۔ اس نے بولنے کی کوشش کی مگر بول نہ سکا۔ علی مردان کو اسی وقت کار میں ڈال کر اسپتال پہنچایا گیا جہاں اس کے زخم پر پانچ ٹانکے لگائے گئے۔ ہفتے بھر جب وہ اسپتال سے نکلا تو زخم مندمل ہو چکا تھا۔ البتہ چہرے پر اس کا نشان باقی رہ گیا تھا۔ یہ ہلال کی طرح نصف دائرہ میں بنا ہوا سیاہ داغ تھا۔ غالباً رانجھو گمسی کے جوتے کی ایڑی میں لوہے کی نعل جڑی ہوئی تھی جو علی مردان شاہ کے چہرے پر اپنی پوری چھاپ چھوڑ گئی۔

اس حادثے کو اب سال بھر سے اوپر ہو چکا ہے۔ رانجھو گمسی اور اس کے تین بھائیوں کے علاوہ کئی دوسرے حملہ آور ابھی تک جیل میں ہے۔ ان کے خلاف لوٹ مار توڑ پھوڑ اور بلوہ کرنے کے الزام میں مقدمہ چل رہا ہے۔ لوگ مردان شاہ سے اور بھی زیادہ خائف رہنے لگے ہیں۔ البتہ اس عرصے میں مردان شاہ نے کسی لڑکی کے جسم کو دہکتے ہوئے لوہے سے نہیں داغا۔ حالانکہ میرل ناٹری اس کے لیے ابھی تک نت نئی لڑکیاں مہیا کرتا رہا ہے۔

مردان شاہ کا عجیب وغریب مرض' جس کا علاج حکیموں ڈاکٹروں اور ماہر نفسیات سے بھی نہ ہو سکا اب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رفع ہو چکا ہے۔ لیکن اسے یہ فکر برابر ستاتی رہی کہ اپنے چہرے کا وہ بدنما داغ کسی طرح مٹا دے جو دیکھنے والے کو دور سے نظر آتا ہے۔

◆◆◆

استادِ محترم

پروفیسر کیانی نے مطالعے کے کمرے کا دروازہ آہستہ سے کھولا۔ لیکن کمرے کے اندر نظریں پہنچتے ہی دہلیز پر ٹھٹک کر رہ گیا۔ سامنے فرش پر اس کا نوجوان شاگرد دارا شکوہ بے خبر سو رہا تھا۔ اس کے چاروں طرف بے ترتیبی سے کتابیں بکھری ہوئی تھیں۔

لمحہ بھر وہ دروازے کے قریب چپ چاپ کھڑا رہا' پھر نہ جانے کیا سوچ کر پلٹا اور گھر سے باہر چلا گیا۔ اس نے سو سوا سو گز فاصلہ طے کیا ہوگا کہ خود بخود اس کے قدم رک گئے۔ اچانک خیال آیا کہ اب وہ جائے گا کہاں۔ اس وقت تو اسے اپنے مطالعے کے کمرے میں ہونا چاہیے۔ گھر سے باہر رہنے کے واسطے اس نے جو وقت مقرر کیا تھا اب ختم ہو چکا تھا۔

اس روز بھی وہ ٹھیک دس بجے واپس آ گیا تھا۔ اس کا معمول تھا کہ رات کو کھانا کھانے کے بعد گھر سے باہر چلا جاتا اور چہل قدمی کرتا ہوا ایڈورڈ کے بت تک جاتا۔ پارک کا چکر لگاتا اور واپسی پر علی محمد ٹیلر ماسٹر کی دکان کے ساتھ والے چائے خانے میں ایک پیالی گرم گرم چائے کی پیتا۔ چائے خانے سے نکل کر اس سڑک سے ہوتا ہوا گھر کی جانب لوٹتا جس پر دن کے وقت رکشا چلانے پر چالان ہو جاتا تھا۔ اس کے اس پروگرام میں کبھی فرق نہیں آیا۔

وہ پھر گھر میں واپس پہنچ گیا۔ مطالعے کے کمرے کے دروازے پر پہنچ کر اس نے دیکھا' لیمپ کی اجلی روشنی میں دارا ابھی تک بے خبر پڑا ہے۔ پروفیسر نے جوتے اتار کر بغل میں دبائے اور چوروں کی طرح دبے دبے قدموں چلتا ہوا کمرے میں داخل ہو گیا۔

جوتے ایک طرف رکھ کر اس نے سلیپر پہنے اور کرسی پر تھکا ہوا سا جا کر بیٹھ گیا۔ کمرے میں اس وقت کچھ حبس معلوم ہو رہا تھا۔ باہر کھلنے والی دونوں کھڑکیاں بند تھیں۔ وہ انہیں کھولنے کے ارادے سے اٹھا۔ مگر اس خیال سے وہاں تک نہ جا سکا' مبادا آہٹ سے دارا کی آنکھ کھل جائے، جو بازو پر سر رکھے مزے سے سو رہا تھا۔

پروفیسر کو اس کا اس طرح بے تکے پن سے سونا کچھ مناسب نہ معلوم ہوا۔ تکیہ وہاں کوئی موجود نہ تھا۔ لہٰذا اس نے کرسی کا کشن اٹھایا اور اسے سنبھالے ہوئے دارا کے قریب پہنچ گیا۔ آہستہ سے اس کا سر اٹھایا اور کشن رکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کی اس حرکت سے دارا کی آنکھ کھل گئی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے پروفیسر کو دیکھنے لگا۔ وہ شرمسار سا ہو کر گویا ہوا۔

''میں ہرگز تمہاری نیند میں مخل ہونا نہیں چاہتا تھا۔ مگر تم بے ڈھنگے پن سے سو رہے تھے۔ لو یہ کشن سر کے نیچے رکھ لو اور اپنی نیند

خراب نہ کرو۔"

ادھر دارا سخت شرمندہ تھا کہ وہ پڑھتے پڑھتے اس طرح فرش پر سو کیوں گیا۔ وہ صفائی پیش کرنے لگا۔

"جی وہ ذرا آنکھ لگ گئی تھی۔ بات یہ ہوئی کہ کل رات میں بہت دیر سے سویا تھا۔"

پروفیسر نے ذرا دیر خاموش رہنے کے بعد پوچھا۔ "تم یہاں کس وقت آئے؟"

"آپ کے جاتے ہی آ گیا تھا۔ آپ کے ملازم کلو نے یہی بتایا تھا۔"

پروفیسر کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات پیدا ہوئے۔ جھنجھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "کہاں ہے وہ کلو کا بچہ؟ میں نے ہزار بار کہا کہ جب تک میں واپس نہ آ جاؤں جاگتا رہے۔ معلوم ہوتا ہے وہ آج بھی جا کر سو گیا۔"

دارا نے پوچھا۔ "کہیے تو اسے جا کر جگا دوں؟"

پروفیسر نے اسے ڈانٹ دیا۔ "نہیں' سو جانا اس کی غلطی تھی۔ اسے جا کر جگانا تمہاری غلطی ہو گی۔ نیند خراب کرنا مجرمانہ فعل ہے۔"

کمرے میں گہری خاموشی چھا گئی۔ دارا چپ چاپ فرش پر بکھری ہوئی کتابیں سمیٹنے لگا۔ اسی اثنا میں پروفیسر نے پوچھا۔

"کیا پڑھ رہے تھے تم؟"

"مولیئر کا آوارے پڑھ رہا تھا۔ مولیئر کے متعلق پروفیسر آپ کا کیا خیال ہے؟"

اس نے گہری نظروں سے دارا کو دیکھا اور بتانے لگا۔ "مولیئر کے متعلق کوئی دو رائیں ہو ہی نہیں سکتیں۔ عالمی ادب میں اس کا درجہ بہت بلند ہے۔ گوئٹے نے کہا تھا۔ مولیئر اس قدر عظیم ہے کہ اسے جب بھی پڑھو ہر بار نئی مسرت کا احساس ہوتا ہے۔"

"میں نے آج ہی اسے شروع کیا تھا۔ سوچا تھا' ختم کر لوں تو آپ سے اس کے متعلق گفتگو کروں گا۔"

"اس بات سے یہ اندازہ ضرور ہوا ہے کہ تمہارا ادبی ذوق اب پاکیزہ ہوتا جا رہا ہے۔ مجھے ایسے طلباء سے چڑ ہے جو لندن ٹائمز کے لٹریری سپلیمنٹ یا اسی قبیل کے کسی اور اخبار یا جریدے میں کسی کتاب پر ریویو پڑھ کر الٹی سیدھی کوئی کتاب خرید لاتے ہیں اور اسے پڑھ کر خواہ مخواہ انٹلیکچوئل بننے کی کوشش کرتے ہیں۔"

دارا نے اس کی باتوں میں دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے۔۔۔۔۔۔"

پروفیسر اس وقت گردن جھکائے اپنی گھڑی دیکھ رہا تھا' اس نے فوراً اسے ٹوکا۔ "فی الحال تمہارا کوئی خیال نہیں' گیارہ بج چکے ہیں

اب مزید گفتگو نہیں ہوگی۔"

لیکن دارا باز نہ آیا۔"میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں۔۔۔۔۔۔۔"

پروفیسر نے پھر اس کی بات کاٹ دی۔"میں نے کہہ دیا مسٹر! اب کوئی بات نہیں ہوگی۔ میں امتحان کی کاپیاں دیکھوں گا' جب تک تمہارا جی چاہے بیٹھے پڑھتے رہو' اس کے بعد چپ چاپ چلے جانا۔"

دارا نے کوئی جواب نہ دیا اور خاموشی سے کتاب کھول کر پڑھنے لگا۔ پروفیسر نے اٹھ کر الماری کا تالا کھولا۔ امتحان کی کاپیاں نکالیں اور میز پر جھک کر انہیں دیکھنے لگا۔ کمرے میں سکوت طاری ہو گیا۔

پروفیسر دیر تک بیٹھا کاپیاں دیکھتا رہا۔ سرخ پنسل سے جگہ جگہ مختلف نشان بناتا رہا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ زور زور سے بڑبڑانے لگا۔

"جاہل' نامعقول۔۔۔۔۔۔۔۔ میں اسے ہرگز برداشت نہیں کر سکتا۔"

دارا نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا۔" کچھ مجھ سے کہا آپ نے؟"

پروفیسر اسے ناگواری سے گھورنے لگا۔"کیا تم بھول گئے' ابھی میں نے کہا تھا کہ تم کوئی بات نہیں کرو گے۔" قدرے توقف کے بعد وہ دھیمے لہجے میں گویا ہوا۔"تمہیں بھی یہ بات معلوم ہونا چاہیے' یہ ایسے طالب علم کی کاپی ہے جو انگریزی ادب میں ایم اے کی ڈگری لینا چاہتا ہے اور اس نالائق کو شیکسپئر کے نام کے ہجے تک نہیں آتے۔ اسے ایک نمبر نہیں دوں گا' صرف صفر۔ یہ سراسر جہالت ہے۔ میں اسے ہرگز برداشت نہیں کر سکتا۔"

دارا نے ہچکچاتے ہوئے اپنے ردعمل کا اظہار کیا۔"لیکن پروفیسر صاحب! یہ تو بڑی ناانصافی ہوگی۔"

پروفیسر اور بھی بپھر گیا۔ تمہارے نزدیک یہ ناانصافی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں کوئی غلط اقدام کر رہا ہوں۔"

دارا نے اس دفعہ بھی دھیمے لہجے میں کہا۔"میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔ میرا خیال ہے کہ آپ کچھ مارکس کاٹ لیں۔"

"تمہارا خیال بالکل احمقانہ ہے مسٹر! یہ ادب ہے' اس کی اقدار صدیوں میں وضع ہوتی ہیں۔ یہ ریگستان میں آلو اگانے کا تجربہ نہیں ہے۔"

دارا نے برجستہ جواب دیا۔"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ شیکسپئر کو پڑھنے کے بعد ریگستان میں آلو اگانے کا تجربہ کرنا پڑے۔ آپ نے ادبی اقدار تو وضع کر لیں' لیکن انسانی محنت کی اقدار وضع نہ کر سکے۔"

پروفیسر اسے ایک ٹک گہری نظروں سے دیکھتا رہا پھر تیکھے لہجے میں گویا ہوا۔"تمہارے خیالات کچھ اشتراکی ہوتے جا رہے ہے

ہیں۔ معلوم ہوتا ہے تمہارا معدہ کچھ گڑبڑ ہے۔ معدے کے فتور ہی سے ہمیشہ اس طرح کے پراگندہ خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ تم فوراً سربل ہو جاؤ۔"

دارا خاموش بیٹھا رہا۔

پروفیسر نے دوبارہ کہا۔ "میں کہتا ہوں کہ تم سربل ہو جاؤ۔"

"سر! میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔"

"میرا مطلب صرف اتنا ہے کہ تم سر کے بل کھڑے ہو جاؤ۔" پروفیسر نے وضاحت کی۔ یہ یوگا کا نہایت کارآمد آسن ہے۔ اسے شیرشن آسن کہا جاتا ہے۔ اس سے خون دماغ کی شریانوں میں تیزی سے گردش کرنے لگتا ہے۔ اس سے معدے کو تقویت اور دماغ کو فرحت ملتی ہے۔ تم روزانہ کچھ دیر تک یہ آسن لگایا کرو۔"

دارا شکوہ کے لیے یہ لمحہ بڑا عبرت ناک تھا۔ اس کے نزدیک یہ سراسر حماقت تھی۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ وہ پروفیسر کا حکم ٹال بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ ذرا دیر تک تذبذب کے عالم میں گم صم بیٹھا رہا۔ لیکن جب پروفیسر اس کے سر ہی ہو گیا تو مجبوراً اس نے پروفیسر کی ہدایت کے مطابق سر جھکا کر دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں پر ٹکایا اور ٹانگیں اونچی کرنے لگا۔ پہلے سے چونکہ مشق نہ تھی لہٰذا ٹانگیں بلند کرتے ہی جسمانی توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ وہ قلابازی کھا کر میز پر جا گرا جو شور کرتی ہوئی الٹ گئی۔ اس کے ساتھ ہی کئی کرسیاں' کتابیں اور ایسی ہی دوسری اشیاء لڑھکتی ہوئی فرش پر بے ترتیبی سے بکھر گئیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے کمرہ کباڑیے کی دکان بن گیا۔ پروفیسر کو معاً غصہ آ گیا' بگڑ کر بولا۔

"تم انسانی محنت کی اقدار کی باتیں کرتے ہو اور تم کو سربل کی بھی تمیز نہیں۔ اب تم ایک لمحہ ضائع کیے بغیر فوراً کمرے سے باہر چلے جاؤ۔"

اس کے جانے کے بعد پروفیسر بے چینی کے عالم میں کمرے میں ٹہلنے لگا۔

ٹہلتے ٹہلتے ایکا ایکی اسے خیال آیا' کہیں اس نے دارا شکوہ کو کمرے سے نکال کر کوئی نازیبا حرکت تو نہیں کی۔ جتنا زیادہ وہ اس بات پر غور کرتا گیا' اسی قدر یہ گمان قوی ہوتا گیا کہ اس کا اقدام مناسب نہیں تھا۔ اور جب یقین ہو گیا کہ اس کی حرکت درست نہیں تھی تو وہ اپنے متعلق سوچنے لگا' کہیں اس کا معدہ تو خراب نہیں ہے۔ ورنہ ایسی نازیبا بات اس کے ذہن میں کیوں آتی۔ ضرور کوئی ایسی ہی گڑبڑ ہے۔ اس نے فوراً جسم پر سے تمام کپڑے اتارے اور صرف انڈرویئر پہنے ہوئے فرش پر سر کے بل کھڑا ہو گیا۔

اس عالم میں مشکل سے چند منٹ گزرے ہوں گے کہ اچانک کمرے کے باہر بھاری بھاری قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ پروفیسر آہٹ پر پوری طرح توجہ بھی نہ دے پایا تھا کہ دروازہ کھول کر تین لحیم شحیم آدمی کمرے کے اندر گھس آئے۔ انہوں نے کمرے میں بکھرے ہوئے سامان کو دیکھا۔ سر کے بل کھڑے ہوئے نیم برہنہ پروفیسر کو دیکھا اور حیرت سے وہیں ٹھٹک کر رہ گئے۔

پروفیسر اسی طرح آسن جمائے سر کے بل کھڑا رہا۔ تینوں عین اس کے سامنے استادہ تھے۔ اس نے ان کی وضع قطعہ کا جائزہ لیا اور بڑی بے نیازی سے بولا۔

''معلوم ہوتا ہے' آپ غلط جگہ آ گئے ہیں۔ یہ پروفیسر صفدر علی کیانی کا مکان ہے' کسی پٹواری کی بیٹھک نہیں ہے۔ آپ براہ کرم باہر چلے جائیں۔ میں اس قسم کے دخل در معقولات ہرگز پسند نہیں کرتا۔''

انہوں نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا اور پھر ان میں سے کسی نے کہا۔ ''یہی معلوم ہوتا ہے۔''

''نہیں جی' یہ تو کوئی اور لگتا ہے۔ اس کا حلیہ تو کچھ اور بتایا تھا۔''

''داڑھی تو ویسی ہی نوکدار ہے اور سر بھی گنجا ہے۔''

جس آدمی نے یہ بات کہی تھی' بڑھ کر پروفیسر کے پاس پہنچا' ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ ''تم ہی پروفیسر کیانی ہو؟''

پروفیسر بگڑ کر بولا۔ ''ہاں' میرا ہی نام پروفیسر کیانی ہے۔ لیکن تم مجھ سے ملنے ہرگز نہیں آ سکتے۔ تم غلط جگہ آ گئے ہو۔''

''تم آدمی کی طرح تو کھڑے ہو۔''

پروفیسر اپنی بات پر اڑا رہا۔ ''تم سے جو کہنا تھا میں نے کہہ دیا۔ میں ۲۵ منٹ سے پہلے آسن نہیں چھوڑ سکتا۔ ابھی صرف پانچ منٹ گزرے ہیں۔ اس آسن کی مقررہ مدت نصف گھنٹہ ہے۔ اگر درمیان میں ختم کر دیا جائے تو بینائی پر برا اثر پڑتا ہے۔ بلکہ ریڑھ کی ہڈی پر بھی ضرب لگ جانے کا خدشہ ہے۔''

وہ ابھی آسن کے متعلق نہ جانے کتنی دیر گوہرافشانی کرتا مگر وہ تینوں لحیم شحیم اجنبی' جو وضع قطع سے بالکل اجڈ معلوم ہوتے تھے اس بلاغت سے استفادہ نہ کر سکے۔ بلکہ اس نے جو قریب ہی کھڑا تھا' پروفیسر کی کمر دونوں ہاتھوں سے پکڑی' اوپر اٹھایا اور اسے سیدھا کر دیا۔

پروفیسر غضب ناک ہو کر بولا۔ ''یہ قوت کا بے جا استعمال ہے۔ آپ نے سخت چھچھورے پن کا مظاہرہ کیا ہے۔''

''بس اب تم ہمارے ساتھ چپ چاپ چلے چلو۔''

پروفیسر حیرت زدہ ہو کر بولا۔ ''کہاں؟''

''جہاں ہم لے جائیں گے۔''

''میں تو صبح ۷ بج کر ۲۵ منٹ سے پہلے گھر سے نہیں نکل سکتا۔''

''کوئی بات نہیں' ہم نکال لے چلیں گے۔'' اتنا کہہ کر اس نے پروفیسر کا بازو پکڑا اور دروازے کی جانب کھینچتے ہوئے بولا۔ ''بس اب خاموشی سے چلے چلو' خواہ مخواہ چوٹ چپٹ آ جائے گی۔''

پروفیسر ایک ہی جھٹکے میں حواس باختہ ہو گیا۔ کہنے لگا۔ ''لیکن میں اس حلئے میں کیسے چل سکتا ہوں' کپڑے تو بدل لوں۔''

''بس یونہی چلے چلو۔ ہم کو تو حکم ملا ہے' جس طرح بیٹھے ہو اسی حالت میں لے آؤ۔''

''کس نے یہ حکم دیا ہے؟''

''چل کر خود ہی دیکھ لینا۔''

پروفیسر کچھ کہنے ہی والا تھا کہ ان میں سے ایک نے لپک کر اسے بازوؤں پر اٹھا لیا۔ وہ غصے سے چیخا۔ ''یہ کیا بدتمیزی ہے؟''

دوسرے نے اپنا چوڑا چکلا ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا۔

وہ اسے بازوؤں پر اٹھائے ہوئے گھر سے باہر لے آئے۔ دروازے پر لمبی سیاہ کار کھڑی تھی۔ انہوں نے پروفیسر کو کار کے اندر ڈال دیا۔ ڈرائیور کو اشارہ کیا۔ کار اسٹارٹ ہوئی۔ آن کی آن میں تیزی سے دوڑنے لگی۔ کچھ دیر تک پروفیسر گم صم بیٹھا رہا۔ پھر اس نے گردوپیش کا جائزہ لیا۔ دو آدمی منکر نکیر کی طرح اس کے دائیں بائیں بیٹھے تھے۔ ایک اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے پاس بیٹھا تھا۔

وہ سوچنے لگا' آخر یہ تینوں مجھے اس طرح زبردستی کہاں لیے جا رہے ہیں؟ میں نے ان کا کیا بگاڑا؟ میں نے کون سا ایسا جرم کیا جس کی پاداش میں مجھے اس طرح اغوا کیا گیا؟ یہ اور اسی قسم کے نامعلوم کتنے ہی سوالات اس کے ذہن میں چوہوں کی طرح بلوں سے منہ نکال نکال کر جھانکنے لگے۔

کار ایک پٹرول پمپ پر جا کر رکی۔ تینوں ڈرائیور سمیت اتر کر باہر چلے گئے۔ کار کا دروازہ کھلا تھا۔ پروفیسر نے ہچکچاتے ہوئے جسم کا تھوڑا سا حصہ باہر نکالا۔ اس وقت ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ اس نے سوچا موقع غنیمت ہے۔ اگر تھوڑی سی ہمت سے کام لیا جائے تو ان مشٹنڈوں کے نرغے سے نجات مل جائے گی۔ کچھ یہی سوچ کر وہ کار سے باہر آ گیا۔ قریب ہی ایک ٹرک کھڑا تھا۔ پروفیسر کیانی اس کی اوٹ میں دبکا ہوا چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھ ہی رہا تھا کہ اسی اثناء میں ایک شخص آیا اور جھک کر ٹرک کی اگلی سیٹ پر

جھانکتے ہوئے بولا۔

''یار تیرا کلینر کہاں ہے؟''

اس کی نظر پروفیسر پر پڑی۔ اس نے ننگ دھڑنگ دبلے پتلے پروفیسر کو دیکھا جو خالی انڈرویئر پہنے بالکل الو کا پٹھا نظر آ رہا تھا۔

''ہم تجھے اندر دیکھ رہے ہیں اور تو یہاں کھڑا ہے' چل ڈبہ اٹھا۔''

پروفیسر اس بدتمیزی پر جل بھن کر کباب ہو گیا۔ مگر اس شخص نے پروفیسر کی خفگی پر توجہ دیئے بغیر گردن پر ہاتھ رکھ کر زور سے دھکا دیا۔ پروفیسر گرتے گرتے بچا۔

''ابے چل رہا ہے یا لگاؤں سالے کے ایک ہاتھ۔''

پروفیسر سہم کر رہ گیا۔ چپ اس کے ہم راہ چل دیا۔ اس نے موبل آئل کا ڈبا اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ پروفیسر نے ڈبا لا کر ٹرک کے پاس رکھ دیا۔ اب فرار ہونے کی گنجائش نہ رہی تھی۔ وہ چاروں سامنے ہی کھڑے تھے۔ وہ خاموشی سے مڑا اور کار کی پچھلی نشست پر جا کر بیٹھ گیا۔ سوچا' زیادہ دیر باہر رہا تو نہ جانے اور کیا مصیبت نازل ہو۔

ذرا ہی دیر بعد چاروں واپس آ گئے۔ وہ اس وقت خوب ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ سب کار میں بیٹھ گئے۔ ڈرائیور نے انجن اسٹارٹ کیا۔ ایکسیلیٹر دبایا اور کار فراٹے بھرتی ہوئی سنسان سڑک پر دوڑنے لگی۔ مشکل سے میل بھر راستہ طے ہوا تھا کہ انہوں نے پھر کار ٹھہرا لی۔ اس مرتبہ کار کسی چائے خانے کے سامنے کھڑی تھی۔ لیکن کوئی باہر نہیں نکلا۔ ان میں سے ایک نے چائے خانے کے مالک کو آواز دے کر چائے لانے کا آرڈر دیا۔ فوراً ایک ادھیڑ آدمی چائے کی پیالیاں اٹھائے ہوئے کار کے نزدیک آ گیا۔ اس نے سب کو چائے دی۔ جب پروفیسر کی باری آئی تو وہ اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔ برابر بیٹھے ہوئے آدمی نے ڈپٹ کر کہا۔

''ابے اس طرح کیوں دیکھ رہا ہے؟ جھک کر سلام کر۔ جانتا ہے یہ کون ہیں ۔۔۔۔۔۔ کبھی پیر جھنڈے شاہ کو دیکھا ہے؟ نہیں دیکھا تو دیکھ لے' تیرے سامنے بیٹھے ہیں۔''

تینوں اس وقت دل لگی کے موڈ میں تھے۔ مگر ادھیڑ عمر بیرے پر نہ جانے کیا اثر ہوا کہ اس نے جھٹ پروفیسر کے پاؤں پکڑ لیے اور گڑگڑانے لگا۔

''سائیں بابا' بس ایک عرض ہے۔ صرف اتنی دعا کرو' میری بیٹی گھر آ جائے۔ اس کے سسرال والے اپنی ماں کے یار ہیں' ایک نمبر بدمعاش ہیں۔ تین سال سے اسے نہیں بھیجا۔''

پروفیسر نے اپنے پاؤں چھڑانے کی کوشش کی' جھنجھلا کر بولا۔ "یہ کیا نامعقول حرکت ہے؟"

مگر وہ باز نہ آیا۔ جتنا پروفیسر ناراض ہوتا وہ اتنا ہی زیادہ خوشامد کرتا۔ اس نئی مصیبت نے پروفیسر کو اس قدر پریشان کر دیا کہ وہ غصے سے چیخنے لگا۔ مگر اس شخص کی ایک ہی رٹ تھی۔ "بس ایک بار اپنی زبان سے کہہ دو۔" پروفیسر نے انتہائی غصے میں اس کے منہ پر تھوک دیا۔ اس کے برابر بیٹھے ہوئے لوگ اس چپقلش سے لطف اٹھاتے رہے۔

جب انہوں نے دیکھا کہ خواہ مخواہ کار رکی ہوئی ہے تو اس نے ادھیڑ عمر بیرے کو جھڑکا۔ "بس اب جا' تیرا کام بن گیا۔ جھنڈے شاہ جس پر تھوک دیں' سمجھو اس کا بیڑا پار ہے۔"

وہ دعائیں دیتا ہوا فوراً وہاں سے چل دیا۔ البتہ پروفیسر غصے سے تقریباً پاگل ہو گیا تھا۔ اس کا بس چلتا تو تینوں کو کچا چبا جاتا۔ مگر ہر ایک اس قدر موٹا تگڑا تھا کہ دیکھ کر ہی سہم گیا۔ کار تیزی سے دوڑتی رہی۔ پروفیسر بیٹھا ہوا سوچتا رہا کہ دیکھئے اب کون سی نئی مصیبت نازل ہوتی ہے۔"

کوئی نصف گھنٹے بعد کار ایک شان دار بنگلے کے پھاٹک میں داخل ہوئی اور پورٹیکو میں پہنچ کر رک گئی۔ وہ تینوں باہر نکلے۔ انہوں نے پروفیسر کو کار سے باہر آنے کا اشارہ کیا اور اپنے نرغے میں لے کر کشاں کشاں کوٹھی کے اندر چلے گئے۔

وہ ان کے ہم راہ ایک پر تکلف کمرے میں داخل ہوا۔ سامنے صوفے پر ایک بھاری بھر کم شخص آلتی پالتی مارے بیٹھا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ اس کے جسم پر چربی کی تہیں چڑھی ہوئی تھیں۔ اس کا یہ انداز پروفیسر کو سخت ناشائستہ معلوم ہوا۔

وہ اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ "آپ ہی پروفیسر کیانی ہیں؟"

پروفیسر جل کر بولا۔ "جی ہاں' اسی گرفتار بلا کو کیانی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔"

"معاف کیجئے گا جی' میں نے آپ کو اس وقت یہاں آنے کی تکلیف دی۔" وہ ان تینوں کی جانب متوجہ ہوا۔ "معلوم ہوتا ہے تم نے پروفیسر کو بہت پریشان کیا ہے' کم از کم لباس تو تبدیل کر لینے دیا ہوتا۔" وہ عیاری سے چہرے پر غصہ طاری کر کے ان پر چلانے لگا اور ڈانٹ ڈپٹ کر سب کو کمرے سے باہر نکال دیا۔ اس نے پروفیسر سے معذرت کی اور صوفے پر بیٹھنے کی درخواست کی۔

پروفیسر جلا بھنا سا جا کر ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔

اس شخص نے کھنکار کر گلا صاف کیا' نرم لہجے میں گویا ہوا۔ "پروفیسر صاحب' میں نے دراصل آپ کو اس لیے اس وقت تکلیف دی کہ کل صبح دس بجے دن کو مجھے سماجی بہبود کی کانفرنس کے ایک اجلاس کی صدارت کرنی ہے۔"

پروفیسر جھنجھلا کر بولا۔ ”تو پھر آپ نے کسی ڈاکٹر کو بلایا ہوتا جو آپ کے کوئی ایسی دوا تجویز کرتا کہ صدارت کرتے وقت آپ پر اعصاب شکنی کا دورہ نہ پڑے۔ میں کیا کر سکتا ہوں؟“

اس نے پروفیسر کے تند و تیز لہجے کا ذرا بھی برا نہ مانا۔ مسکرا کر بولا۔ ”دراصل میرا کام آپ ہی سے ہے۔ مجھے ایک خطبہ صدارت کی ضرورت ہے اور وہ آپ ہی لکھ سکتے ہیں۔“

پروفیسر نے بھنا کر کہا۔ ”آپ نے خطبہ صدارت لکھانے کا طریقہ بہت اچھا نکالا ہے۔“

وہ ڈھٹائی سے ہنستا رہا۔ ”بات یہ ہے‘ کانفرنس کے منتظمین نے آج ہی شام اطلاع دی ہے کہ کل کے اجلاس کی صدارت مجھے کرنی ہے۔“

پروفیسر نے اسی تیکھے لہجے میں جواب دیا۔ ”لیکن اس وقت میں کوئی بھی ذہنی کام نہیں کر سکتا۔“

”میں آپ کو اس کا ہزار روپے معاوضہ دوں گا۔“

پروفیسر نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔ ”میں اس قسم کی سودے بازی کا قائل نہیں ہوں۔“

”چلئے‘ پندرہ سو لے لیجئے گا۔ دیکھئے‘ اب انکار نہ کیجئے۔ پندرہ سو کی رقم کم نہیں ہوتی۔ اتنے سرمائے سے کوئی چھوٹا موٹا کاروبار شروع کیا جا سکتا ہے۔ آپ وہ قیمتی کتابیں خرید سکتے ہیں جن کو لائبریری میں دیکھ کر اکثر چوری کرنے کی بھی نیت ہو جاتی ہے۔“

اس دفعہ پروفیسر کو اس کی باتیں زیادہ ناگوار نہ گزریں۔ اس کا انداز قطعی کاروباری تھا‘ مگر اس میں ذہانت ضرور تھی لیکن وہ آمادہ نہ ہوا۔

”مجھے افسوس ہے‘ میں آپ کی یہ پیشکش قبول نہیں کر سکوں گا۔“

”دیکھئے‘ میں آپ کو دو ہزار تک دے دوں گا۔ غور تو کیجئے۔ یہ خاصا بڑا آفر ہے۔ اتنے روپے سے آپ سیکنڈ ہینڈ اسکوٹر خرید سکتے ہیں۔ کچھ رقم اپنے پاس سے ملا کر پرانے ماڈل کی کار بھی خرید سکتے ہیں۔ اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ آج کل کار زندگی میں کتنی اہمیت رکھتی ہے۔ کار موجود ہو تو بغیر سفارش کے بھی دفتروں میں کام چل جاتا ہے۔ لڑکیوں سے فلرٹ کرنے کے لیے۔۔۔۔۔۔“

اچانک اس کی نظر پروفیسر کی فرنچ کٹ ڈاڑھی پر جا پہنچی جس میں جگہ جگہ سفید بال جھلک رہے تھے۔ اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ مسکرا کر اسے دیکھنے لگا۔ پروفیسر کو وہ بھاری بھر کم مجرب آدمی خاصا دلچسپ معلوم ہو رہا تھا۔ وہ اس کے ہر انکار پر معاوضہ کی رقم بڑھاتا جا رہا تھا۔ ہر پیش کش کے ساتھ وہ دولت کی اہمیت کا نیا پہلو پیش کرتا۔ آخر رقم کی تعداد ساڑھے تین ہزار تک پہنچ گئی۔ اس مرتبہ

وہ بولا۔

"ساڑھے تین ہزار میری آخری پیش کش ہے۔ اسے نہ قبول کرنے کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آتی۔ اس رقم سے آپ ائیر فرانس کا سیزنل ٹکٹ خرید کر یورپ کی سیر کر سکتے ہیں۔ ذرا غور تو کیجئے۔"

پروفیسر نے اس کی بات کاٹ دی۔ "اچھا ہوا کہ آپ نے آخری پیش کش کا اظہار کر دیا۔ میں اپنا آخری جواب دینے سے پہلے یہ کہنا چاہتا ہوں کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ آپ کل کانفرنس کی صدارت نہ کریں۔"

"ایسا بھی ہو سکتا تھا، مگر مشکل یہ ہے کہ کانفرنس کے منتظمین کا فنڈ کم پڑ گیا تھا لہٰذا وہ مجھ سے بیس ہزار کا عطیہ لے گئے ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ یہ عطیہ دینے کے بعد صدارت مجھ پر فرض ہو گئی ہے۔"

پروفیسر کا انداز ذرا بھی تبدیل نہ ہوا۔ ایک بار نہیں بار بار کہہ چکا ہوں، میں ہرگز ایسا نہیں کر سکتا۔ یہ میرے اصول کے خلاف ہے۔ سمجھے آپ؟"

"لیکن میں بیس ہزار کا نقصان بھی تو نہیں برداشت کر سکتا۔"

"مجھے آپ سے پوری پوری ہمدردی ہے۔"

ذرا دیر خاموش رہنے کے بعد وہ شخص بولا۔ "دیکھیے میں رقم میں مزید اضافہ نہیں کر سکتا۔ میرا تخمینہ اس سے زیادہ کی اجازت نہیں دیتا۔ کاروبار میں تخمینے کی اہمیت کا میں سختی سے قائل ہوں۔"

پروفیسر اس کی باتوں سے پہلے ہی کم حیرت زدہ نہیں تھا، یہ بات سن کر اچھل پڑا۔ "کانفرنس کی صدارت اور کاروبار سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔۔۔ یہ قطعی اور مہمل بات ہے ایسا ہرگز نہیں ہوتا۔"

وہ بے تکلفی سے مسکرا دیا۔ "فی الحال میں کچھ نہیں بتا سکتا۔ البتہ اگر کبھی وزیر بن گیا تو آپ کو یہ نکتہ سمجھا دوں گا۔ اس وقت تو آپ خطبہ صدارت لکھ دیجئے۔ یقین مانئے میں کسی اور کو بھی بلا سکتا تھا، مگر مجھے بتایا گیا ہے کہ اس شہر میں آپ سے بہتر اور کوئی ایسا قابل آدمی نہیں جو اس موضوع پر خطبہ صدارت لکھ سکے۔"

"بالکل غلط یہ ڈاکٹر نازش کی توہین ہے۔ وہ سماجی علوم کے ماہر ہیں۔ سوشیولوجی کے پروفیسر ہیں۔ میں تو انگریزی ادب پڑھاتا ہوں۔"

"یہ بات آپ نے پہلے کیوں نہ بتائی؟ اگر آپ تیار نہیں ہیں تو پھر میں انہی کو بلوائے لیتا ہوں۔"

پروفیسر چونک پڑا۔ "ہائیں' آپ اس وقت اس معزز شخص کو پریشان کریں گے۔ بہت ممکن ہے وہ ابھی تک اپنی لائبریری میں بیٹھا مطالعہ میں غرق ہو اور آپ کے یہ اجڈ مشٹنڈے جا کر اسے گرفتار کر کے یہاں لے آئیں' بالکل میری طرح۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ میں ایسی بات سننا بھی نہیں چاہتا۔"

"کیا کیا جائے' آپ تیار نہیں ہوتے' مجبوراً انہی کو بلوانا پڑے گا۔"

پروفیسر اور خفا ہو گیا۔ "میں حبس بے جا کا مقدمہ کر دوں گا۔"

"آپ چاہیں تو اقدام قتل کا الزام بھی میرے خلاف عائد کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ آپ کل کریں گے۔ میرا کام آج ہونا چاہیے۔ میں ابھی ڈاکٹر نازش کو بلاتا ہوں۔"

پروفیسر گھبرا گیا۔ اس نے قہر آلود نظروں سے اسے دیکھا اور اٹھ کر بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اس نے سوچا' یہ کتنا عبرت ناک منظر ہو گا۔ ڈاکٹر نازش کسی کتاب پر جھکا ہوا مطالعے میں محو ہو گا۔ اب تو رات آدھی کے قریب ہو گئی ہے۔ مطالعے میں جو لذت ہے' جو لطف ہے وہ اس وقت اپنے شباب پر ہوتا ہے۔ یہ کتنا ظلم ہو گا کہ ایسے عالم میں جب ڈاکٹر کسی خیال کو مکمل کرنے میں ڈوبا ہو' اچانک کھڑکی کے راستے تین دیو قامت مشٹنڈے کود کر کمرے میں داخل ہوں اور اسے زبردستی پکڑ کر اس آدمی کے پاس لے آئیں جو اپنے احمقانہ مشاغل کے لیے شریف شہریوں کو اس طرح پریشان کرتا ہے۔ اس نے قہر آلود نظروں سے اس شخص کو دیکھا اور زچ ہو کر بولا۔

"چلئے میں تیار ہوں' آپ کے بنگلے میں کوئی ایسا بھی کمرہ ہے جہاں میں یکسوئی سے بیٹھ کر لکھ سکوں۔"

"آپ اسٹڈی میں چلئے' لکھنے پڑھنے کے لیے اس سے بہتر جگہ اور کون سی ہو سکتی ہے؟"

پروفیسر چپ چاپ اس کے ہم راہ اسٹڈی میں چلا گیا۔ اس کمرے میں خوبصورت الماریوں کے اندر کتنی ہی قیمتی اور نایاب کتابیں قرینے سے سجی تھیں۔ اس میں بعض تو ایسی کتابیں تھیں جن کی تلاش میں وہ مہینوں سرگرداں رہا تھا۔ یہ بات بھی اسے سخت ناگوار گزری۔ کسی ایسے جاہل اور نامعقول شخص کے پاس ایسی نادر کتابوں کا ہونا' علم و ادب کی توہین ہے۔

وہ کچھ الٹے سیدھے پوائنٹ بتا کر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد پروفیسر نے کاغذ لیا اور انتہائی جھنجلاہٹ کے عالم میں لکھنا شروع کر دیا۔ کبھی اس کا جی چاہتا کہ لکھے ہوئے کاغذات چیر پھاڑ کر بھاگ جائے' زور زور سے چلانے لگے۔ کبھی وہ بے چینی سے اٹھ کر خارش زدہ کتے کی طرح کمرے میں چکر کاٹنے لگتا۔ دیر تک یہی سلسلہ چلتا رہا۔ لیکن جب وہ اسے مکمل کر چکا تو کسی قدر مطمئن تھا۔

اس نے خطبہ صدارت کو پر شکوہ اور بلند آہنگ الفاظ سے لغو اور مہمل بنانے میں اپنی طرف سے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ ایسے ایسے فلسفیوں کے نام لکھے تھے جن کی ابھی مائیں بھی پیدا نہیں ہوئی تھیں۔ ایسے ایسے دلچسپ انکشافات کئے تھے' ایسی ایسی عجیب و غریب اصطلاحات استعمال کی تھیں' جنہیں پڑھ کر وہ خود بھی مسکرانے لگا۔ بلکہ ایک بار تو اسے بے ساختہ ہنسی آ گئی اور دیر تک ہنستا رہا۔

جب وہ اسٹڈی سے باہر نکلا تو رات ڈھل چکی تھی۔ بنگلے پر گہرا سناٹا طاری تھا۔ مگر سماجی بہبود کی کانفرنس کے اجلاس کی صدارت کرنے والا ابھی تک جاگ رہا تھا۔ اس نے کاغذات سنبھالے اور پروفیسر کو اسی وقت اس کے گھر کار میں بھجوا دیا۔

رات بھر جاگنے کے باعث پروفیسر کے سر میں شدید درد ہو رہا تھا۔ آنکھیں سلگ رہی تھیں اور جسم ٹوٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے غسل کیا اور فوراً بستر پر جا کر سو گیا۔

اس روز خلاف معمول وہ دن بھر سوتا رہا۔ رات کو بھی جلد ہی سو گیا۔ صبح اٹھ کر اس نے گرم گرم چائے کی ایک پیالی پی۔ مگر ابھی تک اس کی طبیعت میں کسلمندی تھی۔ پچھلی رات کو نہ وہ چہل قدمی کے لیے گھر سے باہر نکل سکا تھا نہ مطالعہ کر سکا تھا۔ اپنے معمولات میں اتنی بڑی تبدیلی پر اسے غصہ بھی آیا۔ مگر یہ سوچ کر مطمئن ہو گیا کہ اس نے اپنی ہر ذہنی تکلیف کا انتقام لے لیا ہے۔ اب اسے اخبار کا انتظار تھا جس میں وہ کانفرنس کے اجلاس کی کارروائی دیکھنا چاہتا تھا جہاں وہ خطبہ پڑھا گیا ہوگا' جسے اس نے لغو اور بے سروپا بنانے کی پوری پوری کوشش کی تھی۔ اس نے سوچا' کتنا اچھا ہوتا کہ وہ خود اس اجتماع میں موجود ہوتا اور اپنی آنکھوں سے دیکھتا کہ صدر نے خطبہ صدارت شروع کیا' پہلے حاضرین چونکے' پھر حیرت زدہ ہوئے۔ رفتہ رفتہ سرگوشیاں شروع ہوئیں۔ لوگوں کے چہرے مسکرانے لگے۔ پھر ایک ایک جملے پر قہقہوں کی بارش' صدر کی بدحواسی' اس کا بار بار رومال سے پسینہ پونچھنا' واقعی یہ پر لطف نظارہ ہوتا۔ وہ خاموش بیٹھا ان تصورات سے لطف اٹھاتا رہا۔

اخبار آتے ہی اس نے سب سے پہلے کانفرنس کی خبر تلاش کی۔ اسے زیادہ وقت نہ ہوئی۔ پہلے ہی صفحے پر اسے نمایاں طور پر شائع کیا گیا تھا۔ لیکن چند ہی جملے پڑھے ہوں گے کہ اس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ لکھا تھا۔

''آج کا اجلاس بے حد کامیاب رہا۔ حاضرین نے جناب صدر کا فکر انگیز اور بصیرت افروز خطبہ صدارت پوری توجہ سے سنا' بار بار تالیاں بجا کر خراج تحسین پیش کیا۔''

وہ آگے نہ پڑھ سکا۔ جھنجھلا کر اخبار ایک طرف پھینکا اور جلدی جلدی کتابوں کی الماریوں میں سے اپنی ساری لغات اور فرہنگ نکالیں اور لفظ ''فکر انگیز'' اور ''بصیرت افروز'' کے معنی تلاش کرنے لگا۔ مگر ہر لغت میں' ہر فرہنگ میں وہی معنی درج تھے جو اس کے

ذہن میں تھے۔کوئی نئے معنی وہ تلاش بسیار کے باوجود نہ دیکھ سکا۔

اس نے اخبار اٹھا کر آگے پڑھا۔ ہر ہر جملہ خطبہ صدارت کی فضیلت اور بلاغت کی تعریف میں تھا۔ پروفیسر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔اس نے غیظ وغضب کے عالم میں اخبار کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے اور باؤلے کتے کی طرح کمرے میں چکر کاٹنے لگے۔مگر اس کی بے قراری کم نہ ہوئی۔ آخر وہ فرش پر سر کے بل کھڑا ہو گیا۔جب اس کا دماغ بوجھل اور پراگندہ ہوتا تو وہ یہی نسخہ آزماتا تھا۔مگر آج یوگا کے اس آسن سے بھی کام نہ چل سکا۔منٹ بھر بھی وہ آسن جمائے کھڑا نہ رہ سکا۔اس نے اٹھ کر کئی گلاس پانی کے پیئے اور پریشانی کے عالم میں گھر سے باہر نکل گیا۔

کوئی پندرہ منٹ بعد جب وہ واپس آیا تو اس کے ہم راہ ایک موٹا تازہ گدھا تھا۔ پاس پڑوس کے رہنے والے حیرت سے اسے دیکھ رہے تھے۔مگر وہ سب سے بے نیاز گدھے کو چکارتا ہوا گھر کے اندر لے آیا اور سیدھا مطالعے کے کمرے میں گیا۔اس نے دروازہ بند کیا۔گدھے کو جھک کر سلام کیا اور مودب ہو کر گویا ہوا۔

”قبلہ عالم! میں آج سے آپ کی شاگردی قبول کرتا ہوں۔عمر عزیز کے ۵۶ سال جو گمراہی اور کج فہمی میں گزرے ان کا مجھے مطلق افسوس نہیں۔استاد محترم! افسوس صرف اس بات کا ہے کہ میں نے آج تک آپ کی ذات والاصفات کو کیوں نہیں پہچانا؟“

یہ کہتے کہتے پروفیسر جوش عقیدت سے اس قدر سرشار ہوا کہ گدھے کے بالکل قریب پہنچ گیا۔خاموش کھڑے ہوئے گدھے کو نہ جانے کیا سوجھی۔اس زور سے دولتی جھاڑی کہ پروفیسر کا جبڑا اکھڑ گیا۔کئی دانت نکل کر باہر آ گئے۔

پروفیسر آج کل اسپتال میں ہے۔ ہر وقت نہ معلوم کیسی اوٹ پٹانگ باتیں کرتا ہے۔لوگ کہتے ہیں اس کا دماغ چل گیا ہے۔ لوگ کہتے ہیں تو پھر ٹھیک ہی کہتے ہوں گے۔

◆◆◆

خان بہادر

لائبریری سے پہلے کشادہ اور طویل گیلری تھی جس کی دیواروں پر ہالہ کے ماہر کاشی گروں کے بنائے ہوئے ٹائیل لگے تھے۔ روشنی کے لیے بلوری دیوار گیریاں تھیں اور چھت سے دو خوبصورت فانوس لٹک رہے تھے۔ رات کو دیوار گیریاں اور فانوسوں میں کافوری شمعیں روشن کر دی جاتیں تو گیلری کے در و دیوار جھلملاتی روشنیوں سے جگمگانے لگتے۔

گیلری میں سرخ ایرانی قالین کا فرش تھا۔ دیواروں پر جگہ جگہ خوبصورت طغرے اور مغلیہ فن مصوری کے اعلیٰ نمونے آویزاں تھے۔ ایک سلسلے سے مہاگنی اور ٹیک کی الماریاں رکھی تھیں۔ ان کے اونچے اونچے صاف شفاف دروازے شیشے کے تھے اور ہر دروازہ مقفل تھا۔ الماریوں کے اندر پرانی ساخت کی بندوقیں اور قرابین' مختلف وضع کی ڈھال اور تلواریں' چاندی اور پیتل کے شمع دان' چینی کے نفیس ظروف' کانسی اور پتھر کے چھوٹے بڑے مجسمے اور ایسی ہی دوسری نادر اشیاء موجود تھیں۔

ان نوادر کو اس سلیقے سے بنا سنوار کر رکھا گیا تھا کہ خوش ذوقی صاف جھلکتی تھی۔

سورج اب مغربی افق میں اتر گیا تھا۔ مگر ابھی پہر دن رہتا تھا۔ گیلری میں روشنی کم ہو گئی تھی۔ سناٹا بڑھ گیا تھا۔ ایک بوڑھے ملازم نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور مودب ہو کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ خان بہادر عبدالباری نے ہاتھ اٹھا کر اپنے معزز مہمان پیٹرو الفورڈ سے اندر داخل ہونے کا اشارہ کیا۔

والفورڈ ٹھٹکا' مسکرا کر خان بہادر کی جانب دیکھا اور خاموشی سے گیلری میں داخل ہو گیا۔ خان بہادر کا پرائیویٹ سیکرٹری دلشاد احمد بھٹی پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔

والفورڈ نے نظریں گھما پھرا کر گیلری کو دیکھا۔ بے ساختہ اس کی زبان سے نکلا۔ ''بہت شاندار''

خوشی سے خان بہادر کی باچھیں کھل گئیں۔

والفورڈ ہر الماری کے پاس جاتا' جھک کر ایک ایک چیز انہماک اور توجہ سے دیکھتا۔ ان کے بارے میں کرید کرید کر پوچھتا۔ خان بہادر بڑی مستعدی سے منہ ٹیڑھا کر کے انگریزی میں ایک ایک تفصیل بتاتا۔ بار بار کف افسوس مل کر کہتا۔

''افسوس کہ تقسیم سے قبل آپ سے ملاقات نہ ہوئی۔ اگر ہندوستان میں ملتے تو میں آپ کو اپنی آرٹ گیلری دکھاتا۔ میرے پاس

نوادرات کا ایسا بے مثل ذخیرہ تھا کہ باذوق لوگ دور دور سے اسے دیکھنے آتے تھے۔ یہاں تو کچھ بھی نہیں۔"

"مگر یہاں جو کچھ ہے، کم نہیں، بہت اہم اور دلچسپ ہے۔ میں ان سے بہت متاثر ہوا ہوں۔"

"کچھ تو میں کسی نہ کسی طور اپنے طور ساتھ لے آیا۔ کچھ یہاں خرید کر اکٹھا کئے ہیں۔" خان بہادر بار بار وضاحت کرتا۔ اسے مرعوب کرنے کے لیے بتاتا۔ "مجھے نوادرات سے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے۔ ہر چیز منہ مانگی قیمت دے کر خریدی ہے۔ یہ بھی مجھے غنیمت ہے۔ بمبئی میں ایک ہندو شرنارتھی مل گیا تھا۔ اس سے جائیداد کا تبادلہ کر لیا تو اتنا بھی ٹھکانہ ہو گیا۔ متروکہ جائیداد کے الاٹمنٹ کے چکر میں پڑتا تو سرکاری دفتروں کے طواف کرتے کرتے جوتے گھس جاتے۔ ایسے موقعے کی جائیداد اور زمین داری نہ ملتی۔ ویسے ہندوستان میں اتنی بڑی املاک اور اراضی چھوڑ کر آیا ہوں کہ اس کے مقابلے میں یہ کچھ بھی نہیں۔"

ایسے موقعے پر وہ ہمیشہ سخن سازی سے کام لیتا تھا اور یہ جھوٹ اتنی بار بول چکا تھا کہ اب تو اس کے اظہار میں ذرا بھی جھجک محسوس نہ ہوتی۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ اپنی جائیداد پہلے ہی ٹھکانے لگا چکا تھا۔ کچھ تو رہن تھی اور قرق ہو کر مہاجنوں کے قبضے میں جا چکی تھی۔ جو باقی رہ گئی وہ اس نے چھوٹے بھائی کے نام منتقل کر دی تھی۔ مگر اس کی دستاویزات کی نقلیں وہ اپنے ساتھ لایا تھا۔ ان میں وہ زرعی اراضی بھی شامل تھی جو زمین داری کے خاتمے کے قانون کے ساتھ ختم ہو گئی تھی اور اس کے عوض میں بانڈ مل گئے تھے۔ اس نے بانڈ بھی اونے پونے فروخت کر دیئے تھے۔ اس کے پاس جو دستاویزات تھیں ان میں ایسی بھی تھیں جو اس نے ایک ایسے شخص سے تیار کرائی تھیں جو جعلی دستاویزات تیار کرنے میں ماہر تھا۔ وہ اس صفائی سے مطلوبہ دستاویز بناتا تھا کہ نقل پر اصل کا گمان ہوتا تھا۔ انہی دستاویزات کی بنیاد پر اس نے اپنی متروکہ جائیداد اپنے نام الاٹ کرائی تھی۔

والفورڈ توجہ سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ بیچ بیچ میں کوئی سوال بھی کر لیتا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ خان بہادر کی خوشنودی حاصل کرنے کا خواہاں ہے۔

چلتے چلتے وہ ایک الماری کے سامنے پہنچ کر ٹھٹکا۔ صاف شفاف شیشے کے پیچھے ایک لمبی تلوار لٹکی ہوئے تھی۔ اس کا دستہ چاندی کا تھا اور اس پر طلائی نقش و نگار نہایت نفاست سے کندہ کیے گئے تھے۔ مگر دستہ جس قدر خوبصورت تھا تلوار اسی قدر بھدی تھی۔ اس پر جگہ جگہ سیاہ دھبے اس طرح نمایاں تھے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انہیں صاف کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ والفورڈ نے مڑ کر خان بہادر کی جانب دیکھا اور تلوار کی سمت اشارہ کرتے ہوئے اپنے تجسس کا اظہار کیا۔

"خان بہادر! اس تلوار پر یہ دھبے کیسے ہیں؟"

خان بہادر عبدالباری نے آگے بڑھ کر تلوار کو دیکھا' مسکرا کر بولا۔ "جی یہ خون کے دھبے ہیں۔"

"خون کے دھبے ہیں؟" والفورڈ نے حیرت زدہ ہو کر دریافت کیا۔

"بالکل خون کے دھبے ہیں۔" خان بہادر نے فخر سے سینہ تان کر مطلع کیا۔ "اس تلوار سے میرے دادا نے ۱۸۵۷ء کے غدر میں بارہ سو سے زائد باغیوں کو ہلاک کیا تھا۔"

"واقعی! بارہ سو سے زائد باغیوں کو ہلاک کیا تھا؟" والفورڈ نے آنکھیں پھاڑ کر یقین نہ آنے کے انداز میں اپنے ردعمل کا اظہار کیا۔

"بظاہر یہ بات بڑی حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے مگر یہ حرف بہ حرف صحیح ہے۔" خان بہادر کا سینہ اور تن گیا۔ "میرے دادا' صمصام الدولہ نواب عبداللہ خاں مرحوم غضب کے جری اور بے مثل شمشیر زن تھے۔ ان کی بہادری اور شمشیر زنی کے نہ جانے کتنے قصے مشہور ہیں۔ عالم ان کا یہ تا کہ شیر کا شکار ہمیشہ تلوار سے کیا اور تن تنہا کیا۔ نہ کبھی بندوق استعمال کی اور نہ مچان پر شکار کی گھات میں بیٹھے۔" اس کے لہجے میں طنطنہ پیدا ہو گیا۔ "میدان جنگ میں ہمیشہ دشمن کو للکار کر حملہ کرتے تھے۔ کبھی غافل پا کر وار نہیں کیا۔ یہ بارہ سو باغی بھی انہوں نے میدان جنگ میں اپنی شمشیر زنی کے جوہر دکھا کر تنہا ہلاک کئے تھے۔"

والفورڈ کو اس کے دعوے پر یقین تو نہ آیا مگر وہ اس کی کسی بات کی نفی نہ کرنا چاہتا تھا۔ اس نے خان بہادر کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔ "میں نے ہندوستانی غدر کے بارے میں ایک کتاب دیکھی تھی۔ یاد آتا ہے اس میں اس واقعے کا بھی ذکر تھا۔"

"اس کتاب کا نام کیا تھا؟" خان بہادر نے بے قرار ہو کر فوراً پوچھا۔ "میری نظر سے یہ کتاب نہیں گزری' میں اس خرید کر اپنی لائبریری میں رکھنا چاہتا ہوں۔"

"پرانی بات ہے' اس وقت مجھے اس کا نام یاد نہیں آ رہا۔" والفورڈ نے ٹالنے کی کوشش کی۔ ساتھ ہی اس نے خان بہادر کو اطمینان بھی دلایا۔ "میں واپس لندن جا کر اسے حاصل کرنے کی کوشش کروں گا اور آپ کو بھجوا دوں گا۔"

والفورڈ کی اس چرب زبانی پر خان بہادر کے نوجوان سیکرٹری نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی ضبط کی۔ لیکن خان بہادر کی گردن اونچی ہو گئی۔ سینہ کچھ اور تن گیا۔ اس نے نہایت طمطراق سے کہا۔ "اس واقعے کا ذکر آپ نے ضرور پڑھا ہو گا' یہ تو غدر کا بہت مشہور واقعہ ہے۔ میری لائبریری میں کئی ایسے مخطوطات ہیں جن میں اس واقعے کا تذکرہ موجود ہے۔ لیکن سب فارسی میں ہیں۔" اس نے

قدرے تامل کے بعد پوچھا۔ ''کیا آپ فارسی جانتے ہیں؟''

''میں بدقسمتی سے فارسی نہیں جانتا' لیکن یہ ضرور جاننا چاہوں گا کہ اتنا حیرت انگیز کارنامہ آپ کے دادا نے کس طرح انجام دیا۔''

''یہ واقعہ کچھ اس طرح پیش آیا کہ جس وقت برطانوی فوج کی ہندوستانی پلٹنوں میں بغاوت پھیلی تب میرے دادا قلعہ چاندگڑھ کے قلعہ دار تھے۔'' خان بہادر نے بڑے فخر سے والفورڈ کو مطلع کیا۔ ''باغی سپاہی میرٹھ سے نکل کر قتل و غارت گری کرتے ہوئے دہلی کی سمت بڑھے تو گرد و نواح کے علاقوں کے انگریزوں نے قلعہ چاندگڑھ میں آ کر پناہ لی۔ میرے دادا نے انہیں تحفظ کا یقین دلایا۔ وہ خود کو محفوظ بھی سمجھنے لگے تھے۔ ویسے چاندگڑھ بڑا مضبوط قلعہ تھا۔ مگر جب باغی فوج کا ایک دستہ چاندگڑھ کی جانب بڑھا تو ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز حکام کو پناہ گزیں انگریزوں کی فکر لاحق ہوئی۔''

''فکر کی بات ہی تھی۔ باغی بڑے سفاک اور بے رحم تھے۔'' والفورڈ نے اپنے فوری ردعمل کا اظہار کیا۔ ''انہوں نے عورتوں اور بچوں پر بھی ذرا رحم نہ کھایا۔ بلاامتیاز سب کو تہ تیغ کر دیا۔''

''بالکل درست فرمایا آپ نے۔ باغی اس قدر خونخوار اور وحشی تھے۔'' خان بہادر عبدالباری نے اس کی تائید کی۔ ''دادا مرحوم کو ایک پیغام رساں کے ذریعے جب انگریز حکام کی تشویش کا علم ہوا تو انہوں نے اسی پیغام رساں کو ایک خط دے کر فوراً واپس بھیجا۔ اس خط میں انہوں نے کمپنی بہادر کی حکومت سے اپنی وفاداری کے عہد کے ساتھ ساتھ یہ یقین دلایا تھا کہ باغی ان کی لاش پر سے گزر کر ہی قلعے میں داخل ہو سکتے ہیں۔ جب تک ان کی گردن پر سر ہے کسی انگریز پناہ گزین پر ذرا بھی آنچ نہیں آ سکتی۔ انہوں نے جیسا کہا تھا وہی کیا۔''

''کیا کیا انہوں نے؟''

''انہوں نے پہلا کام تو یہ کیا کہ باغیوں کو خبردار کیا کہ قلعہ چاندگڑھ کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا تو منہ کی کھانی پڑے گی۔'' خان بہادر عبدالباری نے پیٹر والفورڈ کو بتایا۔ ''مگر باغی باز نہ آئے۔ برابر آگے بڑھتے رہے اور قلعے کے سامنے پہنچ کر حملہ کرنے کے لیے صف آرا ہو گئے۔ لیکن ان کے حملہ آور ہونے سے پہلے میرے دادا نے خود قلعہ سے نکل کر حملہ کیا۔ ایسی بہادری سے لڑے کہ کشتوں کے پشتے لگا دیئے۔ کچھ تو ڈر کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ جو باقی رہ گئے ان کی تعداد بارہ سو سے اوپر تھی۔ دادا مرحوم اس قدر غیظ و غضب کے عالم میں تھے کہ ایک ایک باغی کو چن چن کر قتل کر دیا۔'' اس کی آواز میں بجلی کی سی کڑک پیدا ہو گئی۔ ''اس وقت ان کے ہاتھ میں یہی تلوار تھی اور اس پر جو خون لگا ہے وہ انہی مقتول باغی فوجیوں کا ہے۔ یہ بڑی یادگار تلوار ہے۔''

اس میں شک نہیں کہ خان بہادر عبدالباری کے دادا' قلعہ دار عبداللہ خاں' نے اس مرصع دستے والی تلوار سے باغی فوجیوں کو ۱۸۵۷ء میں موت کے گھاٹ اتارا تھا' لیکن روایت کچھ اس طرح ہے کہ باغیوں نے جب قلعہ چاندگڑھ کا محاصرہ کیا تو قلعہ دار عبداللہ خاں نے انہیں اپنی حمایت کا یقین دلایا اور قلعے میں موجود انگریزوں کو ان کی تحویل میں دینے کا وعدہ کیا۔ لیکن قلعے کا دروازہ کھولنے سے پہلے انہیں حیلے بہانے سے باہر ہی ٹھہرائے رکھا۔ ان کے لیے قلعے سے انواع واقسام کے عمدہ اور لذیذ کھانوں کے خوان بھیجے۔ ان میں عبداللہ خان نے زہر ملوا دیا۔ یہ سازش اس نے اس قدر ہوشیاری سے تیار کی تھی کہ باغیوں کو ذرا شبہ نہ ہوا۔ انہوں نے اس کھانے کو بہت رغبت سے کھایا۔ زہر اس قدر زود اثر تھا کہ کھانا کھانے کے بعد کوئی بھی زندہ نہ بچا۔ جب وہ موت کی نیند سو گئے تو اپنی بہادری کا سکہ بٹھانے کے لیے عبداللہ خاں نے رات کی تاریکی میں تلوار سے لاشوں کے ٹکڑے کر دیئے۔

والفورڈ الماری کے سامنے خاموش کھڑا رہا۔ خان بہادر الماری کے اندر رکھی ہوئی خون آلود تلوار کے بارے میں گردن اکڑا کر اور منہ ٹیڑھا کر کے بتاتا رہا۔ ”آخر جب باغیوں کو ہر محاذ پر شکست ہوئی۔ دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا اور ہر طرف امن وامان قائم ہوا تو یہ شاندار کارنامہ انجام دینے پر میرے دادا کو خلعت اور بہت بڑی جاگیر عطا ہوئی۔ اس وقت سے یہ تلوار ہمارے خاندان میں بیش بہا درثے کے طور پر محفوظ ہے۔“

اس دفعہ والفورڈ واقعی اس کی باتوں سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے اظہار عقیدت طور پر خون آلود تلوار کے سامنے سر جھکا دیا۔

دونوں آگے بڑھے۔ والفورڈ ہر الماری کے سامنے ٹھہرتا اور اس میں رکھے ہوئے نوادر کو دلچسپی اور توجہ سے دیکھتا۔ خان بہادر نے اسے طرح طرح کے وہ طلائی اور نقرئی تمغے دکھائے جو اسے اور اس کے بزرگوں کو تاج برطانیہ کی وفاداری اور خیر خواہی میں کار ہائے نمایاں انجام دینے کے صلے میں دیئے گئے تھے۔ تمغوں کے علاوہ کتنی ہی ایسی اسناد اور دستاویز بھی شیشوں کے پیچھے خوبصورت سنہری فریموں میں آویزاں تھیں جو انگریز حکام کی طرف سے ملی تھیں۔

خان بہادر عبدالباری ہر تمغے اور ہر سند کے متعلق تفصیل سے والفورڈ کو مطلع کرتا رہا۔ والفورڈ خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ وہ اب کچھ اکتایا ہوا اور تھکا تھکا نظر آ رہا تھا۔ مگر ایک الماری کے سامنے پہنچ کر وہ چونکا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کر حیرت سے دیکھا کہ مخمل کے ایک چمکدار اور نرم نرم پارچے پر پرانی وضع کا ایک جوتا نہایت اہتمام سے رکھا ہے۔ چمڑا سوکھ کر اس طرح سکڑ گیا تھا کہ جوتا ٹیڑھا میڑھا ہو گیا تھا۔ والفورڈ نے دریافت کیا۔ ”خان بہادر یہ جوتا ہی ہے یا کچھ اور؟“ اس کے لہجے سے استعجاب آشکارہ تھا۔

”ہے تو یہ جوتا ہی مگر یہ بہت بڑی خاندانی امانت ہے۔“ خان بہادر نے مسکین سی صورت بنا کر بتایا۔ ”دراصل اس جوتے کے

ساتھ ہمارے خاندان کی خوشحالی اور عظمت کی ایک دلچسپ داستان وابستہ ہے۔"

"کیا آپ اس کے بارے میں تفصیل سے کچھ بتانا پسند کریں گے؟" والفورڈ نے نرم اور شگفتہ لہجے میں اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

"اسے معلوم کر کے مجھے خوشی ہوگی۔"

"بات دراصل یہ ہے کہ میرے دادا نے بہت عیش و عشرت کی زندگی بسر کی۔ طرح طرح کے رئیسانہ مشاغل اور تفریحات پر بے دریغ خرچ کرنے کے ساتھ ساتھ فیاض بھی بہت تھے۔ ان کی کئی بیگمات تھیں اور ان سے بائیس اولادیں تھیں۔ ان کی بیشتر جائیداد اور جاگیر فضول خرچی کی بھینٹ چڑھ گئی۔ انتقال کے بعد انہوں نے جو جائیداد چھوڑی وہ بائیس اولادوں میں اس طرح تقسیم ہوئی کہ میرے والد کو ترکے میں جو کچھ ملا اس سے عزت کے ساتھ گزر بسر کرنا مشکل ہو گیا۔ وہ سخت پریشاں حالی اور تنگ دستی میں مبتلا تھے۔ مگر اس جوتے نے دست گیری کی۔ اس طرح سہارا دیا کہ ان کے دن پھر گئے۔ امراء اور رئیسوں میں ان کا شمار ہونے لگا۔ لاٹ گورنر کے دربار میں کرسی ملتی۔" خان بہادر اپنی بات کہتے کہتے کھل کر مسکرایا۔ "آج میرے پاس جو جائیداد اور جاگیر ہے وہ اسی جوتے کی کرامات ہے۔ اسے تو میں اپنی خاندانی وفاداری کے ثبوت میں انگریز حکام کے سامنے بطور خاص پیش کرتا تھا۔ سچ پوچھئے تو خان بہادر کا خطاب بھی مجھے اسی جوتے کے طفیل ملا۔ یہ خطاب مجھے اس قدر عزیز ہے کہ مسلم لیگ کا عہدیدار ہونے کے باوجود اسے اب تک چھوڑ نہیں سکا۔"

والفورڈ بھی چکرایا۔ بھلا یہ ٹیڑھا میڑھا سوکھا سڑا جوتا کسی کی کس طرح دست گیری کر سکتا ہے' تنگ دستی اور ابتلا کے شکنجے سے نکلنے میں سہارا دے سکتا ہے؟ لیکن اس نے اپنی ذہنی کشمکش کا اظہار نہ کیا۔ خاموش کھڑا جوتے کو تکتا رہا۔ اس کے چہرے کے بدلتے ہوئے رنگ سے خان بہادر فوراً بھانپ گیا کہ وہ کسی الجھن میں مبتلا ہے۔ اس نے برملا اس کا اظہار بھی کر دیا۔

"مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ آپ کسی الجھن میں مبتلا ہیں۔" اس نے کھنکار کر والفورڈ کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ "میں آپ کو زیادہ دیر اس الجھن میں مبتلا نہیں رکھنا چاہتا۔ کیوں نہ آپ کو کھل کر سب کچھ بتا دوں تا کہ آپ کو اندازہ ہو جائے کہ آپ کی قوم کے ساتھ میری وفاداری اور وابستگی کتنی پختہ اور دیرینہ ہے۔ یہ آئندہ کاروباری تعلقات میں بھی معاون و مددگار ثابت ہوگی' باہمی اعتماد مستحکم ہوگا۔"

"یقیناً' یقیناً" والفورڈ نے مسکرا کر تائید کی۔ "میں اسے بہت دلچسپی سے سننا چاہوں گا۔"

"ہوا یہ کہ جب والد مرحوم بہت پریشان ہو گئے تو انہوں نے انگریز حکام سے رجوع کرنے کی ٹھانی۔ انہی دنوں ایک نیا کمشنر علاقے میں تعینات ہوا۔ وہ بڑا دبنگ افسر تھا۔ نہایت اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں کا مالک تھا۔ فرائض منصبی کی ادائیگی دیانتداری سے کرتا

تھا۔اس کا کچھ تعلق شاہی خاندان سے بھی تھا۔ چنانچہ ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد جب واپس انگلستان گیا تو عمدہ کارکردگی اور گراں قدر خدمات کے صلے میں اسے نہ صرف سر کا خطاب ملا بلکہ ہاؤس آف لارڈز کا ممبر بھی بنایا گیا۔'' خان بہادر سنبھل سنبھل کر بولتا رہا۔'' والد مرحوم نے اس سے ملنے کی بہت کوشش کی مگر رسائی حاصل نہ ہوئی۔ آخر انہوں نے اس زمانے کے جہاں دیدہ درباروں کا آزمودہ نسخہ استعمال کیا۔''

''وہ کیا تھا؟'' والفورڈ نے بے چین ہو کر مداخلت کی۔

''والد مرحوم نے کمشنر کے ایک منہ چڑھے اردلی سے مراسم پیدا کئے۔ اس سے اپنا مدعا بیان کیا۔ دس روپے کا ایک نوٹ بخشش کے طور پر دیا۔ روپے پا کر وہ ایسا خوش ہوا کہ ان کی مدد کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ اس کے مشورے پر والد مرحوم نے کمشنر کو ڈالی پیش کی۔ اس میں قیمتی شرابیں تھیں۔ خشک میوے' تازہ پھل تھے' کیک تھا' طرح طرح کی دیسی اور ولایتی مٹھائیاں تھیں اور ایسی ہی دوسری اشیاء تھیں جو ڈالی میں شامل ہوتی ہیں۔ اتفاق سے کرسمس قریب تھا۔ ڈالی پیش کرنے کا نہایت مناسب جواز بھی تھا۔ ویسے ڈالی کسی بھی وقت پیش کی جا سکتی تھی مگر کرسمس کے موقع پر ڈالی پیش کرنے کا عام دستور تھا۔ اس چمکدار اور رنگ برنگی خوش نما کاغذوں سے سجایا جاتا تھا تاکہ زیادہ سے زیادہ دیدہ زیب نظر آئے۔''

''اس کے بارے میں کچھ میں نے بھی سنا ہے۔'' والفورڈ نے ایک بار پھر اپنی بے چینی کا اظہار کیا۔'' اب یہ بتایئے' بعد میں کیا ہوا؟''

''اردلی نے اس طرح ملاقات کی سبیل پیدا کی۔'' خان بہادر نے والفورڈ کو بتایا۔'' شام کا وقت ملاقات کے لیے مقرر ہوا۔ والد مرحوم نے وہ تمام تمغے اور سرٹیفکیٹ ایک بڑے ریشمی رومال میں لپیٹے جو ان کے بزرگوں کو وقتاً فوقتاً انگریز حکام کی جانب سے عطا کئے گئے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے ایک درخواست تیار کی جس میں سرکار برطانیہ کے ساتھ اپنی خاندانی وفاداری اور اعلیٰ خدمات بیان کی گئی تھیں۔ آخر میں اپنی پریشان حالی کا اظہار کرتے ہوئے اعانت کی اپیل کی گئی تھی۔'' خان بہادر نے کھنکار کر گلہ صاف کیا۔'' کمشنر اس وقت کمرے میں تنہا تھا اور اسکاچ سے شغل کر رہا تھا۔ والد مرحوم اس کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ جھک کر آداب کیا۔ رومال کھول کر درخواست نکالی اور درخواست کے ساتھ تمغوں اور سرٹیفکیٹوں کو بھی کمشنر کے سامنے پیش کر دیا۔ اس نے درخواست پڑھی۔ سرٹیفکیٹ الٹ پلٹ کر دیکھے۔ تمغوں کا بھی جائزہ لیا۔ والد مرحوم سے پوچھا۔ کیا چاہتے ہو؟ وہ ہاتھ باندھے' نظریں جھکائے خاموش کھڑے رہے۔ اس نے اصرار کیا' بار بار دریافت کیا۔ مگر کچھ ایسا رعب طاری ہوا کہ والد مرحوم کا منہ نہ کھلا۔ وہ

جھنجھلا کر چیخنے لگا۔ وہ پھر بھی ٹس سے مس نہ ہوئے۔ کمشنر اس وقت نشے میں دھت ہو رہا تھا۔ اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ وہ غصے سے دیوانہ ہو گیا۔ تلملا کر اٹھا۔ والد مرحوم کے قریب گیا اور ان کی کمر پر اس زور سے ٹھوکریں ماریں کہ وہ لڑکھڑا کر فرش پر منہ کے بل گرے۔"

"نہایت بے ہودہ اور بدتمیز شخص تھا۔" والفورڈ نے اپنی خفگی کا اظہار کیا۔

"تھا تو بہت بدتمیز اور مغلوب الغضب، مگر دل کا برا نہیں تھا۔" خان بہادر نے والفورڈ سے اتفاق رائے نہ کیا۔ "ٹھوکریں مارنے کے بعد وہ واپس جا کر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ والد مرحوم نے چیخ نہ چلائے اور نہ کسی برہمی کا اظہار کیا۔ خاموشی سے اٹھے۔ کپڑوں سے خاک جھاڑی اور سر جھکا کر خاموش کھڑے ہوئے۔ کمشنر کچھ دیر تو چپ بیٹھا رہا۔ گلاس اٹھا کر اسکاچ کے گھونٹ بھرتا رہا۔ پھر اسے خود ہی اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس نے والد مرحوم سے پوچھا۔ ول عبدل! ہم نے کتنی ٹھوکریں تم کو ماریں؟ والد مرحوم نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا۔ حضور! چھ ٹھوکریں تو مجھے یاد ہیں۔ آگے آپ کو خبر ہوگی۔ اس نے ہنس کر کہا۔ "جاؤ تم کو چھ گاؤں بخش دیے۔"

"چھ گاؤں دے دیئے؟" والفورڈ نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ "اتنی بڑی جاگیر! وہ ان کو مل گئی تھی؟"

"جی ہاں پورے چھ گاؤں۔" خان بہادر نے اپنی بات پر زور دے کر بتایا۔ "کمشنر نے درخواست پر اسی وقت حکم بھی جاری کر دیا۔ اس زمانے میں انگریز حکام کو بے پناہ اختیارات حاصل تھے۔ ان کا حکم ہی قانون تھا۔ اپنی مرضی کے مالک تھے۔"

"مگر یہ جوتا۔۔۔۔۔۔؟" والفورڈ نے الماری میں رکھے ہوئے بدوضع جوتے کی جانب اشارہ کیا۔ "میں اس کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔"

"میرے والد نے ایک بار پھر جھک کر کمشنر کو آداب کیا۔ جان و مال کی سلامتی کی دعائیں دیں اور ہاتھ باندھ کر اس کے روبرو مئودب کھڑے رہے۔ کمشنر نے پوچھا۔ ول عبدل! اب تم کیا چاہتے ہو؟ اوہ معاف کیجئے، میں یہ تو بتانا بھول ہی گیا کہ میرے والد کا نام عبدالرحمن تھا۔ انہوں نے کمشنر کی بات سن کر نہایت ادب سے کہا، سرکار! یہ جوتا مجھے عنایت کر دیا جائے، بڑی نوازش ہوگی۔ میں اسے قیمتی یادگار کے طور پر اپنے پاس رکھنا چاہتا ہوں۔ ان کی یہ بات سن کر اس نے زور کا قہقہہ لگایا۔ اس قدر خوش ہوا کہ دو گاؤں جاگیر میں اور بڑھا دیئے۔ یہ جوتا پیر سے اتارا اور والد مرحوم کو دے دیا۔"

عین اس وقت خان بہادر عبدالباری نے اپنی پشت پر لمبی سانس بھرنے سرسراہٹ محسوس کی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ نوجوان پرائیویٹ سیکرٹری خاموشی سے مڑا۔ خان بہادر نے اسے ٹوکا۔

''دیکھو یہ جوتا کس قدر خراب حالت میں ہے۔'' اس نے شیشے کے پیچھے رکھے ہوئے جوتے کی جانب ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مدت سے اس پر توجہ نہیں دی گئی۔ اسے نکال کر کسی ملازم کو دو کہ جھاڑ پونچھ کر پالش کر دے۔'' پرائیویٹ سیکرٹری نے مستعدی سے اسے یقین دلایا۔ ''سر! جیسا آپ نے حکم دیا ہے ویسا ہی ہوگا۔'' وہ آگے بڑھا اور گیلری سے باہر چلا گیا۔

خان بہادر چند لمحے خاموش رہنے کے بعد والفورڈ کی جانب متوجہ ہوا۔ ''میرے والد نے انتقال سے قبل یہ وصیت کی تھی کہ اس جوتے کو قیمتی اثاثے کے طور پر نہایت حفاظت سے رکھا جائے اور جب کوئی انگریز افسر تمہارے گھر آئے تو اسے یہ جوتا ضرور دکھانا اور اس کا پس منظر بھی بتانا۔ یہ انگریزوں کے ساتھ ہماری وفاداری کی یادگار ہے۔'' اس نے گہری سانس بھری۔ ''مگر اب نہ انگریزوں کی حکومت رہی نہ انگریز افسر رہے۔ آپ یہاں آئے تو عرصہ دراز بعد مجھے اس کے بارے میں کچھ بتانے کا موقع ملا۔''

والفورڈ خاموش رہا۔ خان بہادر بڑھ کر دوسری الماری کے پاس پہنچا۔ والفورڈ اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ اس کے استفسار پر خان بہادر الماریوں میں رکھے ہوئے نوادر کے متعلق بتاتا رہا۔ دونوں آہستہ آہستہ باتیں کرتے رہے۔

گیلری سے نکل کر دونوں لائبریری میں پہنچے۔ لائبریری جس کمرے میں تھی وہ زیادہ وسیع نہ تھا۔ اس کمرے میں بھی الماریاں تھیں اور الماریوں کے اندر سلیقے سے کتابیں سجی ہوئی تھیں۔ ان میں بعض قلمی نسخے بھی تھے۔ کتابوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ مدت سے الماریوں کو کھولا بھی نہیں گیا۔

لائبریری کی چھت سے خوبصورت بلوری جھاڑ لٹک رہا تھا۔ قالین کا فرش تھا۔ وسط میں چمکتی دمکتی خوش نما میز تھی۔ ایک گوشے میں صوفہ سیٹ تھا۔ اس کے قریب دیوار پر دو شمع دان آویزاں تھے۔ لائبریری کی الماریوں میں تالے نہیں تھے۔ والفورڈ ایک الماری کے قریب پہنچا۔ کتابیں دیکھتے دیکھتے اس نے الماری کا پٹ کھولا۔ انگریزی کی ایک کتاب نکالی۔ ورق گردانی کی تو یہ عقدہ کھلا کہ اب تک کسی نے کتاب کھول کر پڑھنے کی زحمت گوارا نہ کی تھی۔ جلد بندی کے دوران جو اوراق ایک دوسرے سے چسپاں رہ گئے تھے، وہ ابھی تک جوں کے توں تھے۔ نہ کتاب زیر مطالعہ آئی نہ اوراق کاٹ کر علیحدہ کئے گئے۔

خان بہادر قریب ہی کھڑا تھا۔ اس نے یہ صورت احوال دیکھی تو بہت خفیف ہوا۔ اس نے فوراً بات بنائی۔ ''یہ کتاب میں شوق سے خرید کر لایا تھا مگر طرح طرح کی مصروفیات میں کچھ ایسا الجھا رہا کہ اسے پڑھنے کی فرصت ہی نہ ملی۔''

''کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔'' والفورڈ نے مسکرا کر اس کی تائید کی اور کتاب الماری میں وہیں رکھ دی جہاں سے اٹھائی تھی۔

کتابوں کے مطالعے سے نہ والفورڈ کو دلچسپی تھی اور نہ ہی خان بہادر کو۔ اس کی دلچسپی صرف مخطوطات اور قلمی نسخوں سے تھی جن کی

خاطر اس نے لائبریری کا اہتمام کیا تھا۔ وہ لائبریری میں صرف اسی وقت جاتا تھا جب کوئی خاص مہمان آتا۔ وہ اسے بڑے فخر سے قلمی نسخے اور مخطوطات دکھاتا۔ ان کے بارے میں تفصیل سے بتاتا۔ لائبریری سے دراصل اسے اتنا ہی لگاؤ تھا۔ وہ اب تک خاندانی رئیسوں اور امراء کی اس وضع داری کو نباہ رہا تھا جب لائبریری کی موجودگی امارت اور خوش ذوقی کی علامت سمجھی جاتی تھی۔

مخطوطات اور قلمی نسخے فارسی میں تھے یا اردو میں۔ والفورڈ دونوں ہی زبانوں سے نابلد تھا۔ البتہ ان کی خطاطی میں اس نے دلچسپی کا اظہار کیا۔ وہ زیادہ دیر لائبریری میں نہ ٹھہرا۔

لائبریری کے آگے اونچی شہ نشین تھی۔ صاف ستھرے فرش پر میز اور کرسیاں قرینے سے رکھی تھیں۔ دونوں لائبریری سے گزر کر شہ نشین پر پہنچے۔ والفورڈ نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

''لائبریری خاص طور پر آپ کی آرٹ گیلری بہت شاندار ہے۔ اسے دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی۔ آپ نے خوش ذوقی کا مظاہرہ کیا ہے۔''

''اگر آپ اس جگہ کو پہلے دیکھتے تو بڑی مایوسی ہوتی۔'' خان بہادر نے اسے بتایا۔ ''یہ عمارت ہمیشہ سے ایسی نہ تھی۔ یہ ایک سندھی بنئے کی حویلی تھی۔ بنیوں کے پاس پیسہ آ گیا مگر رہنے سہنے کا ڈھنگ اب تک نہ آیا۔ حویلی کیا تھی' بالکل کبوتروں کی ڈھابلی لگتی تھی۔ اسے توجگہ جگہ سے توڑ پھوڑ کر میں نے اپنی مرضی کے مطابق تبدیلیاں کرائی ہیں۔ وقت بھی بہت لگا اور خرچ بھی بہت آیا۔ مگر اب یہ اس قابل ہوگئی ہے کہ میں آپ جیسے کسی معزز مہمان کو یوں خوش آمدید کہہ سکتا ہوں۔''

دونوں گفتگو کر رہے تھے کہ اسی اثناء میں ایک ملازم نے اسکاچ وہسکی کی بوتل' گلاس اور جگ میں پانی رکھ دیا۔ اس نے دو پیگ بنائے اور دونوں کے سامنے رکھ دیے۔ انہوں نے گلاس اٹھا کر آہستہ سے ٹکرائے اور ایک ایک گھونٹ بھرا۔

یہ گلابی جھاڑوں کی ایک خوشگوار شام تھی۔ آفتاب ابھی غروب نہیں ہوا تھا۔ ہلکی ہلکی سنہری دھوپ درختوں کی بلندی پر جگمگا رہی تھی۔ لحیم شحیم والفورڈ کے سامنے پستہ قد خان بہادر عبدالباری حقیر اور کم تر نظر آ رہا تھا۔ مگر وہ بہت مسرور تھا۔ عرصہ دراز بعد اسے ایسا قدردان ملا تھا جس کے سامنے وہ اپنی امارت اور خاندانی وجاہت کا مظاہرہ کر سکتا تھا۔ وہ بات بات پر بے تکلفی سے قہقہے لگاتا اور اپنے بزرگوں کی رئیسانہ شان وشوکت کا تذکرہ کرتا۔

لیکن والفورڈ کو خان بہادر کی خاندانی عظمت سے زیادہ اپنے اس صنعتی منصوبے کی فکر تھی جس کے بارے میں وہ خان بہادر سے تفصیل کے ساتھ بات چیت کرنا چاہتا تھا۔ وہ ایک بڑی برطانوی فرم کا ڈائریکٹر تھا اور اس کے ایشیائی امور کا انچارج تھا۔ اس کی فرم

کے سائیگان میں کئی کارخانے تھے' لیکن ویتنام کی جنگ نے شدت اختیار کی اور حالات روز بروز بد سے بدتر ہونے لگے تو دوسرے غیر ملکی اداروں کی طرح اس کی فرم نے بھی کارخانے بند کر کے کاروبار سمیٹنا شروع کر دیا تھا۔ اب وہ بورڈ آف ڈائریکٹرز کے فیصلے کے مطابق ایسے ممالک میں سرمایہ کاری کرنے کا جائزہ لے رہا تھا جہاں اس کے مفادات محفوظ ہوں۔ اس سلسلے میں وہ پاکستان بھی آیا تھا۔ خان بہادر سے چند ہی روز قبل ایک مشترکہ شناسا کی وساطت سے ملاقات ہوئی تھی۔ خان بہادر بھی بعض بڑے زمیں دار خاندانوں کی اتباع میں زمینداری کے ساتھ ساتھ صنعت کار بننے کے بارے میں سنجیدگی سے غور کر رہا تھا۔

والفورڈ نے گلاس اٹھایا۔ وہسکی کی چسکی لگائی اور چہرے پر سنجیدگی طاری کرتے ہوئے گویا ہوا۔ ''میں نے اپنے ایک پروجیکٹ کا جو خاکہ دیا تھا' میرا خیال ہے اس پر آپ اچھی طرح غور کر چکے ہوں گے۔''

''میں نے اسے دیکھا تھا بلکہ اپنے منیجر سے اس کے بارے میں مشورہ بھی کیا تھا۔'' خان بہادر نے بتایا۔ ''مگر آپ کا منصوبہ کچھ جچا نہیں۔ کاسمیٹکس کے علاوہ کیا دوسری اشیاء کی پیداوار کے لیے کارخانہ نہیں لگایا جا سکتا؟''

''کیوں نہیں لگایا جا سکتا؟'' والفورڈ نے کھل کر اختلاف رائے نہ کیا۔ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''مگر ایشیا کے دوسرے پسماندہ ممالک کی طرح اس ملک کی کالی کلوٹی اور بدصورت عورتوں کے لیے سنگھار اور زیبائش کا ساز و سامان بھی ایک اہم بنیادی ضرورت ہے۔ سوسائٹی میں عورت کی اہمیت کا انحصار بڑی حد تک اس کے حسن پر ہوتا ہے۔ کامیاب زندگی گزارنے کے لیے یہ اس کا بہت موثر حربہ ہوتا ہے۔''

اس نے گلاس اٹھا کر وہسکی کا گھونٹ بھرا۔ ''میری فرم نے ایک بین الاقوامی ایجنسی کے ذریعے سرمایہ کاری کے امکانات کے بارے میں جو سروے کرایا تھا اور اس سروے میں جو اعداد و شمار پیش کیے گئے ہیں' ان کے مطابق یہاں ہر سال کئی ملین روپے کا کاسمیٹکس کا سامان بیرونی ممالک سے امپورٹ کیا جاتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس ملک میں ایسی اشیاء کی کتنی کھپت ہے۔ پیداوار تو اسی مال کی کی جاتی ہے جس کی بازار میں مانگ ہو۔ یہ تو کاروبار کا بنیادی اصول ہے۔'' والفورڈ نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے ایک بار پھر کہا۔ ''درحقیقت اس ملک کی کالی کلوٹی اور بدصورت عورتوں کے لیے تو۔۔۔۔۔۔''

''آپ نے اس ملک کی عورتوں کو ابھی دیکھا کہاں ہے۔'' خان بہادر نے فوراً مداخلت کی۔ ''یہاں بھی بہت حسین عورتیں ہوتی ہیں اور بہت گوری چٹی بھی ہوتی ہیں۔ یہ جو آپ کو دیہات میں کالی کلوٹی اور بدشکل عورتیں نظر آتی ہیں' ان کے لیے تو کالا کلوٹا اور بدصورت ہونے ہی میں عافیت ہے۔ اگر اتفاق سے کوئی خوبصورت ہوئی تو وہ وڈیرے کے چنگل سے نہیں بچتی۔ وہ اسے اٹھوا کر داشتہ

بنالیتا ہے۔ کسی ہاری یا کسان کے لیے تو خوبصورت لڑکی عذاب ثابت ہوتی ہے۔ نہ عزت محفوظ نہ جان و مال۔'' اس نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ ''میں تو آپ کو یہ مخلصانہ مشورہ دوں گا کہ کاسمیٹکس کے چکر میں نہ پڑیئے۔ یہ ہمارا بنیادی مسئلہ نہیں ہے۔ آپ کے ملک کے حالات اور ہیں اور ہمارا سب سے سنگین مسئلہ تو سیم و تھور ہے۔''

''سیم اور تھور تو بہت سنگین مسئلہ ہے او وہ ہمارے دائرہ کار سے باہر ہے۔'' والفورڈ نے صاف گوئی سے اپنی محدودات کا اظہار کیا۔ ''لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آپ کے ملک کی زرعی معیشت ہے۔ ہم کو اس پہلو سے اپنے منصوبوں کو دیکھنا ہو گا۔ اس سلسلے میں آپ کی اور کیا بنیادی ضروریات ہیں؟''

''اچھی کھاد نہیں ملتی۔ یہ بھی بنیادی ضرورت ہے۔''

والفورڈ نے کچھ نہ کہا' خاموش بیٹھا رہا۔ قدرے توقف کے بعد اس نے خان بہادر کو مخاطب کیا۔ ''مسٹر باری! فرٹیلائزر فیکٹری لگانے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟''

''یہ بات کہی آپ نے دل کو لگتی۔'' خان بہادر چہک کر بولا اور کرسی پر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اس نے وہسکی کی چسکی لگائی۔ ''میرے ذہن میں پہلے ہی ایک ایسا منصوبہ تھا۔ بلکہ صاف بات یہ ہے کہ میرے ایک قریب عزیز نے اس کی طرف توجہ بھی دلائی تھی۔ وہ ماہر معاشیات ہے اور اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز ہے۔ مجھے اس کا مشورہ ایسا مناسب معلوم ہوا تھا کہ میں نے یہیں اپنے علاقے میں فرٹیلائزر فیکٹری لگانے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا شروع کر دیا۔ اس کے لیے قطعہ اراضی کا بھی بندوبست کر لیا۔''

''یہ آپ کی اپنی اراضی ہے؟''

''ہے تو یہ شاملات کی زمین مگر میں نے اسے مستاجری پر حاصل کر لیا ہے۔ ویسے یہ زرعی اراضی ہے مگر اسے کمرشل میں تبدیل کرانا مشکل نہیں ہوگا۔ اس سلسلے میں متعلقہ افسران سے پہلے ہی بات کر چکا ہوں۔'' خان بہادری عبدالباری نے بات کرتے کرتے نشے کی دھن میں یہ بھی بتا دیا۔ ''اس پر کچھ لوگوں نے ناجائز قبضہ کر رکھا ہے۔ مگر میں نے انہیں بے دخل کر کے زمین اپنے قبضے میں لینے کا کام شروع کر دیا ہے۔''

''کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوگی؟'' والفورڈ نے دبی زبان سے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔

خان بہادر کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس مرحلے پر کسی ایسی بات کا اظہار والفورڈ کے سامنے قطعی نامناسب تھا۔ خان بہادر نے مسکرا کر فوراً اسے اطمینان دلایا۔ ''آپ اس کی بالکل فکر نہ کریں۔ کسی قسم کی گڑبڑ نہیں ہوگی۔ میرا قانونی حق ہے اور ان کا قبضہ

بالکل ناجائز ہے۔ خیر یہ کام تو ہو جائے گا۔ مگر اتنا بڑا کارخانہ لگانے کے لیے جتنے بڑے سرمائے کی ضرورت ہے وہ نہ میرے پاس ہے اور نہ ہی حکومت اور مقامی بینک اس سلسلے میں مدد کرنے کی پوزیشن میں ہیں۔"

"سرمائے کی آپ پروا نہ کریں۔ اس کا بندوبست ہماری فرم کرے گی۔" والفورڈ نے اسے یقین دلایا۔" آپ سے ابتدائی امور طے ہو جائیں تو میں جلد ہی اس کی فیزی بیلٹی تیار کرانے کا کام شروع کرا دوں گا۔" والفورڈ کا گلاس خالی ہو چکا تھا۔ وہ بوتل اٹھا کر اپنے لیے پیگ بنانے لگا۔

سورج اب مغربی افق پر سنہرے تھال کی مانند نظر آ رہا تھا۔ دھوپ مٹیالی پڑ گئی تھی۔ سائے پھیلتے جا رہے تھے۔ شام کی آمد آمد تھی۔ یکا یک دلشاد احمد بھٹی ایک طرف سے نمودار ہوا۔ وہ بہت گھبرایا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ خان بہادر نے اسے پریشانی کے عالم میں دیکھا تو اپنی تشویش کا اظہار کیا۔

"دل شاد! تم کچھ گھبرائے ہوئے نظر آ رہے ہو۔۔۔۔۔۔۔ خیریت تو ہے؟"

دل شاد بھٹی نے کوئی جواب نہ دیا۔ خاموشی سے آگے بڑھا۔ خان بہادر کے قریب پہنچا اور دھیمے لہجے میں بتانے لگا۔"سر! جس بات کا مجھے خطرہ تھا وہی ہوا۔ ہمارے کارندے زمین پر قبضہ کرنے کے لیے پہنچے تو جو لوگ اس پر قابض ہیں وہ مزاحمت پر آمادہ ہو گئے۔ وہ مرنے مارنے پر کمربستہ ہیں۔ انہوں نے جگہ جگہ مورچے بنا کر رکھے پتھراؤ کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ سب کلہاڑیوں سے مسلح ہیں۔"

"کیا صورت حال بہت سنگین ہو گئی ہے؟" خان بہادر نے دریافت کیا۔

"جی ہاں، بہت سنگین ہو گئی ہے۔" پرائیویٹ سیکرٹری دلشاد احمد بھٹی نے مطلع کیا۔" ہمارے کارندوں کے مقابلے میں ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔"

"کیا کارندے مسلح ہو کر نہیں گئے تھے؟"

"سب بندوقوں سے مسلح ہیں۔" دلشاد نے خان بہادر کو بتایا۔

"منیجر علی نواز جویا کہاں ہے؟"

"میں نے انہیں صورت حال کی نزاکت سے مطلع کیا تو وہ فوراً اسی طرف چلے گئے۔ میرا خیال ہے وہ اب تک وہاں پہنچ چکے ہوں گے۔"

''سالے کمینوں کی یہ ہمت' وہ ہیں کس ہوا میں۔'' خان بہادر نے غضب ناک ہوکر کہا۔ ''منیجر کو جا کر میرا یہ حکم پہنچاؤ۔ اگر سیدھی انگلیوں سے گھی نہ نکلے اور وہ سرکشی سے باز نہ آئیں تو گولی چلوادی جائے۔ جیسے بھی بنے ان کو قابو کیا جائے۔ کسی طرح نرمی نہیں ہونی چاہیے۔ بندوقوں کی باڑھ پر رکھ کر ایک ایک حرام زادے کو گولیوں سے اڑا دیا جائے۔''

ناگاہ شام کے سناٹے میں بندوقیں چلنے کی خوفناک آوازیں ابھریں۔ ان کے ساتھ ساتھ زور زور سے چیخنے چلانے کی آوازیں بھی سنائی دیں۔

والفورڈ نے حواس باختہ ہوکر خان بہادر سے پوچھا۔ ''یہ بندوق چلنے کی آوازیں ہیں؟ مجھے کچھ ایسا ہی محسوس ہو رہا ہے۔ بہت سے لوگوں کے چیخنے چلانے کا شور بھی سنائی دے رہا ہے۔''

''جی ہاں' یہ بندوقوں کی ہی آوازیں ہیں۔'' خان بہادر نے صاف گوئی سے کام لیا۔ ''وہ لوگ جنہوں نے ناجائز قبضہ کر رکھا ہے' زمین خالی کرنے میں کچھ مزاحمت کر رہے ہیں۔''

''اوہ...... یہ تو آگ یہاں تک پہنچ گئے۔'' والفورڈ کے چہرے پر خوف کے سائے پھیل گئے۔

''آپ مطلق فکر نہ کریں۔ ایسا تو اکثر ہوتا رہتا ہے۔ کوئی خاص بات نہیں۔'' خان بہادر نے مسکرا کر بے نیازی کا مظاہرہ کیا۔

والفورڈ نے کسی ردعمل کا اظہار نہ کیا۔ فائرنگ کی آوازیں رک رک کر ابھر رہی تھیں اور چیخنے چلانے کا شور بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ یکا یک والفورڈ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ بہت دہشت زدہ نظر آ رہا تھا۔

خان بہادر نے مسکرانے کی کوشش کی۔ ''مسٹر والفورڈ! آپ کھڑے کیوں ہو گئے؟ ابھی تو آپ سے فیکٹری لگانے کے پراجیکٹ کے بارے میں بہت سی ضروری باتیں کرنی ہیں۔''

''مجھے افسوس ہے کہ اس وقت میں کوئی بات نہیں کر سکوں گا۔''

''ارے آپ تو خواہ مخواہ پریشان ہو گئے۔''

والفورڈ نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے پرائیویٹ سیکرٹری کو مخاطب کیا۔ ''مسٹر بھٹی! آپ میرے ساتھ آیئے۔''

''پلیز' میری بات تو سنئے۔''

خان بہادر نے والفورڈ کو روکنے کی کوشش کی۔ مگر اس نے ایک نہ سنی۔ مڑا اور آگے بڑھا۔ دلشاد احمد بھٹی اس کے ساتھ ساتھ چلا۔ دونوں دیکھتے ہی دیکھتے خان بہادر کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ خان بہادر نے گلاس اٹھایا اور ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔

گولیوں کی تڑتڑ اور انسانی آوازوں کا شور کچھ اور بڑھ گیا تھا۔خان بہادر خاموش بیٹھا پیچ وتاب کھاتا رہا۔فضا میں بارود کی بو رچی ہوئی تھی۔شام کا دھندلکا ہر طرف پھیل گیا تھا۔آخر بے چین ہو کر خان بہادر اٹھ کھڑا ہوا اور اس سمت چلا جدھر والفورڈ اور دل شاد بھٹی گئے تھے۔

وہ کچھ ہی دور گیا تھا کہ سامنے سے دل شاد آتا ہوا نظر آیا۔خان بہادر رک کر اس کا انتظار کرنے لگا۔دل شاد قریب آیا تو اس نے پوچھا۔"کیا مسٹر والفورڈ چلے گئے؟"

"جی ہاں وہ اپنی کار میں بیٹھ کر چلے گئے۔"

"کچھ بتا کر گئے ہیں کہ ان سے کب ملاقات ہوگی؟"

"وہ بہت دہشت زدہ اور پریشان لگ رہے تھے۔" دل شاد نے مطلع کیا۔"میں نے آئندہ ملاقات کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے صرف اتنا کہا کہ فی الحال اس کا کوئی امکان نہیں' میں صبح کی فلائیٹ سے واپس لندن جا رہا ہوں۔"

"یہ سالا کوئی خاندانی انگریز نہیں تھا۔ضرور اس کے نطفے میں فرق ہوگا۔یہ تو بہت بزدل نکلا۔" خان بہادر نے جھنجھلا کر اپنے فوری ردعمل کا اظہار کیا۔"سالے کی اتنے سے واقعے سے سٹی گم ہوگئی۔ایک انگریز وہ تھے جو اپنے سامنے کھڑے ہو کر گولی چلواتے تھے۔مجال ہے کہ ذرا بھی چہرے سے پریشانی یا خوف آشکارہ ہو۔جبھی تو اس شان سے حکومت کی کہ ان کے نام سے رعیت کا دم نکلتا تھا۔بڑے بڑوں کا پتا پانی ہو جاتا تھا۔" اس نے گہری سانس بھری۔"وہ بھی کیا دن تھے۔"

دل شاد بھٹی خاموش رہا۔شام کا اندھیرا بڑھ گیا تھا۔گولیاں چلنے کی آوازیں اب بند ہو گئے تھیں۔چیخنے چلانے کا شور بھی سنائی نہیں دے رہا تھا۔ہر طرف گہری خاموشی چھائی تھی۔

خان بہادر بوجھل قدموں سے چلتا ہوا راہداری میں داخل ہوا۔دھندلی دھندلی روشنی میں ایک ملازم فرش پر بیٹھا پرانے اور بدوضع جوتے کو پالش کر کے چمکانے کی کوشش کر رہا تھا۔خان بہادر قریب پہنچا تو ملازم گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔خان بہادر عبدالباری نے جوتے کو غور سے دیکھا۔مگر اس کے بارے میں کوئی بات نہ کی۔خاموشی سے پرائیویٹ سیکرٹری کے ہمراہ آگے بڑھ گیا۔

◆◆◆

غزل اس نے چھیڑی

ذکر تھا مشاعروں کا۔۔۔۔۔۔بات گھوم پھر کر پہنچی سخن فہمی تک۔دو گھنٹے کی بحث کا یہ نتیجہ نکلا کہ شعر کہنے کے لیے اگر خون جگر صرف کرنا پڑتا ہے تو سخن فہمی میں دماغ کی چولیں ہل جاتی ہیں۔مصرعہ اٹھانا اور بھی مشکل مسئلہ ہے۔اس سلسلے میں مجھے ایک واقعہ یاد آتا ہے۔رفاہ عام کلب لکھنو میں بزم مشاعرہ منعقد تھی۔شمع ثاقب لکھنوی کے سامنے آئی۔انہوں نے ''صدا دینے لگے' دعا دینے لگے'' کی زمین میں غزل پیش کی۔مشاعرہ واہ واہ اور سبحان اللہ کی آوازوں سے گونج رہا تھا۔آخری شعر کا جب انہوں نے مصرعہ اولی پڑھا۔

آئینہ ہوتا اگر میرا عشق ان کے حسن کا

سامعین میں سے کسی نے مصرعہ اٹھایا۔''آئینہ ہو جائے میرا عشق ان کے حسن کا'' ثاقب مرحوم نے نظر اٹھا کر مصرعہ اٹھانے والے کی جانب دیکھا۔زیر لب تبسم فرمایا' قدرے تامل کیا اور پھر انہی صاحب کو مخاطب کر کے شعر پڑھا۔

آئینہ ہو جائے میرا عشق ان کے حسن کا
کیا مزا ہے درد میں جب خود ہی دوا دینے لگے

مشاعرہ ختم ہوا تو ثاقب لکھنوی نے ان صاحب کو جا کر گلے سے لگا لیا۔گفتگو ہوئی تو معلوم ہوا کہ انہوں نے زندگی میں کبھی ایک شعر نہیں کہا۔البتہ شعر سننے کا شوق جنون کی حد تک تھا۔صرف مشاعرہ سننے کی غرض سے بنارس سے لکھنو آئے تھے۔

اب تو وہ مشاعرے ہی نہ رہے۔شاعر مائیکروفون پر غزلیں پڑھتے ہیں۔ان کی آواز تو سامعین تک پہنچ جاتی۔مگر دوسری جانب کی آواز نقار خانے میں طوطی کی صدا بن کر رہ جاتی۔ورنہ ایک زمانہ تھا کہ مشاعروں میں اساتذہ اپنے شاگردوں کے جم غفیر کے ساتھ آتے تھے۔مصرعہ زبان سے نکلا اور اٹھانے والوں نے اٹھایا۔داد و تحسین کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔رعایت لفظی' صوتی حسن' زبان' قافیہ' روزمرہ' محاورہ' شعر کا کون سا پہلو تھا جسے اجاگر نہ کیا جاتا۔غالب نے اسی لیے اہل فن سے شکوہ کیا تھا۔

مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

نوحہ گر کا ذکر آ گیا ہے تو لگے ہاتھوں ایک واقعہ اور سن لیجیے۔۱۹۴۳ء میں الہ آباد جانے کا اتفاق ہوا' نوح ناروی سے نیاز حاصل

کرنے کا اشتیاق کشاں کشاں امتیاز منزل (ان کے مکان کا صحیح نام مجھے یاد نہیں) لے گیا۔ حضرت نوح بڑی خندہ پیشانی سے پیش آئے۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ آخر دبی زبان سے میں نے کلام سننے کا اشتیاق ظاہر کیا' مگر وہ ٹال گئے۔ بڑا تعجب ہوا۔ سنا تو یہ تھا کہ وہ سخن فہموں کو ڈھونڈ کر لاتے ہیں اور اپنا کلام ذوق وشوق سے سناتے ہیں۔ آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ ادھر سے اصرار' ادھر سے انکار۔ اسی اثناء میں ایک صاحب کمرے میں داخل ہوئے۔ چھریرا جسم' چہرہ پر چگی داڑھی' آنکھوں میں دنبالہ سرمہ' کلے میں پان' صاف ستھرا مکلف لباس' اس طرح پھونک پھونک کر قدم رکھتے تھے گویا بتاشوں پر چل رہے ہوں۔ ان کے آتے ہی محفل کا رنگ بدل گیا۔ ناخدائے سخن حضرت نوح ناروی نے بلا کسی تمہید کے بیاض نکالی اور غزل شروع کر دی۔ لیکن تخاطب انہی صاحب سے تھا۔ حضرت نوح ناروی نے مطلع پڑھا۔

کسی بے درد کو ظلم و ستم کا شوق جب ہو گا
یہ میرا ایک دل لاکھوں دلوں میں منتخب ہو گا

وہ صاحب اچھے بھلے بیٹھے حقے سے شوق فرما رہے تھے۔ مطلع کا پہلا مصرعہ سنتے ہی ایک بارگی زمین سے کئی بالشت اوپر اچھل گئے اور دونوں ہاتھوں سے کلیجہ تھام کر نعرہ لگایا۔

"ہائے کیا ظالم شعر نکالا ہے!"

نوح ناروی نے مطلع مکمل پڑھا۔ اس دفعہ انہوں نے اور بھی جگر دوز نالہ بلند کیا اور لقا کبوتر کی طرح فرش پر لوٹنے لگے۔ بار بار کہتے تھے۔

"بس بھیا' اب نہیں سنا جاتا۔ ہائے' کیا بات پیدا کی ہے۔۔۔۔۔۔۔ کسی بے درد کو ظلم وستم کا شوق جب ہوگا"

انہوں نے صرف ایک مصرعے کو خدا جھوٹ نہ بلوائے کوئی بیس مرتبہ تو پڑھا ہوگا۔ عالم یہ تھا کہ آنکھوں سے اشک جاری' زبان پر اف اور ہائے' مٹھیاں بھنچی ہوئیں۔ ان پر وجد کی سی کیفیت طاری تھی۔

پوری غزل گھنٹہ بھر میں ختم ہوئی۔ وہ تمام وقت آہیں بھرتے رہے۔ فرش پر زخمی پرندے کی طرح پھڑکتے رہے۔ کبھی منہ پیٹتے کبھی سینہ۔ اسی عالم میں جب انہوں نے زور سے ہائے کر کے آنکھیں بند کر لیں تو میں واقعی گھبرا گیا۔ بات یہ تھی کہ انہی دنوں شاہجہاں پور کی ایک خبر اخبارات میں شائع ہوئی تھی کہ کسی بزم سماع میں قوالوں نے مشہور شاعر بیدم وارثی کے عارفانہ کلام کا یہ شعر لہک لہک کر گایا۔

آتے ہیں ہنسانے کو، جاتے ہیں رلانے کو
اس آنے کو کیا کہیے، اس جانے کو کیا کہیے

مشائخ میں سے ایک بزرگ تڑپ اٹھے۔ ان پر ایسا حال طاری ہوا کہ عالم وجد میں ان کا وصال ہو گیا۔

میں نے سوچا' کہیں ایسا نہ ہو کہ زمین شق ہو جائے اور اس میں سے ایک ہاتھ بلند ہو زیر زمین سے یہ صدا بلند ہو۔

"بس! میرا پردہ نہ فاش کر"

اور یہ صاحب واقعی داغ مفارقت نہ دے جائیں۔ پولیس علامہ نوح ناروی کے ساتھ مجھے بھی گواہی میں نہ کھینچے۔

بہر حال یہ حقیقت ہے کہ ان صاح کی نوحہ گری نے سماں باندھ دیا۔ یہ بات دوسری ہے کہ ان صاحب کو دنیا میں اور کوئی کام نہیں تھا۔ صرف نوح ناروی کا کلام سنتے تھے۔ کھانا ان کے ساتھ کھاتے تھے۔ رہنے کو مکان بھی نوح صاحب نے دے رکھا تھا۔ اوپر کے اخراجات کے بھی کفیل تھے۔ معلوم نہیں کہ اب بھی وہ نوحہ گری کا شغل فرماتے ہیں یا خدانخواستہ کسی دن فنافی الشعر ہو گئے۔

اسی قبیل کے ایک سخن شناس سے ہردوئی میں ملاقات ہوئی۔ وہ ادھیڑ عمر تھے۔ عرف عام میں مرزا صاحب کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ تقریب ملاقات یہ ہوئی کہ ضلع کچہری میں میرا ایک مقدمہ تھا' سننے میں آیا کہ جج بڑا اخر دماغ ہے۔ جھل کھا گیا تو مقدمہ ستیاناس کر کے رکھ دے گا۔ لوگوں نے مرزا صاحب کا نام لیا اور یہ مشورہ دیا کہ اگر وہ سفارش کر دیں تو کام سولہ آنے بن جائے گا۔ بڑی مشکل سے ان کے مکان کا پتہ ملا۔ مکان کا ہے کو تھا' کسی قدیم عمارت کا کھنڈر معلوم ہوتا تھا جس کے ایک حصے میں انہوں نے ٹاٹ کے پردے ڈال کر چاردیواری کھڑی کر لی تھی۔

اتفاق سے وہ اس وقت گھر پر موجود تھے۔ پہلی ہی آواز پر برآمد ہوئے۔ حلیہ یہ تھا کہ بدن پر بوسیدہ بنیان' گھٹنوں تک اونچا تہبند' خشخشی ڈاڑھی جو پان کی پیک سے لالہ زار ہو رہی تھی۔

میں نے موصوف کو دیکھا تو دل میں شک پڑ گیا۔ سوچا' بھلا اس ٹٹ پونجیے کو کون خاطر میں لائے گا۔ بہر حال ان سے ملا۔ حرف مدعا بیان زبان پر لایا۔ مسکرا کر بولے۔ "ناحق اس قدر پریشان ہوئے۔ میاں! اس سے تو کان پکڑ وا کے تمہارا کام کروا دوں گا۔" ان کے اس طنطنے سے شک اور قوی ہو گیا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ پیشی کے دن انہیں ساتھ لے کر عدالت میں حاضر ہوا۔

مرزا صاحب نے جج کو کئی بار جھک جھک کر آداب کیا۔ مسکرائے بھی' بار بار سامنے سے گزرے۔ جج نے مطلق توجہ نہ دی' ذرا گھاس نہ ڈالی۔ میں نے دیکھا' بات بنتی نظر نہیں آتی۔ پیش کار کو دو روپے دے کر مقدمہ کی تاریخ بڑھوا دی۔ پہلے تو مرزا صاحب منع

کرتے رہے پھر نیم رضامند ہو گئے۔ واپسی پر کہنے لگے۔

"تم دل چھوٹا نہ کرو' یہ دو روپے بھی اسی مرغی والے سے وصول نہ کیے تو مرزا نہ کہنا' میراثی کہنا۔ ذرا شام کو گھر آ کر تماشا دیکھنا۔"

شام کو ان کے گھر جانے کو دل نہ چاہتا تھا مگر اس خیال سے چلا گیا کہ جھوٹے کو اس کی منزل تک پہنچا دوں۔ جاڑے کا موسم تھا۔ میں سر شام ہی ان کے گھر پر جا دھمکا۔ انہوں نے گھر کے اندر ایک تنگ سی کوٹھری میں مجھے بٹھا دیا۔ اس وقت وہ جلال میں تھے۔ بات بات پر تاؤ آ جاتا۔ تیوری پر بل ڈال کر کہتے۔ "آ خر اس نے مجھے سمجھا کیا ہے' جج ہو گا اپنے گھر کا۔ جسے غرض ہو گی' دس دفعہ یہیں آئے گا۔"

اسی طرح باتیں کرتے کرتے نو بج گئے۔ میں نے عاجز آ کر اٹھنا چاہا تو انہوں نے اصرار کر کے روک لیا۔ اسی اثناء میں دروازے پر دستک ہوئی۔

مرزا صاحب کے لڑکے نے آ کر بتایا کہ جج صاحب کا نوکر آیا ہے۔ آپ کو بلایا ہے۔ انہوں نے کہلوا دیا۔ "ملازم سے جا کر بتا دو کہ میری طبیعت آج کچھ ناساز ہے۔" ذرا دیر بعد انہوں نے پھر کسی کو بھیجا۔ مگر مرزا صاحب نے دہلیز سے باہر قدم نہ نکالا۔ وہیں بیٹھے بیٹھے پیغام بھیجتے رہے۔

بیس منٹ کے اندر اندر معلوم ہوا کہ جج صاحب بنفس نفیس دروازے پر کھڑے ہیں۔ مگر مرزا صاحب ٹس سے مس نہ ہوئے۔ بیٹھے بڑبڑاتے رہے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ان کے پاس کون سا نقش سلیمانی ہے' جو جج صاحب کو یوں کشاں کشاں کھینچ لایا۔ میں ابھی اس راز پر غور ہی کر رہا تھا کہ باہر سے جج صاحب کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہے تھے۔

"میں نے بستر منگوا لیا ہے' اب یہیں دھرنا دے کر بیٹھ جاتا ہوں۔"

یہ گویا انتہا تھی۔ آخر میرے بہت سمجھانے بجھانے پر مرزا صاحب باہر گئے۔ دیر تک گلہ شکوہ ہوا۔ بات صرف اتنی تھی کہ جج صاحب نے گزشتہ شب نئی غزل کہی تھی۔ ہر دوئی بھر میں ان کو صرف مرزا صاحب سخن فہم ملے تھے۔ اب یہ کیسے ممکن تھا کہ غزل کہی جائے اور مرزا صاحب سے داد وصول نہ کی جائے۔ یہ تو ایسا ہی تھا کہ نیکی کر کے دریا میں ڈال دی جائے۔

بہر صورت مرزا صاحب کی سخن فہمی آڑے آ گئی اور پہلی ہی پیشی پر مقدمہ میرے حق میں خارج ہو گیا۔

فیض آباد کے ایک حکیم صاحب تھے' جن کے متعلق مشہور تھا کہ ان کے پاس کوئی ملازم ہفتہ بھر سے زیادہ نہ ٹکتا تھا۔ چند ہی دن میں بھاگ کھڑا ہوتا۔ سنا ہے حکیم صاحب کام تو کم لیتے تھے مگر غزلیں زیادہ سناتے تھے۔

صفی لکھنوی سے ایک واقعہ منسوب ہے۔ نوجوانی کا عالم تھا۔ ایک روز کہیں سے تھکے ہارے گھر لوٹ رہے تھے۔ اچانک سامنے نظر پڑی۔ دیکھا' شوق قدوائی کی فٹن آ رہی ہے۔ دیکھتے ہی ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ گھبرا کر ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ قریب ہی برگد کا گھنا پیڑ تھا۔ لپک کر اس کے تنے کی اوٹ میں دبک گئے۔ مگر بچ نہ سکے۔ ذرا ہی دیر بعد فٹن درخت کے نیچے آ کر ٹھہر گئی۔ صفی مرحوم نے گردن اٹھا کر دیکھا' شوق قدوائی فرشتہ اجل کی طرح سر پر کھڑے ہیں۔ ہنس کر فرمایا۔

''تم نے سوچا تھا کہ بچ کر نکل جاؤ گے۔ یہ خبر ہی نہ تھی کہ میں نے دور ہی سے تم کو دیکھ لیا تھا۔ چلو ابھی میرے ساتھ۔''

صفی بیچارے بڑے پریشان ہوئے۔ بہت عذر پیش کئے مگر بات بن نہ سکی۔ آخر عاجز آ کر بولے۔ ''صبح کا گھر سے نکلا ہوں' لحظہ بھر کو جا کر صورت تو دکھا آؤں۔ ورنہ گھر والے نہ جانے کیا سوچیں گے۔'' شوق قدوائی نے یہاں بھی نکلنے نہ دیا۔ اپنے ساتھ فٹن میں بٹھایا اور خود مکان کے دروازے تک گئے۔ ان کو اندر جانے نہ دیا۔ کہنے لگے۔ ''تم پھر ہاتھ نہیں آؤ گے۔'' بادل نخواستہ صفی نے دروازے ہی پر سے آواز لگائی۔

''ارے بھئی' سن رہے ہو؟''

اندر سے بیوی نے پوچھا۔ ''یہ آپ دروازے پر کھڑے کیوں آوازیں لگا رہے ہیں؟ اندر کیوں نہیں آ جاتے؟''

صفی بولے۔ ''اندر کیسے آؤں' گرفتار کر لیا گیا ہوں۔''

انہوں نے گھبرا کر پوچھا۔ ''اے ہے' خیریت تو ہے؟''

کہنے لگے۔ ''بس خیریت ہی ہے' میرا کہنا سنا معاف کرنا۔ یہی کہنے آیا تھا۔ شوق قدوائی کے ساتھ جا رہا ہوں۔''

شوق قدوائی مسکرا کر بولے۔ ''تم اب بہت تیز ہوتے جا رہے ہو۔'' قدرے تامل فرمایا' پھر گویا ہوئے۔ ''بہار ادب کے سالانہ مشاعرے کے لیے نئی غزل کہی ہے اور بڑی مشکل زمین میں کہی ہے۔ جی چاہا کہ پہلے تم کو سنا دوں۔'' صفی دم بخود بیٹھے رہے۔ شوق قدوائی نے کوچوان کو اشارہ کیا۔ فٹن آگے بڑھی۔ صفی لکھنوی ان کے ساتھ روانہ ہو گئے۔

کچھ اسی نوعیت کا حادثہ میرے ایک دوست کے ساتھ پیش آیا۔ اودھ کے ایک رئیس تھے۔ جنہیں اور بہت سے رئیسانہ چونچلوں کے ساتھ ساتھ شعر کہنے کا بھی مراق تھا۔ ان کے لیے سخن فہم ڈھونڈ ڈھونڈ کر مہیا کئے جاتے۔ مضافات لکھنو میں رہتے تھے۔ لہٰذا شہر سے سخن شناسوں کو درآمد کیا جاتا۔ اسٹیشن پر ان کے آدمی لگے رہتے۔ ادھر ٹرین سے کوئی خوش پوش اترا اور انہوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ گھیر گھار کر تعلق دار صاحب کی حویلی پر لے آئے۔

میرے دوست کا بیان ہے کہ وہ بھی اس چکر میں پھنس گئے۔ گئے تھے کسی مریض کی عیادت کو مگر راستہ ہی میں تعلق دار صاحب کے حواریوں سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ انہوں نے ایسا نرغے میں لیا کہ سیدھے حویلی پہنچے۔ وہاں ان کے لیے ہر طرح کے تکلفات مہیا کئے گئے۔ لیکن جب انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کی اتنی ضخیم بیاض سے غزلیں سننا پڑیں تو دماغ کی چولیں تک ہل گئیں۔ بڑی مشکل سے دو بجے رات کو جان چھوٹی۔

بستر پر جا کر لیٹے تو تھوڑی ہی دیر بعد یہ عقدہ کھلا کہ باہر سے قفل ڈال دیا گیا ہے۔ دن بھر نگرانی ہوتی رہی۔ دو آدمی منکر نکیر کی طرح ہر وقت آگے پیچھے لگے رہتے۔ دوسرے ہی دن زندگی وبال جان ہوگئی۔ نکلنے کے تمام راستے بند تھے۔ چند ہی روز میں رنگ زرد پڑ گیا۔ راتوں کو گڑگڑا کر دعا مانگتے کہ اے پروردگار! اس مصیبت سے نجات دلا۔ آخر ایک روز اللہ کا نام لے کر رات کے پچھلے پہر دوسری منزل کی کھڑکی سے چھلانگ لگا دی۔ خیریت ہوئی کہ زمین نرم اور پولی تھی۔ لہٰذا ہاتھ پاؤں ٹوٹنے سے بچ گئے۔ واپس گھر پہنچے تو حلیہ یہ تھا کہ نہ سر پر ٹوپی' نہ پیر میں جوتا۔ کپڑے مٹی کی رنگت ہو گئے تھے۔ بلا ٹکٹ سفر کرنے کے جرم میں ایک رات حوالات میں بھی بند رہے۔

لکھنو میں ایک شاعر تھے' پرنس ہادی مرزا' خود کو نواب واجد علی شاہ کا پوتا بتاتے تھے۔ وضع داری کا یہ عالم تھا کہ جاڑا' گرمی' برسات' کوئی بھی موسم ہو' ان کی وضع قطع میں سرمو فرق نہ آتا۔ سر پر سیاہ مخمل کی چوگوشیہ ٹوپی۔ بدن پر جامہ دار کی اچکن' پیر میں ایک برکا کھلا پاجامہ' ہمیشہ گھیتلی جوتی پہنتے تھے اور شانوں پر کڑھا ہوا رومال پڑا ہوتا۔ وثیقہ دار بھی تھے۔ لیکن وثیقہ اتنا قلیل تھا کہ مشکل سے گزر بسر ہوتی تھی۔ زود گو اس غضب کے تھے کہ روزانہ ایک نہیں کئی غزلیں کہہ لیتے تھے اور ان غزلوں کو بڑے تکلف سے سناتے تھے۔ ہاتھ جوڑ کر عجز و انکسار کا اظہار کرتے۔ جھک جھک کر آداب بجالاتے' بار بار کہتے۔ "بندہ کس قابل ہے' حضور کی ذرہ نوازی ہے۔" غزل ختم ہوتے ہی دوسری کے لیے زمین ہموار کرنا شروع کر دیتے۔

آندھی آئے' پانی آئے' مگر پرنس ہادی مرزا ہر شام بلا ناغہ مہلا و دیالہ کالج کے سامنے والے چائے خانہ میں شعر سناتے نظر آتے تھے۔ انہی کے ہم راہ ایک اور شاعر کو دیکھا تھا۔ احقر رضوی تخلص فرماتے تھے۔ کچھ اس قسم کے شعر کہتے تھے۔

زلفیں سنواریئے مرا احوال ہے سو ہے
تم کو کسی کے حال پریشاں سے کیا غرض

ان کو بھی شعر سنانے کا عارضہ تھا۔ کسی مقامی اخبار میں کام کرتے تھے۔ ایک بار اخبار میں ہڑتال ہوگئی۔ سنا ہے کہ ہڑتالیوں کے

مطالبات میں ایک مطالبہ یہ بھی شامل تھا کہ احقر رضوی پر یہ پابندی عائد کی جائے کہ دفتر میں بیٹھ کر غزلیں نہ سنایا کریں۔ وہ ان دنوں نخاس میں رہتے تھے۔ دفتر سے ہمیشہ یکے پر واپس جاتے تھے۔ یکے والے انہیں دیکھتے ہی دور سے آوازیں لگانا شروع کر دیتے۔ اڈے پر اچھی خاصی گڑبڑ مچ جاتی۔ آخر وہ کسی نہ کسی یکے پر سوار ہو جاتے۔ جب ذرا فاصلہ طے ہوتا تو یکے والا غزل سنانے کی فرمائش کرتا۔ وہ تھوڑا بہت تکلف کرنے کے بعد شروع ہو جاتے۔ یکے پر سے اترتے تو ہمیشہ ڈبل کرایہ ادا کرتے۔

سننے میں آیا ہے کہ ایک بار تین نئی غزلیں سنا کر انہوں نے یکے والے کو صرف کرایہ دیا تو وہ ان کے سر ہو گیا' کہنے لگا۔ ''میاں! یہ تو مزدوری کے پیسے ہوئے اور وہ جو آدھی درجن گجلیں سنی ہیں ان کا کرایہ؟'' یکے والی کی بدذوقی پر وہ اس قدر دل برداشتہ ہوئے کہ پاکستان ہجرت کر گئے۔ احباب سے رخصت ہوتے وقت انہوں نے آبدیدہ ہو کر کہا تھا۔

''بھئی لکھنؤ میں اب رہنے کا بھرم نہیں رہا۔ یہاں اب جوہر شناس نہیں رہے۔''

جن لوگوں کو نواب جعفر علی خان اثر سے ملنے کا اتفاق ہوا وہ سخن فہموں کی قدر شناسی کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ میں نے ۱۹۴۸ء میں لکھنؤ سے ایک ادبی ماہنامہ نکالا۔ اس سلسلے میں اثر صاحب کی خدمت میں بھی حاضر ہوا۔ میرے ایک دوست بھی ہم راہ تھے۔ اثر صاحب کے دیرینہ نیاز مند تھے۔ اکثر ان کے دولت کدے پر حاضر بھی ہوتے رہتے تھے۔ ادب نواز اور سخن شناس بھی تھے۔

جس وقت ہم دونوں پہنچے تو نو یا دس بجے دن کا وقت تھا۔ تکلفاً کلام سنانے کی درخواست کی جسے اثر صاحب نے بلا کسی عذر کے قبول بھی کر لیا۔

غزلوں کا دور شروع ہوا تو دوپہر ہو گئی۔ کھانا آ گیا۔ کھانے سے فارغ ہوتے ہی نظموں کا دور چلا۔ سہ پہر ہوئی۔ چائے پینے کے بعد مضامین کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ رات ہو گئی۔ پھر کھانا آیا۔ اس سے فارغ ہوئے تو ترجمے سننا پڑے۔ رات کے پچھلے پہر جب گلو خلاصی ہوئی تو شہر سنسان پڑ چکا تھا۔ دوست کا مکان نزدیک تھا۔ ان کو تو یہ صحبت زیادہ مہنگی نہ پڑی۔ لیکن مجھے لگ بھگ پانچ میل پیدل چلنا پڑا تو طبیعت ہری ہو گئی۔

یہ تو غزل گو شعرا کی باتیں تھیں۔ نظم کہنے والے بھی کبھی کبھی اس علت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ سلام مچھلی شہری اردو کے نامور شاعر تھے۔ بڑی خوبصورت نظمیں کہتے تھے۔ ان کے متعلق ایک لطیفہ بیان کیا جاتا ہے۔ شان نزول اس کی یوں ہے کہ ایک بار سلام نے ایک طویل نظم کہی اور اسے سنانے صاحبزادہ محمود الظفر کے پاس پہنچے۔ وہ ان دنوں یو پی کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکرٹری تھے۔ بے حد مصروف اور وقت کے پابند آدمی تھے۔ سلام نے جا کر ان کو اپنی نظم سنائی۔ نظم آزاد تھی۔ محمود الظفر کو یوں بھی شاعری سے کوئی خاص

شغف نہیں تھا۔ آزاد نظم اور بھی بار خاطر گزری۔ آدھی نظم تو انہوں نے بڑے صبر و سکون کے ساتھ سنی۔ اس کے بعد اپنی بیوی ڈاکٹر رشید جہاں کو آواز دی۔ ''ارے بھئی! رشیدہ' ذرا آ کر سلام کی یہ نظم سن لو۔ مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔'' انہوں نے مزید کچھ نہ کہا اور اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ کہنے والوں کا کہنا ہے کہ کچھ دیر بعد ڈاکٹر رشید جہاں نے یہ ڈیوٹی کامریڈ نعیم کے سپرد کی اور خود کسی مریض کو دیکھنے چلی گئیں۔

یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب میں لکھنو میں تھا' کراچی آ کر معلوم ہوا کہ شعر سنانے کا مرض اور سخن فہموں کی قدر و منزلت یہاں اور بھی زیادہ ہے۔

میں یہاں کے ایک ایسے شاعر کو جانتا ہوں' جو بڑی صاف ستھری اور پاکیزہ غزلیں کہتے ہیں۔ بظاہر خاصے سمجھدار نوجوان ہیں۔ سرکاری ملازم ہیں۔ رہنے کو حکومت نے کوارٹر بھی دے رکھا ہے۔ مگر رہائش کے لیے تیرے میرے در جھانکتے پھرتے ہیں۔ ان کے کوارٹر میں ایک میر صاحب اپنے پورے ٹبر کے ساتھ عرصہ دراز سے فروکش ہیں۔ وہ صرف اس لیے کوارٹر خالی نہیں کرا سکتے کہ میر صاحب سخن فہم ہیں۔ ان کی غزلیں سنتے ہیں اور اس ڈھب سے داد دیتے ہیں کہ شاعر صرف خواب دیکھتا ہے اور میر صاحب لمبی تان کر سوتے ہیں۔

یہ بھی کراچی ہی کا واقعہ ہے۔ ایک بار عارف جلالی کے ساتھ ایک شاعر سے ملاقات ہوئی۔ شیدا گجراتی تخلص کرتے ہیں۔ بڑے اصرار سے ایک چائے خانے میں لے گئے۔ ترنم سے غزل شروع کی۔ ابھی مطلع ہی پڑھا تھا کہ چائے خانے کے بیرے نے آ کر مداخلت کی۔ ''سیٹھ بولتا ہے یہاں قوالی نہ گاؤ۔'' مجبوراً اٹھنا پڑا۔ چند روز بعد پھر اس چائے خانے میں جانے کا اتفاق ہوا۔ میں نے دیکھا کاؤنٹر کے پیچھے آویزاں تختی میں ترمیم کر دی گئی تھی۔ لکھا تھا۔

''یہاں شراب پینا' سٹہ کھیلنا اور قوالی گانا منع ہے''

چلتے چلتے ایک ٹیپ کا بند بھی سن لیجئے۔ الہ آباد کے ایک شاعر ہیں۔ جب تک ہندوستان میں رہے صرف غزلیں کہتے رہے اور داد وصول کرتے رہے۔ کراچی آئے تو پیٹ پوجا کے لیے کلرکی کرنا پڑی' لیکن شاعری کی چاٹ نہ چھوٹی۔ غزل کہنا تو چھوڑ دی۔ مگر سننے کا شوق بدستور قائم رہا۔ چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہیں جاتا والی بات تھی۔ شعرائے کرام ان کے یہاں جاتے' غزلیں سناتے' داد وصول کرتے' چائے اور سگریٹ پیتے۔

بے فکروں کی بن آئی۔ لیکن چند ہی ماہ بعد کلرک بیچارے کی بیوی کے زیورات بکنے کی نوبت آ گئی۔ انہی دنوں ایک شاعر مجھے

ان کے مکان پر لے گئے۔ وہ بڑی خندہ پیشانی سے پیش آئے۔ میرے شاعر دوست نے حسب معمول ذرا دیر تکلف سے کام لیا۔ پھر کھنکار کر گلا صاف کیا اور یوں گویا ہوئے۔ ''کل رات کچھ شعر ہو گئے تھے۔'' یہ کہہ کر انہوں نے آہستہ آہستہ گنگنانا شروع کیا۔ مگر میزبان نے فوراً ٹوکا۔

''میں ابھی آیا۔''

وہ گھر کے اندر چلے گئے۔ ذرا دیر بعد ایک چھپا ہوا کارڈ ہاتھ میں دبائے ہوئے واپس آئے۔ کہنے لگے۔ ''غزل بعد میں پڑھنا پہلے اسے دیکھ لو۔'' شاعر نے اسے پڑھا تو چہرہ غصے سے سرخ پڑ گیا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر کاغذ لے لیا۔ یہ ریٹ کارڈ تھا جس پر لکھا تھا۔

غزل (تحت اللفظ) زیادہ سے زیادہ دس شعر۔۔۔۔۔۔۔ایک روپیہ

غزل (ترنم کے ساتھ)۔۔۔۔۔۔۔ایک روپیہ آٹھ آنے

نوٹ: دس اشعار کے بعد فی شعر چار آنے مزید معاوضہ ادا کرنا ہوگا۔

قطعہ۔۔۔۔۔۔۔آٹھ آنے

نظم۔۔۔۔۔۔۔دو روپے

آزاد نظم۔۔۔۔۔۔۔پانچ روپے

اسی طرح دیگر اصناف سخن کی اجرت درج تھی۔ میرے شاعر دوست کھسیانے ہو کر بولے۔ ''اماں۔۔۔۔۔۔یہ کیا مذاق ہے؟''

انہوں نے بات نظر انداز کرتے ہوئے رسید بک نکالی اور قلم سنبھال کر بولے۔ ''کتنے کی رسید کاٹ دوں؟''

یہ مذاق کیسا بھی ہو حربہ کارگر ثابت ہوا۔ ہم دونوں ذرا ہی دیر بعد اٹھے اور منہ لٹکائے چلے آئے۔ میرا خیال ہے اس شاعر نے وہاں جانے کی زحمت پھر گوارا نہ کی ہوگی۔

◆◆◆

دیوار کے پیچھے

اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ کوئی بارہ ساڑھے بارہ کا عمل ہوگا۔ کہیں قریب ہی کتے زور زور سے بھونک رہے تھے۔ ان دنوں پاس پڑوس میں چوری کی ایک آدھ واردات بھی ہو چکی تھی لہٰذا کتوں کے اس طرح مسلسل بھونکنے سے ذرا تشویش ہوئی۔

میں شہر کے جس علاقے میں رہتا ہوں۔ وہ کسی قدر غیر آباد ہے۔ نہ سڑکوں پر روشنی کا بندوبست ہے اور نہ رات کو پولیس کے گشت کا۔ آنکھ کھلنے کے بعد سوچا کہ احتیاطاً اپنے گھر کا بھی جائزہ لے لوں۔ میں نے دروازہ کھولا اور کھنکارتا ہوا باہر آ گیا۔ گلابی جاڑوں کی رات تھی۔ ہوا میں خوشگوار خنکی تھی۔ کتوں کے بھونکنے کی آواز گھر کے پچھواڑے سے آ رہی تھی۔ میں اسی طرف چل دیا۔ میرے مکان کے پیچھے ایک خالی پلاٹ ہے اور اس کے برابر ایک نیم تعمیر مکان ہے' جو غیر آباد ہونے کے باعث رات کی تاریکی میں بھوتوں کا مسکن معلوم ہوتا ہے۔ راتوں کو یہاں کتے بسیرا کرتے ہیں یا زیر تعمیر مکانوں پر کام کرنے والے مزدور اور کاریگر اسے حوائج ضروری کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اسے معلوم نہیں کس منحوس کا مکان ہے' کبھی پلٹ کر ادھر کا رخ نہیں کیا کہ اس سے احتجاج کر سکوں۔

ہاں تو جب عقبی دیوار کے قریب پہنچا تو پیچھے سے ہلکی ہلکی سرگوشیوں کی آواز سنائی دی۔ میں لرز کر رہ گیا۔ دل میں کہا' لو بھئی! آج ہو گیا چوروں سے مچیٹا۔ قبل اس کے کہ میں لپک کر کسی کو بیدار کروں' اسی اثناء میں چوڑیوں کی ہلکی سی کھنک سنائی دی۔ ساتھ ہی کسی عورت نے بہت آہستہ سے کہا۔

''یہ کتے تو ہمارے پیچھے لگ گئے۔ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔ آؤ اس خالی مکان میں چلیں۔''

''ہاں یہ ٹھیک ہے۔'' آواز مردانہ تھی۔

معاملے کی نوعیت تو کچھ سمجھ میں آ گئی مگر میں چکر میں پڑ گیا کہ اس وقت آدھی رات کو یہاں کون ہو سکتا ہے۔ کچھ غصہ بھی آیا کہ حرامزادوں کو کہیں اور ٹھکانہ نہ ملا' میری ہی دیوار کے پیچھے ان کو عشق لڑانا رہ گیا تھا۔ جی چاہا کہ ان کو ٹوکوں' لعنت ملامت کروں' پھر اس خیال سے باز رہا کہ اپنی بھی نیند حرام ہو گی اور دوسروں کی بھی۔ خواہ مخواہ ہنگامہ ہوگا' بات زیادہ بڑھ گئی تو معاملہ پولیس تک پہنچے گا۔

سوچا' مجھے کیا نقصان پہنچا رہے ہیں؟ پس دیوار بیٹھے ہیں تیرا کیا لیتے ہیں۔ میں خاموشی کے ساتھ واپس آ کر بستر پر سو گیا۔

ابھی ذرا آنکھ لگی ہی تھی کہ بیوی نے جھنجھوڑ کر جگا دیا۔

گھبرا کر پوچھا۔ ’’خیریت تو ہے؟‘‘

جواب ملا ’’باہر سارا محلہ اکٹھا ہے‘ کوئی واردات ہو گئی ہے۔‘‘

لوگوں کے زور زور سے باتیں کرنے کی آوازیں بھی میں نے سنیں۔ آنکھیں ملتا ہوا اٹھا۔ باہر جا کر دیکھا تو ایک مکان کے سامنے کچھ لوگ جمع تھے۔ قریب گیا تو ایک مرد اور عورت پر نظر پڑی۔ دونوں گردنیں جھکائے‘ سہمے ہوئے خاموش کھڑے تھے۔ ان کو دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ بات کیا ہے۔ عورت سیاہ برقع پہنے ہوئے تھی۔ چہرے پر نقاب پڑی تھی۔ مرد صورت شکل سے ہرگز نامعقول نہیں لگتا تھا۔ سیاہ رنگ کی چست پتلون اور اونی سویٹر پہنے‘ وہ سیدھا سادا ایک عام نوجوان معلوم ہوتا تھا۔ لوگ ان دونوں کے گرد نیم دائرے میں کھڑے اس طرح گھور رہے تھے جیسے وہ کوئی عجوبہ ہوں۔

میری طرح کچھ اور لوگ بھی گھروں سے نکل کر وہاں آ گئے۔ ہر آنے والے کی زبان پر ایک ہی سوال ہوتا۔ ’’بھئی ہوا کیا‘ معاملہ کیا ہے؟ جواب دینے والا بھی ایک ہی شخص تھا۔ لمبا تڑنگا‘ نیلی یونیفارم پہنے‘ گلوبند لپیٹے‘ وہ بڑی شان سے اکڑا ہوا کھڑا تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ پاور ہاؤس میں مستری کا کام کرتا ہے۔ ممکن ہے فورمین ہو۔ کچھ بھی ہو‘ بہرحال آدمی پرلے درجے کا شیخی خورا تھا۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر‘ چٹخارہ لے کر اونچی آواز سے بتا رہا تھا۔

’’بھئی ہوا یہ کہ میں ڈیوٹی ختم کر کے آ رہا تھا۔ جب اس خالی مکان کے سامنے پہنچا تو کچھ آہٹ معلوم ہوئی‘ دو سائے ہلتے ہوئے نظر آئے۔ میں ٹھٹک گیا اور وہیں سے ڈپٹ کر آواز لگائی‘ کون ہے؟ بس ایک دم یہ دونوں نکل کر بھاگے۔ میں پیچھا نہ کرتا تو صاف نکل گئے تھے۔ بلکہ یہ سالا تو نکل ہی گیا تھا۔ یہ وہ تو راستے میں کوئی گڑھا تھا‘ قلابازی کھا کر گرا اور میں نے فوراً دبوچ لیا۔ بہت ہاتھ پاؤں مارے مگر میں نے ٹینٹوا گھٹنے سے دبا رکھا تھا‘ نکل کیسے جاتا۔‘‘

یہ تفصیل وہ اس سے پہلے بھی بتا چکا تھا اور ہر بار کندھے اچکا کر سب کو اس طرح دیکھتا جیسے ابھی اکھاڑے سے کشتی مار کر آیا ہے۔ وہ بات ختم کرتا تو ایک دم تبصرہ شروع ہو جاتا۔

’’یار اندھیر ہے اندھیر۔ غضب خدا کا‘ کس قدر بے غیرتی ہے؟‘‘

’’صورت تو دیکھو اچھا خاصا بھلا آدمی لگتا ہے اور اس کے یہ کرتوت۔‘‘

’’بھگا کر لایا ہے۔‘‘

’’نہیں بھئی‘ یہ تو کوئی آوارہ عورت معلوم ہوتی ہے۔‘‘

''ابے تم کو یہ حرام کاری کرتے شرم نہیں آتی۔جہنم میں جاؤ گے جہنم میں۔''

''تف ہے تمہاری اوقات پر۔''

اس لعنت اور پھٹکار کے دوران پستہ قد محمد حسین بھی اپنی منمنی آواز میں بار بار کہتے۔''جی' ان کو سنگسار کر دینا چاہیے۔اسلام میں زنا کاروں کی یہی سزا ہے۔''

جب وہ کئی بار یہی بات کہہ چکے تو ایک بار میں نے جل کر کہا۔''قبلہ پہلا پتھر کون مارے گا۔''

بولے''آپ ہی سے بسم اللہ ہو جائے تو کیا مضائقہ ہے۔''

میں نے کہا۔''جناب پھانسی کے تختے پر چڑھنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں۔آپ زیادہ مجاہد معلوم ہوتے ہیں' آپ ہی سے پہل ہو۔''

وہ ایک دم جوش میں آ گئے۔''لیجئے' میں ہی شروع کرتا ہوں۔''اور انہوں نے واقعی پتھر بھی اٹھا لیا۔

میں نے ٹوکا۔''پتھر اٹھانے سے پہلے یہ بھی سوچ لیجئے کہ انجام کیا ہو گا۔جیل کی کوٹھڑی اور پھانسی کا تختہ' بیوی رانڈ بیوہ' بچے یتیم۔''

انہوں نے فوراً پتھر چھوڑ دیا۔مجھے خونخوار نظروں سے گھورتے ہوئے بولے۔''ذرا زبان سنبھال کر بات کیجئے۔آپ ہی کے ایسے بزدلوں نے تو مسلمانوں کو بدنام کیا ہے' جبھی تو ہم اس حالت کو پہنچے ہیں کہ اس طرح کھلے عام حرام کاری ہو رہی ہے۔''

شاید وہ کچھ اور بھی کہتے۔لیکن بیچ میں دوسرے لوگ بول پڑے۔ہو بھی یہی رہا تھا۔کوئی بات شروع کرتا۔دوسرا بیچ میں ٹانگ اڑا دیتا۔ہر شخص اپنی ہانک رہا تھا' جتنے منہ اتنی باتیں۔اور وہ دونوں خاموش کھڑے تھے۔خوف سے سہمے ہوئے' سکڑے ہوئے' دبکے ہوئے۔

رات ڈھلنے لگی تھی' خنکی بڑھ گئی تھی اور ابھی تک یہ طے نہیں ہو سکا تھا کہ ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔کچھ لوگوں کا اصرار تھا کہ دونوں کو پولیس کے حوالے کر دیا جائے' مگر سوال کئی میل دور تھانے تک جانے کا تھا۔اور اس سے ہر شخص کنی کاٹ رہا تھا۔بعض کی تجویز تھی کہ مرد کا منہ کالا کیا جائے اور جوتے لگائے جائیں۔عورت کی صرف چوٹی کاٹ دی جائے۔کچھ اوروں نے بھی ایسی ہی عبرتناک سزائیں تجویز کیں۔بوڑھے بڑھ چڑھ کر بول رہے تھے اور جوان بڑوں کے ڈر سے خاموش تھے۔ایک آدھ بار انہوں نے لقمہ دیا تو ڈانٹ کر خاموش کر دیا گیا۔جن کے باپ موجود تھے انہوں نے لڑکوں کو تنبیہ کر کے گھر واپس بھیج دیا تھا۔

آخر بڑی بک بک جھک جھک کے بعد یہ طے پایا کہ ان سے پوچھ گچھ کی جائے اور اس تفتیش کی روشنی میں سزا تجویز کی جائے۔ لیکن اس طرح شبنم میں لوگ زیادہ دیر کھڑے رہنے کے حق میں نہیں تھے۔کسی نے مشورہ دیا کہ کہیں بیٹھ کر اطمینان سے پوچھ گچھ کی

جائے۔ بات معقول تھی۔ سب تیار ہو گئے۔ لطف یہ کہ کوئی بھی گھر واپس جاتا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ ہر شخص کو دلچسپی تھی' کر دی تھی اور ان میں میں بھی شامل تھا۔

یہ تحریک چونکہ اکبر صاحب کی تھی لہٰذا ان ہی کے مکان میں' جو قریب تھا' بیرونی برآمدے میں سب لوگ اکٹھا ہو گئے۔ اندر سے کرسیاں آ گئیں۔ بیٹھنا نصیب ہوا تو لوگوں میں کچھ معقولیت بھی پیدا ہوئی۔ عورت کو ذرا دور ایک کونے میں بٹھا دیا گیا اور مرد سے سوالات کئے جانے لگے۔ محلے کے واحد ڈاکٹر مرزا صاحب نے ابتدا کی۔ انہوں نے کسی قدر نرمی سے پوچھا۔

"بھئی! تم اس محلے کے تو معلوم نہیں ہوتے۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تمہارا نام کیا ہے' کہاں رہتے ہو' کیا کرتے ہو اور یہ عورت کون ہے؟ بیوی تو معلوم نہیں ہوتی۔"

کسی نے بیچ میں لقمہ دیا۔ "توبہ کیجئے' بیوی کے ساتھ کوئی یہ نامعقول حرکت کرتا ہے۔"

یہ صاحب جن کا نام نام اسم گرامی شریف احمد ہے۔ میرے گھر سے کچھ ہی فاصلے پر رہتے ہیں' انہوں نے ابھی نیا مکان تعمیر کرایا ہے۔ کسی ایسی فرم میں ملازم ہیں جہاں دوسرے الاؤنسوں کے ساتھ مکان کا ایک مقررہ کرایہ بھی ملتا ہے۔ اپنے مکان میں رہنے کے باوجود دفتر سے اس کا کرایہ بھی وصول کرتے ہیں' مکان بیوی کے نام ہے۔ اس خوف سے کہ راز نہ کھل جائے۔ بیوی کے لیے شوہر کے خانے میں کسی چھکن خان کا نام لکھوا دیا ہے۔ ویسے بڑے پرہیزگار آدمی ہیں۔ میں ہر روز ان کو پابندی کے ساتھ مسجد کی جانب جاتے ہوئے دیکھتا ہوں۔

شریف احمد کا ذکر تو خواہ مخواہ بیچ میں آ گیا۔ اب اس آدمی کا حال سنئے۔ اس نے کسی سوال پر کوئی جواب نہیں دیا۔ سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔ بہت اصرار کیا گیا تو عاجزی سے بولا۔ "جناب' غلطی ہو گئی معاف کر دیجئے۔ آپ سب سے معافی مانگتا ہوں' توبہ کرتا ہوں۔" اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

مستری جی' جنہوں نے دونوں کو پکڑا تھا' فوراً بول پڑے۔ "معافی تو تم نے اسی وقت مجھ سے مانگی تھی۔ اس طرح کام نہیں چلے گا۔ صاف صاف بتاؤ۔"

وہ آدمی پھر خاموش ہو گیا' کوئی جواب نہیں دیا۔ اچانک فیاض نے اٹھ کر اس کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ لگایا اور گرج کر بولے۔

"بتاتا ہے کہ سالے ایک اور لگاؤں۔"

وہ آبدیدہ ہو کر بولا۔ "آپ مار کیوں رہے ہیں؟ میں نے آپ کا کیا بگاڑا ہے؟"

فیاض خان پولیس کے ریٹائرڈ انسپکٹر ہیں۔ ذرا نہ پسیجے۔ ایک اور ہاتھ رسید کیا۔ وہ بلبلا کر بولا۔ "مارئیے نہیں' سب بتائے دیتا ہوں۔" اور اپنا گال سہلانے لگا۔

فیاض خان نے ہم سب کو اس طرح داد طلب نظروں سے دیکھا گویا کہہ رہے ہوں کہ دیکھو اس طرح پوچھ گچھ کی جاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک بار پھر اپنا سوال دہرایا۔ "اب تو بتا دو کہ تم کون ہو' یہاں کیسے آئے' کیوں آئے۔"

فیاض خان نے اس کو پھر ڈانٹا۔ "سچ سچ بتانا ورنہ مار مار کر سور بنا دوں گا۔"

پوچھا گیا۔ "شادی ہوگئی تمہاری؟"

اس نے انکار میں گردن ہلا دی۔

اکبر صاحب نے کہا۔ "بھلے آدمی شادی کر کے گھر کیوں نہیں بسا لیتے' اس خرافات میں کیا رکھا ہے۔ عاقبت بھی خراب اور دنیا میں بھی منہ کالا۔"

وہ بولا "آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ میری ماں اور دوسرے رشتہ دار بھی یہی کہتے ہیں مگر بات یہ ہے۔۔۔۔۔۔۔"

کسی نے بیچ میں بات کاٹ دی۔ "تجھ کو تو عورتوں کے ساتھ آوارہ گردی میں مزا آتا ہے۔"

وہ کہنے لگا۔ "نہیں' جناب یہ بات نہیں۔"

فیاض خان نے تیوری پر بل ڈال کر پوچھا۔ "پھر کیا بات ہے' سچ سچ بتا۔"

وہ بتانے لگا۔ "دیکھئے' ڈیڑھ سو تو کل میری تنخواہ ہے۔ اس میں سے پچاس روپے ہر مہینے ماں کو بھیجتا ہوں۔ ان کا اور سہارا نہیں۔ باپ میرے کا انتقال ہو چکا ہے' آپ جانتے ہیں کراچی میں معمولی سے معمولی مکان سو روپے سے کم نہیں ملتا۔ ایک دوست کے ساتھ کسی نہ کسی طرح گزر بسر کر رہا ہوں۔"

پھر کوئی بیچ میں بول پڑا۔ "اماں' صاف جھوٹ بول رہا ہے۔ یہ تو کچھ اور ہی معاملہ لگتا ہے۔"

پوچھا گیا۔ "اس عورت کو بھگا کر لائے ہو؟"

اس نے جواب دیا۔ "جی نہیں"

کسی نے لقمہ دیا۔ "تو پھر اس کا بھڑوا ہوگا۔" اس پر بعض لوگوں کی باچھیں کھل گئیں۔

ڈاکٹر صاحب نے دریافت کیا۔ "یہ عورت کون ہے؟"

وہ بڑے اطمینان سے بولا ''معلوم نہیں۔''

فیاض خان پھر گرجے۔ ''ابے پھر جھوٹ بولا' لگاؤں دو ایک اور؟''

''میں آپ سے سچ کہہ رہا ہوں۔''

فیاض خان کو اب تو جلال آ گیا۔ قبل اس کے وہ ہاتھ اٹھائیں ڈاکٹر صاحب فوراً بول پڑے۔ ''مگر بھئی' پھر یہ عورت تمہارے ساتھ یہاں کیسے آئی؟ ٹھیک ٹھیک بتاؤ ورنہ اور درگت بنے گی۔''

وہ کہنے لگا۔ ''دیکھئے بات یہ ہے کہ میں دس بجے کے قریب ایک دوست سے ملنے ریلوے اسٹیشن پر گیا۔ وہ ریلوے میں کام کرتا ہے۔ وہیں یہ عورت مجھ کو مل گئی۔ اسٹیشن سے ذرا ہٹ کر فٹ پاتھ پر کھڑی کسی آدمی سے بات کر رہی تھی۔ مجھے آتا دیکھ کر وہ آدمی ایک دم آگے بڑھ گیا۔ میں اس کے پاس سے گزرا تو مجھے محسوس ہوا کہ مجھے دیکھ کر وہ مسکرائی تھی۔ میں آگے چلا گیا۔ پھر نہ جانے کیوں واپس آ گیا۔''

کسی نے آوازہ کسا۔ ''استاد یہ نہیں کہتے کہ ذرا ٹھرک لگانے کو جی چاہا تھا۔''

دوسری طرف سے آواز آئی۔ ''اماں' بات تو پوری سننے دو۔ ہاں بھئی تو پھر کیا ہوا؟'' اب اس کی بات میں لوگوں کو دلچسپی پیدا ہونے لگی تھی۔

وہ بتانے لگا۔ ''میں نے قریب جا کر پوچھا' کہاں جاؤ گی؟ بولی' جہاں لے چلو۔ بس پھر ہم دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ اس نے مجھ سے چالیس روپے مانگے اور بیس روپے پیشگی بھی لے لیے۔ ہم دیر تک سڑکوں پر ادھر ادھر گھومتے رہے اور جب ایک پولیس والے کو اپنی جانب گھورتے دیکھا تو سوچا کہ اس طرح سڑکوں پر گھومنا خطرناک ہے۔ میں نے فوراً ایک رکشا ٹھہرائی اور دونوں اس میں سوار ہو گئے۔ مگر اس کو لے کر جاتا کہاں؟ دفتر کے ایک ملنے والے کے ہاں پہنچا تو اس نے گالیاں دے کر بھگا دیا۔ جس شخص کے ساتھ رہتا ہوں وہ بال بچے دار آدمی ہے اس کو ذرا بھی شبہ ہو جائے تو کھڑے کھڑے گھر سے نکال دے۔''

سب بڑی دلچسپی کے ساتھ چپ چاپ اس کی باتیں سن رہے تھے۔ اچانک اکبر صاحب بول پڑے۔ ''جب منہ ہی کالا کرنا تھا تو کسی ہوٹل میں کمرہ کرایہ پر لے لیا ہوتا۔ ایسے ہوٹلوں کی کمی نہیں۔''

وہ بولا۔ ''میرے پاس اتنے روپے نہیں تھے۔''

کسی نے پوچھا۔ ''کتنے روپے تھے؟''

"پچاس" اس نے بتایا۔

ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ "یہ ماں کو بھیجنے کے لیے تو نہیں تھے؟"

اس نے سر جھکا کر آہستہ سے کہا۔ "جی ہاں"

"بھئی حد ہوگئی۔"

"لعنت ہے اس شخص پر۔"

"اس کو تو واقعی سزا ملنی چاہیے۔"

کسی نے اونچی آواز سے اس کو مخاطب کیا۔ "بھئی تم آگے بتاؤ۔"

وہ بتانے لگا۔ "جب کوئی جگہ سمجھ میں نہیں آئی تو ہم شہر سے نکل کر ادھر آ گئے۔ یہاں آبادی کم ہے اور سڑکوں پر اندھیرا بھی ہے۔ کیا کرتا بیس روپے تو وصول کرنا ہی تھے۔" وہ اب ذرا کھل کر بات کرنے لگا تھا۔

کسی نے برجستہ کہا۔ "تو تم نے کئے وہ روپے وصول؟"

وہ بڑی معصومیت سے بولا۔ "رکشا کے کرائے میں جو تین روپے دیے تھے وہ بھی وصول نہیں ہوئے۔"

پستہ قد محمد حسین اس بات پر تڑپ کر رہ گئے۔ بگڑ کر بولے۔ "لاحول ولاقوۃ! کیا بے غیرتی کی باتیں ہو رہی ہیں اور اس بے حیا کو دیکھئے کس بے شرمی سے بات کر رہا ہے۔" کچھ اور لوگوں نے بھی لعنت ملامت شروع کر دی۔

رات بہت زیادہ ہو چکی تھی اور اس شخص کی بات میں اب کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے سفارش کی۔ "میرا خیال ہے اب ان کو جانے دیا جائے۔ خاصی سزا مل گئی۔"

شریف احمد کہنے لگے۔ "کیا بات کر رہے ہیں ڈاکٹر صاحب! ان کو سزا کہاں ملی' ان کو ضرور کچھ نہ کچھ سزا ملنا چاہیے تاکہ آئندہ عبرت ہو۔"

ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا۔ "یہ رسوائی' یہ لعنت پھٹکار کچھ کم سزا ہے۔ بھلے آدمی ہوں گے تو آئندہ ایسی حرکت نہیں کریں گے۔"

کسی نے اصرار کیا۔ "نہیں صاحب ان کو پولیس کے حوالے کر دینا چاہیے۔"

ڈاکٹر صاحب نے پھر بھی ہتھیار نہیں ڈالے' کہنے لگے۔ "پولیس کے حوالے کرنے سے کیا ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ کچھ جرمانہ ہو جائے اور اخباروں میں خبر چھپ جائے گی کہ ایک نوجوان مرد اور عورت شارع عام پر بوس و کنار کرتے ہوئے پکڑے گئے اور جہاں

تک تھانے جانے کا سوال ہے تو جناب میں تو اب گھر جا کر سوؤں گا۔ میں تھانے وانے نہیں جاتا۔"

ذرا دیر کے لیے سناٹا چھا گیا۔ پھر شریف احمد کی آواز ابھری۔ "مجھے تو سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ یہ شریف لوگوں کی آبادی ہے۔ یہ یہاں اس حرامکاری کے لیے کیوں آئے؟"

میں جو تمام عرصے خاموش بیٹھا رہا تھا' شامت اعمال بیچ میں بول پڑا۔ "جناب میرے گھر کی دیوار کے پیچھے یہ ساری بیہودگی ہوئی مگر میں اب ان سے کیا کہوں۔ نہ جانے رات کی تاریکی میں کس کس دیوار کے پیچھے کیا ہوتا ہے۔ مجھے تو انہوں نے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ نہ میری نیند خراب کی۔ نہ میرے گھر میں نقب لگائی۔"

شریف احمد میری باتوں پر چڑ گئے۔ کہنے لگے "آپ کو ان سے بڑی ہمدردی معلوم ہوتی ہے۔ ایسی ہی ہمدردی ہے تو اپنے گھر بلا لیا ہوتا آپ نے۔" ان کی اس بات پر میں جل بھن کر رہ گیا لیکن انہوں نے اسی پر اکتفانہ کیا۔ بڑے طنز کے ساتھ بولے۔ "آئندہ بلا لیجیے گا۔ ویسے یہ دھندا بُرا نہیں' منافع ہی منافع ہے۔"

یہ کہہ کر انہوں نے زور کا ٹھٹھا مارا۔ میں نے اپنا پیر ڈھیلا کیا اور قبل اس کے کہ ان کا قہقہہ ختم ہو' جوتا اتار کر بغیر کسی تمہید کے تڑاتڑ دو ان کی گُدی پر جما دیے۔ تیسرا ہاتھ اٹھایا تھا کہ لوگوں نے ہاتھ پکڑ لیا اور زبردستی جوتا چھین کر پھینک دیا۔ پھر کیا تھا؟ وہ آپے سے باہر ہو گئے۔ ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ کبھی وہ مجھ کو مارنے کے لیے جھپٹے' کبھی میں ان پر لپکتا۔ کئی بار گتھم گتھا ہوتے ہوتے رہ گئے۔ ہر بار لوگوں نے روک لیا۔ اچھی خاصی افراتفری مچ گئی۔

جب ذرا معاملہ ٹھنڈا ہوا تو پتہ چلا کہ اس ہنگامے میں وہ دونوں چپکے سے نکل بھاگے مگر میں بیٹھے بٹھائے مشکل میں پھنس گیا۔

شریف احمد نے دوسرے ہی دن سٹی کورٹ میں مجسٹریٹ کے روبرو آٹھ آنے کے اسٹامپ پر حلف نامہ داخل کیا۔ دو گواہ پیش کئے اور مارپیٹ کرنے کے الزام میں میرے خلاف قابل ضمانت وارنٹ جاری کرا دیے۔ ابھی مقدمے کی پہلی پیشی ہوئی ہے جس میں ضمانت دے کر آیا ہوں۔ باقاعدہ سماعت بعد میں ہوگی۔

اب چونکہ یہ معاملہ عدالت کے روبرو ہے۔ لہٰذا یہ بات یہیں چھوڑے دیتا ہوں' کچھ اور کہوں گا تو توہین عدالت کے جرم میں دھر لیا جاؤں گا۔

◆◆◆

ستارے دور ہیں

انٹرویو میں ابھی ڈیڑھ گھنٹہ باقی تھا۔

دھوپ اب تیز ہو چکی تھی۔ جیب میں کل ساڑھے بارہ آنے تھے اور گھر واپس جانے کے لیے اس کا کل یہی اثاثہ تھا۔ لہٰذا اتنی گنجائش نہیں تھی کہ کسی چائے خانے میں بیٹھ کر وقت گزارا جائے۔ لیکن زیادہ دیر تک سڑکوں پر آوارہ گردی کرنے کی نوبت نہ آئی۔ معاً اسے نعمانی کا خیال آ گیا۔ ان دنوں وہ دفتر سے رخصت لے کر گھر پر آرام کر رہا تھا۔

نعمانی کا مکان کچھ زیادہ دور نہ تھا۔ وہ اسی جانب چل دیا۔ آچاریہ منشن کی تیسری منزل پر نعمانی صاحب کا فلیٹ تھا۔ دوپہر کی گرمی سے وہ پہلے ہی پریشان تھے۔ وہاں تک پہنچتے اور بھی برا حال ہو گیا۔ زینے کی سیڑھیاں چڑھ کر وہ اوپر پہنچا تو زور زور سے ہانپ رہا تھا۔ بیرونی دروازے کا ایک پٹ ذرا سا کھلا تھا۔ اس نے گردن بڑھا کر اندر جھانکا۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ اسی اثناء میں کسی نے بھاری بھرکم لہجے میں دریافت کیا۔

''کون ہے؟''

اس غیر مانوس آواز پر اسے تعجب تو ضرور ہوا' لیکن نام بتانا ضروری تھا۔ اس نے کسی قدر اونچی آواز میں جواب دیا۔ ''میں ہوں انصار احمد''

ذرا دیر خاموشی چھائی رہی' پھر آواز آئی۔

''اندر آ جائیے' دروازہ کھلا ہے۔''

وہ چپ چاپ کمرے میں داخل ہو گیا۔ سامنے صوفے پر ایک ادھیڑ آدمی اکڑوں بیٹھا ہوا اخبار پڑھنے میں منہمک تھا۔ اس نے انصار کی طرف نظر اٹھائے بغیر بے نیازی سے پوچھا۔ ''فرمائیے۔''

اس بے نیازی پر انصار جھنجھلا کر رہ گیا۔ اس نے قدرے تیکھے لہجے میں پوچھا۔ ''کیا نعمانی اندر ہیں؟'' لیکن اس ادھیڑ آدمی نے ذرا بھی گھاس نہ ڈالی۔ پورے انہماک سے بیٹھا اخبار پڑھتا رہا اور اس کی طرف متوجہ ہوئے بغیر اسی بے نیازی سے بولا۔

''جی نہیں' کوئی ہفتہ بھر ہوا وہ فلیٹ چھوڑ کر راولپنڈی چلے گئے۔ اب یہاں عبدالباری خان رہتے ہیں۔ اگر ان سے ملنے کا ارادہ

ہو تو تھوڑی دیر انتظار کیجئے۔ وہ دو بجے تک واپس آ جائیں گے۔"

انصار کچھ سٹپٹا سا گیا۔ اس نے تجسس آمیز نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ کمرہ تو وہی تھا مگر اس کا حلیہ بالکل تبدیل ہو چکا تھا۔ ندامت سے زیادہ انصار کو اس بات کی کوفت ہوئی کہ وہاں بیٹھ کر وہ کچھ وقت گزارنا چاہتا تھا۔ لیکن اب تو معاملہ ہی اور تھا۔ اس نے واپس جانے کے لیے دروازے کی طرف مڑتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"جی نہیں' مجھے تو نعمانی سے کام تھا۔ معاف کیجئے' آپ کو خواہ مخواہ زحمت دی۔"

اس دفعہ اس شخص نے نظریں اٹھا کر انصار کی طرف دیکھا' لیکن جواب میں ایک لفظ بھی نہ کہا۔ خاموشی سے اس کا چہرہ اس طرح تکتا رہا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ لیکن انصار اب وہاں ٹھہرنا نہ چاہتا تھا۔ وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ ابھی کمرے سے باہر نہیں نکلا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی۔

"ذرا ٹھہر جائیے۔"

انصار دہلیز پر ٹھٹک کر رہ گیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ وہ ابھی تک بغور اس کا چہرہ تک رہا تھا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے بلایا۔

"یہاں آیئے" اور برابر رکھی ہوئی کرسی اس کی طرف بڑھا دی۔

"بیٹھئے' میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔"

انصار چپ چاپ اس کے قریب چلا گیا۔ وہ شخص ابھی تک اس کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کے اس رویے سے انصار کچھ گھبرا سا گیا۔ اس شخص نے جیسے اس کی گھبراہٹ کو بھانپ لیا تھا۔ مسکرا کر نرم لہجے میں بولا۔

"بھئی پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ میں صرف اس قدر معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کی کنپٹی پر یہ سورج کا سا جو نشان ہے' پیدائشی ہے یا کسی چوٹ کی وجہ سے پڑ گیا ہے؟"

انصار نے جواب دیا۔ "جی نہیں' یہ تو ہمیشہ سے اسی طرح ہے۔" لیکن اس کی سمجھ میں کوئی ایسی بات نہیں آئی جس سے یہ اندازہ لگا سکتا کہ اس کے برابر بیٹھا ہوا ادھیڑ آدمی اس سرخ دھبے کے متعلق کیوں دریافت کر رہا ہے۔ وہ اس کی الجھن سے بے نیاز زیر لب مسکراتا رہا۔ اس نے اخبار اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا اور سنجیدہ لہجے میں گویا ہوا۔

"معلوم ہوتا ہے اس نشان کے متعلق کسی نے اب تک آپ کو کچھ بتایا نہیں۔" یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر تک خاموش بیٹھا رہا۔ غالباً وہ انصار سے اپنی بات کی تائید کرانا چاہتا تھا۔ مگر جب کوئی جواب نہ ملا تو بتانے لگا۔ "دراصل مجھے علم نجوم میں کچھ دخل ہے۔ البتہ یہ واضح

کردوں کہ میں پیشہ ور نجومی نہیں ہوں۔ اس علم سے صرف شوقیہ لگاؤ ہے۔" اس نے کنپٹی کی جانب ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "جہاں تک میرا قیاس ہے یہ پدم ہے اور یہ اس بات کی علامت ہے کہ آپ کا نصیبہ یاور ہے۔" پھر اس نے بڑی صاف گوئی سے کہا۔ "لیکن آپ کو جو کچھ ہونا چاہیے تھا بظاہر اس کے آثار نظر نہیں آتے۔"

"یہی تو میں بھی سوچ رہا ہوں۔" انصار اس کی باتوں سے اب کسی قدر متاثر ہو چکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس سے یہ بھی دریافت کر بیٹھا۔ "اچھا یہ بتایئے کہ میں ابھی تھوڑی دیر میں جس انٹرویو کے لیے جا رہا ہوں' اس کا کیا نتیجہ نکلے گا؟"

وہ ذرا دیر خاموش بیٹھا ہوا کچھ سوچتا رہا' پھر اس نے میز پر سے کاغذ اٹھایا۔ پنسل ہاتھ میں لی اور جھکے ہوئے لہجے میں گویا ہوا۔

"اس وقت آفتاب نصف النہار پر پہنچ چکا ہے۔ لہٰذا ستاروں کی چال کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ بہر حال آپ نے اب بات پوچھ ہی لی ہے تو کچھ نہ کچھ بتانا ہی پڑے گا۔"

انصار خاموش رہا۔

اس شخص نے انصار سے اس کا نام پوچھا' تاریخ پیدائش معلوم کی اور کاغذ پر زائچہ بنانے میں مصروف ہو گیا۔ انصار چپ بیٹھا ہوا اس کی تمام حرکات وسکنات پوری توجہ کے ساتھ دیکھتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے گردن اٹھا کر انصار سے دریافت کیا۔

"ذرا یہ تو بتایئے کہ تمام پھولوں میں آپ کو کون سا پھول پسند ہے؟"

انصار لمحہ بھر کے لیے تذبذب میں مبتلا ہو گیا۔ اس نے آج تک یہ غور ہی نہیں کیا تھا کہ کوئی ایسا بھی پھول ہے جو اسے زیادہ پسند ہو۔ مگر کچھ نہ کچھ جواب تو دینا ہی تھا لہٰذا اس نے کہہ دیا۔ "چنبیلی کا پھول مجھے زیادہ پسند ہے۔"

ادھیڑ عمر آدمی نے ایک بار پھر زیر لب مسکرا کر اس کی جانب دیکھا اور جس کاغذ پر اس نے زائچہ تیار کیا تھا' اسے پلٹ کر سامنے کر دیا۔ انصار نے حیرت زدہ ہو کر دیکھا۔ کاغذ کے ایک کونے میں پنسل سے یہ جملہ لکھا تھا۔

"چنبیلی کا پھول پسند کیا جائے گا۔"

اب اس شخص کے چہرے سے اطمینان جھلک رہا تھا۔ وہ کچھ عرصہ اور خاموش بیٹھا رہا۔ پھر اس نے دبی زبان سے کہا۔

"بھئی یہ انٹرویو تو آپ کا کامیاب ہوتا نظر نہیں آتا۔"

انصار کے چہرے پر مردنی سی چھا گئی۔ وہ نظریں جھکا کر فرش کو تکنے لگا۔ وہ شخص تسلی دینے لگا۔ "دیکھیے میں یہ بات دعوے سے تو کچھ نہیں رہا ہوں' غیب کا حال تو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ یہ تو صرف ہندسوں کا حساب ہے۔ آپ دل برداشتہ نہ ہوں۔ انٹرویو میں جا کر

دیکھئے' کیا ہوتا ہے۔"

لیکن اس کی حوصلہ افزائی سے انصار مطمئن نہ ہو سکا۔ اس نے دریافت کیا۔ "اچھا یہ تو بتایئے کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے؟"

"ابھی تو آپ کا ستارہ گردش میں ہے۔ کچھ ٹھیک سے کہا نہیں جا سکتا۔ کسی وقت اطمینان سے ملئے گا تو آپ کا مکمل زائچہ تیار کروں گا۔" یہ کہہ کر اس نے کاغذ پنسل کو اٹھا کر میز پر رکھ دیا اور پھر اخبار پڑھنے لگا۔ یہ اس بات کی تاکید تھی کہ اب وہ مزید گفتگو کرنا نہیں چاہتا۔

انصار اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس شخص سے اجازت لی اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

سڑک پر آ کر اس نے محسوس کیا کہ دھوپ کی تپش اور تیز ہو گئی ہے۔ آچاریہ منشن کی تیسری منزل پر بیٹھے ہوئے ادھیڑ عمر نجومی کا چہرہ راہ گیروں کی بھیڑ میں تحلیل ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی بھاری بھر کم آواز سڑک کے شور و غل کا حصہ بن گئی ہے۔ البتہ اس کے ذہن میں کسی قدر کھلبلی مچی ہوئی تھی۔

وہ انٹرویو کے لیے پہنچا تو یہ دیکھ کر ذرا ڈھارس بندھی کہ امیدواروں کی تعداد زیادہ نہ تھی۔ لیکن جب چپراسی نے قریب آ کر اندر جانے کا اشارہ کیا تو وہ گھبرا سا گیا۔ کمرے میں فرم کا جنرل منیجر ایک لمبی میز پر کہنیاں ٹکائے خاموش بیٹھا تھا۔ پستہ قد آدمی تھا۔ لیکن عینک کے چوڑے فریم اور فرنچ کٹ ڈاڑھی نے اس کی شخصیت کو خاصا بارعب بنا دیا تھا۔ اس نے بڑی متانت سے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ انصار کرسی پر بیٹھ گیا اور جنرل منیجر میز پر رکھے ہوئے کاغذات دیکھنے لگا۔

انصار نے پہلی ہی نظر میں اندازہ لگا لیا کہ وہ اس کی درخواست کا جائزہ لے رہا ہے' جس پر جگہ جگہ سرخ پنسل کے نشانات لگے ہوئے ہیں۔ ذرا دیر بعد اس نے نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ انصار انٹرویو کے لیے سنبھل کر بیٹھ گیا۔ لیکن خلاف توقع اس نے بڑا عجیب سا سوال کیا۔

"آپ مہاجر معلوم ہوتے ہیں' پاکستان آنے سے پہلے آپ کہاں رہتے تھے؟"

انصار نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔ "گورکھپور میں۔"

"کبھی دیوریا جانے کا بھی اتفاق ہوا؟"

اس دفعہ اس نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ "جی ہاں' کچھ عرصہ اپنے والد کے ساتھ وہاں رہ چکا ہوں۔ وہ ان دنوں دیوریا میں تحصیل دار تھے۔"

منیجر کے چہرے پر موہوم سی حیرت جھلکنے لگی۔ ''ذرا ان کا نام تو بتایئے۔''

''خان بہادر اشفاق احمد''

چوڑے فریم والی عینک کے پیچھے منیجر کی آنکھیں مسکراہٹ سے جھلملانے لگیں۔ ''غالباً میں ان سے مل چکا ہوں۔ آج کل وہ کہاں ہیں؟''

انصار نے جواب دیا۔ ''اب تو وہ سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہو چکے ہیں اور گورکھپور میں وکالت کر رہے ہیں۔''

''تب تو آپ یہاں تنہا ہوں گے۔''

انصار کو اپنی کامیابی کی کچھ امید نظر آئی۔ اس نے سوچا اب تو بات ایسے مرحلے پر پہنچ چکی ہے کہ منیجر کی وہ جس قدر بھی ہمدردی حاصل کر سکتا ہے اس کے لیے ہچکچانے سے کام نہیں چلے گا۔ لہٰذا اس نے کہہ دیا۔ ''جی نہیں' سب سے بڑی دشواری تو یہ ہے کہ بال بچے ساتھ ہیں۔ ان کے علاوہ میری بیوہ ساس اور ان کا کنبہ بھی ہے۔'' اس نے بات کو زیادہ سے زیادہ موثر بنانے کی واسطے مبالغہ آرائی سے بھی کام لیا۔

فرنچ کٹ ڈاڑھی والے منیجر کے چہرے پر ایکبارگی سنجیدگی چھا گئی۔ اس نے حسب توقع ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''نئی جگہ ہے' سینکڑوں طرح کی پریشانیاں ہیں۔ بہرصورت میں آپ کے لیے حتی الوسع کوشش کروں گا اس لیے کہ سلیکشن تو منیجنگ ڈائریکٹر کے مشورے سے ہی ہوگا۔''

انصار نے لحہ بھر توقف کرنے کے بعد پوچھا۔ ''کب تک پتہ چلے گا؟''

''جلد ہی معلوم ہو جائے گا۔ آپ یہاں پریشان نہ ہوں۔ ڈاک کے ذریعہ اطلاع پہنچا دی جائے گی۔''

کمرے میں ذرا دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔ پھر منیجر کی آواز ابھری۔ ''اچھا' اب آپ جا سکتے ہیں۔''

انصار نے چلتے چلتے ایک بار پھر اپنی پریشانیوں کا اظہار کیا اور کمرے سے باہر چلا آیا۔

وزیٹر روم میں رفیق اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ اس کا پرانا ملنے والا تھا اور فرم میں اسٹینوگرافر تھا۔ اسے دیکھتے ہی دریافت کیا۔ ''کہو بھئی کیا کر آئے؟''

انصار مسکرا کر بولا۔ ''امید تو بہت معلوم ہوتی ہے' وہ تو ابا جان کا ملنے والا نکل آیا۔''

لیکن زیادہ باتیں کرنے کی نوبت نہ آئی۔ اسی اثناء میں چپراسی نے آ کر رفیق سے کہا۔ ''صاب بلا رہے ہیں۔'' وہ فوراً اندر چلا

گیا۔کوئی دس منٹ بعد باہر آیا تو اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔انصار کو اس نے صاف صاف بتادیا۔

''بھئی تمہارا اندازہ تو غلط نکلا۔ وہ تو کسی اور کا اپوائنٹمنٹ کر رہا ہے۔ یہ دیکھو آرڈر بھی ہو چکے ہیں۔'' اس نے ہاتھ میں دبے ہوئے کاغذات اس کے سامنے کر دیے۔

انصار ایک دم بجھ کر رہ گیا۔اس نے بڑے افسردہ لہجے میں کہا۔''یار! وہ تو بڑی ہمدردی کا اظہار کر رہا تھا۔میں نے تو اس سے یہاں تک کہہ دیا کہ بال بچے دار ہوں اور عرصے سے بے روزگار ہوں۔'' رفیق جیسے ایک بارگی اچھل پڑا۔

''یہی تو تم نے غضب کر دیا۔ یار اس کی تین لڑکیاں جوان ہو چکی ہیں' جن کی شادی کے لیے وہ ہر وقت پریشان رہتا ہے۔''

انصار کو جیسے یقین نہ آیا' کہنے لگا۔''نہیں بھئی' ایسی کوئی بات نہیں۔ ہو سکتا ہے وہ پہلے ہی فیصلہ کر چکا ہو۔ جبھی تو اس نے انٹرویو میں کوئی بھی قاعدے کا سوال نہیں پوچھا۔'' دونوں میں دیر تک بحث ہوتی رہی۔ آخر جب وہ واپس ہوا تو بہت جھنجلایا ہوا تھا۔

گھر پہنچ کر وہ تھکا ہوا سا بستر پر جا کر دراز ہو گیا۔تھوڑی دیر بعد اس کی بیوی کسی بات پر بڑبڑاتی ہوئی کمرے کے اندر آئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔وہ پوچھنے لگی۔''کیا ہوا؟'' اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ چپ چاپ کروٹ بدل کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

وہ خاموشی سے باہر چلی گئی۔

کئی بار وہ کمرے میں آئی۔ ہر بار انصار نے اس کی قدموں کی آہٹ سنی۔ مگر دونوں میں کوئی بات چیت نہ ہوئی۔ وہ تمام دن کا بھوکا تھا۔ ہر بار جب وہ کمرے میں آتی تو انصار سوچتا' شاید وہ کھانے کے لیے پوچھے گی لیکن ہر مرتبہ اس کے احساسات کو ٹھیس پہنچی۔ وہ خاموش لیٹا ہوا کروٹیں بدلتا رہا۔گھر کے اندر ملی جلی آوازیں گونجتی رہیں۔شام ہونے سے کچھ دیر پہلے تمام آوازیں اچانک ٹھہر گئیں۔اب فریدا اپنے دفتر سے واپس آ گیا تھا۔برابر والے کمرے میں اس کی بیوی فرید سے کہہ رہی تھی۔

''بھائی جان! آپ چپراسی تو آیا نہیں۔''

وہ اونچی آواز سے تقریباً چیخ کر بولا۔''آخر یہ انصار کس مرض کی دوا ہیں؟ کسی روز چپراسی نہ آ سکے تو ان سے اتنا بھی نہیں ہو سکتا کہ جا کر راشن ہی لے آئیں۔اب اگر ان سے اتنا بھی نہیں ہو سکتا تو پھر کیسے کام چلے گا؟''

اس کی بیوی بڑے بھائی کی ہاں میں ہاں ملانے لگی۔''آپ ہی ان سے کہیے' میں کچھ بولوں گی تو میرے سر ہو جائیں گے۔ان کو تو سوائے خفگی اور غصے سے اور کچھ آتا ہی نہیں۔''

انصار چپ لیٹا ہوا یہ تمام باتیں سنتا رہا۔ ہر بار جیسے اس کے پہلو میں نشتر سا لگتا اور وہ تلملا اٹھتا۔ آخر اپنی بے بسی پر اس کی آنکھیں نمناک ہوگئیں۔ وہ سوچنے لگا کہ کب تک یہ طعنے سہتا رہے گا؟ کب تک اس طرح ذلت برداشت کرتا رہے گا؟ وہ اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ پلنگ سے نیچے اترا۔ اپنے کوٹ کی جیبیں ٹٹولیں ملک عرفان کا پتہ تلاش کیا اور کسی سے بغیر کچھ کہنے سنے گھر سے باہر چلا گیا۔

اتفاق سے ملک عرفان علی اپنی کوٹھی پر موجود تھے۔ انہیں اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے ایک ٹیوٹر کی ضرورت تھی۔ ملک عرفان نے تعلیمی استعداد کے علاوہ اس سے ادھر ادھر کے چند سوالات کئے۔ انصار نے ان سوالات کے مناسب جوابات دیئے۔ مگر یہ نہ بتایا کہ وہ شادی شدہ ہے اور ایک بچے کا باپ بھی ہے۔ اس کے جوابات سے وہ اس قدر مطمئن ہوئے کہ اسے فی الفور ڈیڑھ سو روپے ماہوار پر ملازم رکھ لیا۔ مگر بنیادی شرط یہ تھی کہ ان کی کوٹھی ہی میں رہنا پڑے گا۔ انصار نے یہ شرط بھی منظور کر لی۔

دوسرے روز جب وہ ضروری سامان لے کر جانے لگا تو بیوی نے تشویش کا اظہار کیا۔ لیکن اس نے یہ کہہ کر اسے مطمئن کر دیا کہ وہ مقابلے کے امتحان کی تیاری کر رہا ہے' لہٰذا کچھ دنوں کے لیے اپنے ایک دوست کے مکان پر جا کر رہے گا۔ وہ بالکل تنہا رہتا ہے۔ یہاں بچوں کے شور وغل میں پڑھائی ٹھیک سے نہ ہو سکے گی۔

بات آئی گئی ہوگئی اور وہ ملک عرفان کے ساتھ رہنے لگا۔

ملک عرفان کے دو لڑکے تو کانونٹ میں ابتدائی تعلیم پا رہے تھے۔ دونوں خوب گول مٹول اور بے حد شریر تھے۔ البتہ لڑکی کم سخن اور سنجیدہ تھی۔ مگر اپنی عمر سے زیادہ ہی بڑی نظر آتی تھی۔ وہ ان دنوں انٹرمیڈیٹ کی تیاری کر رہی تھی۔ وہ رات گئے تک سب کو پوری توجہ سے پڑھاتا۔ فرصت کے اوقات میں ان کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرتی۔ یہ باتیں بھی تعلیم ہی کا ایک حصہ ہوتیں۔ ملک صاحب کاروباری آدمی تھے' لیکن بڑے روشن خیال تھے۔ انصار کو نیک اور سعادت مند بھی سمجھتے تھے اور ہمیشہ شفقت سے پیش آتے تھے۔ وہ عام طور پر گھر سے باہر رہتے۔ انصار سے ان کی بہت کم ملاقات ہوتی۔ البتہ کبھی کبھار رات کو کھانے پر ان سے گفتگو ہو جاتی۔ وہ سب کی پڑھائی کے ساتھ ساتھ اس کے بارے میں بھی بات چیت کرتے اور اپنے کنبے کے ایک فرد کی طرح ہمیشہ اس کی ذات میں دلچسپی کا اظہار کرتے۔

دوسرے ہی مہینے سے اس کی تنخواہ میں پچاس روپے کا اضافہ ہوگیا۔ اب اس کی یہ بھی ڈیوٹی ہوگئی تھی کہ صبح اٹھ کر بیگم صاحبہ کو اخباروں میں سے خبریں پڑھ کر سنائے۔ ان پر تبادلہ خیالات کرے۔ یہ کام ایسا مشکل تو نہیں تھا' مگر مصیبت یہ تھی کہ وہ بے حد باتونی واقع ہوئی تھیں۔ سیاسی' سماجی مسائل پر باتیں کرتے کرتے وہ اپنی ذاتی باتیں چھیڑ دیتیں جن میں عام طور پر اس بات کا گلہ ہوتا کہ

ملک صاحب ان سے بڑی بے اعتنائی برتتے ہیں۔ حالانکہ انصار یہ بات ماننے کے لیے آمادہ نہیں تھا۔ پھر بھی اسے ان کے اس طرح کے دکھڑے سننا پڑتے۔

لیکن اتنی بات ضرور تھی کہ وہ مزاج کی بہت اچھی تھیں۔ کبھی انہوں نے ایسا رویہ اختیار نہیں کیا جس سے اس کی دل شکنی ہوتی۔ بلکہ اس کی دیکھ بھال کے سلسلے میں وہ برابر مستعدی اور دلچسپی کا اظہار کرتیں۔ غرضیکہ انصار کو اس کوٹھی میں ہر طرح کی آسائش تھی۔ وہ خاصا مطمئن تھا۔ اب اس کی صحت بھی عمدہ ہو گئی تھی۔

انہی دنوں کا ذکر ہے۔ ایک روز جب وہ تنخواہ کے روپے جیب میں ڈال کر بال بچوں کے لیے کچھ سامان خریدنے بازار گیا تو بس سٹینڈ پر ادھیڑ عمر کا وہ نجومی مل گیا جس سے اس کی پہلی ملاقات آچاریہ مینشن کی تیسری منزل کے ایک کمرے میں ہوئی تھی۔ اس نے انصار کو پہچان لیا۔ کئی بار سر سے پاؤں تک بغور دیکھا۔ رخساروں سے پھوٹتی ہوئی سرخی' آنکھوں میں آب و تاب اور عمدہ سلا ہوا ہلکا سا سرمئی سوٹ۔ وہ اچھا خاصا اسمارٹ نظر آ رہا تھا۔ وہ چند لمحے انصار کو حیرت سے دیکھتا رہا۔ پھر اس سے پوچھ ہی لیا۔

''آج کل آپ کیا کر رہے ہیں؟''

''ایک غیر ملکی فرم میں اسسٹنٹ منیجر ہوں۔'' انصار نے اس پر رعب گانٹھنے کے لیے سخن سازی سے کام لیا۔

وہ اس کے متعلق کچھ اور بھی معلوم کرنا چاہتا تھا۔ اس نے انصار سے پوچھا۔ ''تنخواہ کیا مل رہی ہے۔''

انصار اسے زیادہ سے زیادہ مرعوب کرنے پر تلا ہوا تھا۔ بڑی بے نیازی سے بولا۔ ''فی الحال تو پانچ سو روپے مل رہے ہیں۔''

وہ اس کی باتوں سے واقعی خاصا مرعوب ہو گیا۔ دونوں باتیں کرتے ہوئے ایک ریستوران میں چلے گئے۔ ادھیڑ عمر نجومی نے ایک دفعہ پھر زائچہ تیار کیا اور بتانے لگا۔ ''ابھی تو آپ اور ترقی کریں گے مگر کوئی عورت ہے جو ناگن کی طرح آپ کی راہ میں حائل ہے۔ کیا آپ کی شادی ہو چکی ہے؟''

لیکن انصار نے اس روز جیسے جھوٹ بولنے کی قسم کھائی تھی' صاف مکر گیا۔ ''جی نہیں' ابھی تک تو اکیلا ہی ہوں۔''

وہ ذرا دیر تک خاموش بیٹھا غور کرتا رہا' پھر اس نے مشورہ دینے کے انداز میں کہا۔ ''خیر ایسا ہی ہوگا' لیکن اگر کہیں شادی بیاہ کا سلسلہ چل رہا ہے تو فوراً ختم کر دیجیے۔''

انصار نے خواہ مخواہ اس کی تائید بھی کر دی۔ ''جی ہاں' میری منگنی تو ایک جگہ ہو چکی ہے۔''

نجومی ایک بار پھر چونک پڑا۔ ''دیکھئے اب آپ نے پتے کی بات بتائی۔ اس رشتے کو جس قدر جلد ہو سکے منقطع کر دیجیے۔ البتہ

کسی اور جگہ ہو سکے تو شادی کر لیجئے۔ پھر دیکھئے آپ کا ستارہ کس بلندی پر پہنچتا ہے۔"

مگر انصار نے اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ "جی نہیں' ابھی تو کوئی ایسا ارادہ نہیں ہے۔"

لیکن وہ باز نہ آیا۔ انصار کو سمجھانے لگا۔ "میں آپ ہی کی بہتری کے لیے کہہ رہا ہوں۔ البتہ اتنا ضرور خیال رکھئے گا کہ شادی کرنے سے پہلے مجھ سے زائچہ بنوا لیجئے گا۔ خدانخواستہ اگر ستارے نہیں ملے تو پھر کوئی آفت بھی نازل ہو جائے تو کچھ عجب نہیں۔"

دونوں کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد اٹھنے لگے تو اس نے چلتے چلتے انصار کو ٹوکا۔ "بھئی یہ تو بتاتے جایئے کہ آج کل آپ رہتے کہاں ہیں؟"

"میں اپنے خالو کے ساتھ مقیم ہوں۔" انصار نے پھر جھوٹ بولا اور ملک عرفان علی کی کوٹھی کا پتہ بتا دیا۔

اس سے رخصت ہو کر انصار نے دکانوں پر جا کر سامان خریدا اور برابر یہ سوچتا رہا کہ ستاروں کی چال کا حساب تو محض مسخرہ پن ہے۔ مگر یہ نجومی جو کچھ کہتا ہے اس میں کچھ نہ کچھ صداقت ضرور ہوتی ہے۔ یہی سوچتا ہوا وہ سامان کی بنڈلوں سے لدا پھندا گھر پہنچ گیا۔

اب شام ہو چکی تھی۔ اس کی بیوی باورچی خانے میں مصروف تھی۔ وہ خاموش بیٹھا اس کا انتظار کرتا رہا۔ کوئی آدھ گھنٹہ بعد آئی تو انصار نے پیکٹ کھول کر ساری چیزیں اس کے سامنے ڈال دیں اور ایک جھلملاتی ہوئی ساڑھی اٹھا کر بولا۔

"کہو' کچھ آئی پسند؟ خدا کی قسم سارا بازار چھان مارا۔"

وہ اس کی طرف داد طلب نظروں سے دیکھنے لگا۔ لیکن حسب معمول اس دفعہ بھی اس نے بڑی سرد مہری سے جواب دیا۔ "ہاں اچھی ہے' مگر بھابی جان کی پرسوں جو ساڑھی آئی ہے' نہ جانے کہاں سے خریدی ہے' نظر نہیں ٹھہرتی۔"

انصار کے پہلو میں جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا۔ وہ دل برداشتہ ہو کر سوچنے لگا' آخر یہ مجھے اس طرح کمتر ثابت کرنے کی کیوں کوشش کرتی ہے۔ ٹھیک ہے کہ فرید کو مجھ سے زیادہ تنخواہ ملتی ہے لیکن یہ عورت کب تک اپنے میکے کی بڑائی سے اس طرح مرعوب کرتی رہے گی۔

وہ اسی طرح خاموش بیٹھا ہوا پیچ و تاب کھاتا رہا۔ اسی اثناء میں باہر لان میں اختر کے رونے کی آواز ابھری۔ یہ اس کا پانچ سالہ بیٹا تھا۔ وہ فوراً باہر چلا گیا۔ اس نے دیکھا کہ فرید کی چھوٹی بچی اسے فرش پر گرا کر منہ نوچ رہی ہے۔ قریب ہی کرسی پر بیٹھی ہوئی بھابی جان اطمینان سے کوئی رسالہ پڑھ رہی تھیں۔ ان کی اس بے نیازی پر کڑھتا ہوا وہ اختر کے پاس چلا گیا۔ ننھی کی گرفت سے چھڑا کر جب انصار نے اختر کو علیحدہ کیا تو اس کے رخساروں پر ناخنوں کی خراشوں سے خون چھلک آیا تھا۔ وہ پھر بھی چپ رہا۔ لیکن جب ننھی

نے اس کے سامنے جھپٹ کر دوبارہ اختر کا منہ نوچا تو بے قابو ہو گیا۔ اس نے ننھی کی پیٹھ پر دھکانے کے لیے آہستہ سے ایک دھپ لگایا اور اختر کو گود میں اٹھا کر اپنے کمرے میں آ گیا۔

یکا یک شام کی سناٹے میں ننھی کی تیز چیخیں ابھرنے لگیں اور اس کے ساتھ ہی بھابی جان بھی بڑبڑانے لگیں۔ اس نے ان کی باتوں پر کوئی توجہ نہیں دی بلکہ بسکٹ کا پیکٹ کھول کر اختر کو کھلانے لگا۔ البتہ جب اس کی بیوی اختر کو گھسیٹتی ہوئی بھابی جان کے سامنے لے گئی تو اسے بھی غصہ آ گیا۔ اس نے بیوی کو ڈانٹا۔ وہ بھی بپھر گئی۔ لگی کلا بہ کلا جواب دینے۔ بات قطعی معمولی تھی' مگر اس نے جلد ہی ہنگامے کی صورت اختیار کر لی۔

جب دروازے سے باہر نکل رہا تھا تو اس نے دیکھا' پاس پڑوس کی عورتیں دروازوں اور کھڑکیوں پر کھڑی حیرت سے اس کی جانب دیکھ رہی تھیں۔ گھر کے اندر بیوی زور زور سے چیخ رہی تھی' ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی وہ اپنی قسمت کا گلہ کر رہی تھی۔ اپنے ماں باپ کو کوسنے دے رہی تھی۔ اور اسے برا بھلا کہہ رہی تھی۔ یوں تو اس قسم کے جھگڑے اکثر دونوں کے درمیان ہوتے رہتے تھے' مگر اس روز اسے رہ رہ کر یہ خیال آ رہا تھا کہ سچ مچ اس کی بیوی ناگن ہے۔

اسی عالم میں جب وہ ملک عرفان علی کی کوٹھی پر پہنچا تو بیگم صاحبہ دروازے ہی پر مل گئیں۔ اسے پریشان دیکھ کر بولیں۔ ''خیریت تو ہے' تمہارا چہرہ اس قدر کیوں اترا ہوا ہے؟''

وہ اس وقت کسی سے بھی بات نہیں کرنا چاہتا تھا' اس نے حیلہ جوئی سے کام لیا۔ '' کچھ نہیں' طبیعت کچھ سست ہو رہی ہے۔'' اتنا کہہ کر وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد اس نے دیکھا' بیگم صاحبہ ڈاکٹر کے ہمراہ دروازے پر کھڑی ہیں۔ ڈاکٹر نے اس کا معائنہ کیا اور نسخہ لکھ دیا۔ چنانچہ اسے خواہ مخواہ کڑوی کسیلی دوا پینی پڑی۔

کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ رات گئے اسے واقعی کچھ حرارت ہو گئی۔ دوسرے روز بخار کچھ اور تیز ہو گیا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ ملیریا ہے۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ پھر بھی ہر طرح اس کی دیکھ بھال ہوتی۔ بچوں کی طرح ناز برداری کی جاتی۔

بیماری سے چھٹکارا نہیں ملا تھا کہ ایک روز سہ پہر کو ادھیڑ عمر نجومی آ گیا۔ ہمیشہ کی طرح اس ملاقات میں بھی وہ اسے آنے والی خوشحالی کے متعلق بہت سی باتیں بتاتا رہا۔ محرومی کے شکار متوسط طبقے کے ایک نوجوان کی طرح' جس نے زندگی میں صرف سہانے خواب ہی دیکھے ہوں' یہ باتیں بڑی مسرت بخش تھیں۔

گفتگو کے دوران میں نجومی نے چوکنا نظروں سے دروازے کی جانب دیکھا اور پھر جیب سے ایک فوٹو نکال کر انصار کے سامنے

کر دیا۔ یہ کسی لڑکی کی تصویر تھی۔ اس نے پہلی ہی نظر میں اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ معمولی شکل وصورت کی عام سی لڑکی ہے۔ اس نے توجہ دے کر تصویر کو دیکھا بھی نہیں بلکہ شرما کر نگاہیں موڑ لیں اور اس سے دریافت کیا۔

''کس کا فوٹو ہے؟''

''میں نے اس لڑکی کو آپ کے لیے پسند کیا ہے۔ اس کا ستارہ آپ سے ملتا ہے۔ اگر آپ دونوں کا رشتہ ہو جائے تو پھر دیکھئے گا آپ کی زندگی میں کتنا بڑا تغیر نمودار ہو گا۔ بجلی کے دونوں تار مل کر جس طرح روشنی پیدا کرتے ہیں اسی طرح آپ کا ستارہ روشن ہو جائے گا۔'' وہ بے ساختہ ہنسنے لگا۔

انصار کچھ پریشان ہو گیا۔ اس مسئلے پر اس نے ابھی تک سنجیدگی سے غور ہی نہیں کیا تھا۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ وہ اپنی بیوی سے بے حد نالاں ہو چکا تھا' لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں ہو سکتا کہ وہ کوئی ایسا قدم اٹھائے جو اس کی بیوی بچے کے لیے عذاب بن جائے۔ کچھ یہی سوچ کر اس نے پہلوتہی سے اختیار کرنے کی کوشش کی۔

''دراصل یہ ایسی بات ہے جس کا جواب میں فوری طور پر نہیں دے سکتا۔''

وہ بے تکلفی سے بولا۔ ''کوئی مضائقہ نہیں' بہتر ہو گا کہ آپ مجھے اپنے خالو جان سے ملوا دیں۔ سچ پوچھئے تو یہ باتیں ان ہی سے طے کرنے کی ہیں۔''

انصار پریشان ہو گیا۔ اس نے سوچا' اگر کہیں ایسا ہو گیا تب تو بڑی مشکل پڑ جائے گی۔ اس نے فوراً ہی عذر پیش کیا۔

''خدا کے لیے کہیں ایسا غضب بھی نہ کیجئے گا۔ سچ پوچھئے تو بات یہ ہے کہ میں نے جس منگنی کا ذکر کیا تھا وہ ان ہی کی بیٹی سے تو ہوئی ہے۔ کہیں ان کو یہ بات معلوم ہو گئی تو ہنگامہ برپا ہو جائے گا۔ میں دراصل اس سلسلے میں اپنے گھر والوں کو خط لکھ کر مشورہ کروں گا۔''

خیریت ہوئی کہ بات بن گئی' نجومی نے بھی مزید اصرار نہ کیا۔

دونوں دیر تک باتیں کرتے رہے۔ آخر وہ دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ اس کے جانے کے تھوڑی دیر بعد ہی ملک صاحب کی بڑی لڑکی آ گئی۔ اس نے انصار کو دوا دی اور جس طرح خاموشی سے آئی تھی اسی طرح واپس چلی گئی۔ وہ کم سخن اور شائستہ لڑکی تھی' خوب رو بھی رہی تھی۔ اس کے ہر انداز میں گھریلو پن نمایاں تھا۔ عرصہ دراز کے بعد انصار نے اسے پوری توجہ سے دیکھا تھا اور یہ محسوس کر کے اسے ہنسی آ گئی کہ وہ اسے اپنی منگیتر بتا چکا ہے۔

انصار ملیریا سے کچھ عرصہ بعد صحت یاب ہو گیا۔ لیکن اسے قطعی طور پر اندازہ ہو گیا کہ ملک عرفان کے گھر کا ہر فرد اسے اپنے ہی کنبے کا حصہ سمجھتا تھا۔ بلکہ علالت کے دوران میں جس طرح توجہ کے ساتھ اس کی تیمارداری اور دیکھ بھال کی گئی اتنی تو اسے اپنے گھر میں بھی نصیب نہ ہوتی۔ یہ اور ایسی ہی کتنی اور باتوں نے مل جل کر ملک عرفان علی کے گھرانے کے ساتھ قریبی وابستگی پیدا کر دی۔ اب وہ زیادہ تندہی سے سب کو پڑھاتا۔ بیگم صاحبہ کی باتوں میں پوری دلچسپی کا اظہار کرتا۔ یہ لگاؤ کچھ اس قدر بڑھتا گیا کہ اب وہ بیوی بچوں سے ملنے میں بھی لاپرواہی برتنے لگا۔

حسب وعدہ ایک روز ادھیڑ عمر نجومی پھر وہاں آ گیا۔ اس دفعہ اسے دیکھ کر وہ کچھ پریشان سا ہو گیا۔ اس لیے کہ وہ اس کی آمدورفت زیادہ بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن اس روز اس کے لباس میں خاصا اہتمام تھا۔ وہ بڑا خوش نظر آ رہا تھا۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد جلد ہی حرف مطلب پر آ گیا۔

''کہئے' کیا طے کیا آپ نے؟ دراصل مجھے سب سے زیادہ دلچسپی اس بات میں ہے کہ میں اپنے علم کی آزمائش چاہتا ہوں۔ آپ کے زائچے پر یقین مانئے' میں نے بڑی محنت کی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہو''

اس دفعہ انصار نے کسی تکلف سے کام نہیں لیا۔ بلکہ بڑی بے باکی سے پوچھا۔ ''پہلی بات تو یہ ہے کہ میں ان لوگوں متعلق کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں' جن کی طرف سے آپ نمائندگی کر رہے ہیں۔'' وہ بے تکلفی سے مسکرانے لگا۔

''یہ نمائندگی کی بات آپ نے بالکل درست کہی۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ انہوں نے مجھے ہر طرح کی اجازت دے دی ہے۔ وہ میرے دیرینہ کرم فرما ہیں۔ ایک مقامی فرم میں اکاؤنٹنٹ ہیں۔ خاندانی آدمی ہیں۔ خوش اخلاق اور بڑے وضع دار ہیں۔ لڑکی کی تعلیم تو زیادہ نہیں لیکن بے حد سگھڑ اور سلیقہ مند ہے اور پھر اس کا ستارہ۔۔۔۔۔۔ خدا کی قسم' میں نے اس کا زائچہ بنا کر دیکھا تو دنگ رہ گیا۔ اللہ تعالیٰ نے کیا قسمت بنائی ہے۔

انصار اس کی باتوں میں دلچسپی لیتا رہا۔ مگر آج وہ طے کر چکا تھا کہ کسی نہ کسی طور اس سلسلے کو اب ختم ہی کر دیا جائے۔ چنانچہ اس نے بڑی ٹیڑھی سی شرط اس کے سامنے رکھ دی۔

''دیکھئے میرا ابھی تو کوئی ایسا ارادہ نہیں۔ البتہ میں یہ ضرور سوچ رہا ہوں کہ کسی طرح اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے لندن چلا جاؤں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ میرے پاس اب تک کل دو ہزار روپے اکٹھا ہوئے ہیں۔ خالو جان سے اس سلسلے میں کچھ کہنا نہیں چاہتا' ورنہ وہ تو خوشی سے تیار ہو جائیں گے۔ آپ نے تاکید کی کہ یہ منگنی راس نہیں آئے گی۔ لہٰذا اب مسئلہ یہ درپیش ہے کہ اگر ۲۵ ہزار

روپے مل جائیں تو میں پوری طرح آمادہ ہوں۔ ورنہ سردست میں نے اس پروگرام کو ملتوی کردیا ہے۔"

وہ خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری تھی۔ دیر تک بیٹھا کچھ سوچتا رہا۔ آخر انصار نے خود ہی کہا۔

"آپ خواہ مخواہ کیوں پریشان ہو رہے ہیں؟ ان سے مشورہ کر کے بتا دیجئے گا۔ میرا خیال ہے کہ میں نے کوئی بے جا شرط تو پیش نہیں کی۔"

"یہی تو میں بھی غور کر رہا ہوں' آپ کا مطالبہ بھی کسی حد تک درست ہے۔ لیکن یہ ممکن بھی ہے کہ نہیں۔" وہ ایک بار پھر گہری خاموشی میں غرق ہو گیا۔ انصار اس کے چہرے کا بغور جائزہ لیتا رہا۔ ذرا دیر بعد اس نے جواب دیا۔

"میرا خیال ہے کہ وہ اس پر رضامند ہو جائیں گے۔ مگر اتنا خیال رکھئے۔ لندن جانے سے قبل آپ کو شادی کی تمام ضروری رسمیں ادا کرنا ہوں گی۔ یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں آخران کے اطمینان کے لیے بھی تو کچھ نہ کچھ ہونا چاہیے۔"

انصار نے بلا جھجک اس کی شرط قبول کر لی اور یہ سوچ کر قبول کر لی کہ کسی ایسے شخص کے لیے اسے پورا کرنا ناممکن ہے جو کسی فرم میں معمولی اکاؤنٹنٹ ہے۔ اس کے جانے سے پہلے انصار نے احتیاطاً یہ بھی طے کر لیا کہ یہاں بلانے کی بجائے وہ خود اس کے پاس پہنچ جائے۔

"حالات کا تقاضا ہے کہ اب آپ یہاں آنے کی زحمت نہ کریں۔ میں خود آپ کے پاس پہنچ جاؤں گا۔ یہ فرمائیے کہ آپ سے کہاں ملاقات ہو سکتی ہے؟"

اس نے صورت حال کی نزاکت محسوس کرتے ہوئے انصار کی رائے سے اتفاق کیا۔ سنجیدگی سے بولا۔ "آپ کا خیال درست ہے' میں شام کو عام طور پر لوٹس ریسٹوران میں بیٹھتا ہوں۔ آپ وہاں مجھ سے مل سکتے ہیں۔" اس نے مزید بات چیت نہیں کی۔ جانے کے لیے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

اس کے باہر نکلنے کے بعد انصار نے سوچا' شاید اب یہ نجومی دوبارہ نہ آئے اور اگر آیا بھی تو شادی بیاہ کے بارے میں گفتگو کرنے کی جرات نہیں کرے گا۔

شام کو وہ اپنے کمرے میں لیٹا ہوا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا کہ خلاف توقع ملک صاحب آ گئے۔ اسے بستر پر لیٹا ہوا دیکھ کر بولے۔

"کیا کچھ طبیعت خراب ہے؟"

"جی نہیں باہر جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا' اس لیے کمرے میں چلا آیا۔" انصار نے وضاحت کی۔

"میں دیکھ رہا ہوں کہ ادھر کچھ دنوں سے تم سست نظر آ رہے ہو۔" انہوں نے مسکرا کر مشورہ دیا۔ "میرا خیال ہے کہ اب تم اپنا گھر بسا لو۔ اسی لیے تم کھوئے کھوئے رہتے ہو اور کچھا کتائے ہوئے سے رہتے ہو۔" انصار نے کسی قدر شرما کر کہا۔ "ایسی تو کوئی بات نہیں' بلکہ یہاں تو مجھے اس قدر آرام و سکون ہے کہ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔"

وہ ہنسنے لگے۔ "تم خواہ مخواہ مجھے شرمندہ کر رہے ہو' یقین مانو میں تمہارے لیے بہت کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ تم پریشان نہ ہو۔ انشاء اللہ سب بہتر ہی ہوگا۔ وقت آنے پر تم کو خود ہی علم ہو جائے گا کہ مجھے تمہارا کتنا خیال ہے۔" وہ اسی طرح دل جوئی کی باتیں کر کے چلے گئے۔

لیکن وہ دیر تک ان کی باتوں پر غور کرتا رہا۔ رفتہ رفتہ اسے یہ بھی محسوس ہونے لگا کہ بیگم صاحبہ بھی روز بروز اس پر مہربان ہوتی جا رہی ہیں۔ بچے اسے اب "ماسٹر صاحب" کے بجائے بھائی جان کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ اس تبدیلی پر اس نے بڑے جذباتی انداز سے سوچنا شروع کر دیا۔

سوئے اتفاق انہی دنوں ایک شام کو اپنے گھر گیا تو بیوی سے پھر چخ چخ ہو گئی۔ وہ سدا کی تنک مزاج تھی۔ ایسی غضب ناک ہوئی کہ اسے نکھٹو اور ہڈحرام تک کہہ دیا۔ انصار اس طعنہ زنی پر سخت برہم ہوا۔ اس نے جھنجھلا کر کچھ کہنا چاہا تو بھاوج بیچ میں بول پڑیں۔ نند کی حمایت میں کہنے لگیں۔

"اتنے لال پیلے کیوں ہو رہے ہو؟ کیا غلط کہہ رہی ہے صفیہ؟ تم ڈھنگ کا کوئی کام دھندا تو کرتے نہیں۔ بے چاری ایک ایک چیز کو ترستی رہتی ہے۔ اوپر سے تم بات بات پر آنکھیں دکھاتے ہو۔ گھر میں آتے ہو تو ہمیشہ کچوکے ہی لگاتے ہو۔"

انصار کو غصہ تو بہت آیا مگر وہ اس سے الجھنا نہیں چاہتا تھا۔ خون کا سا گھونٹ پی کر رہ گیا۔ خاموشی سے اپنے کمرے میں چلا گیا اور بستر پر لیٹ کر سوچنے لگا کہ نجومی سچ کہتا ہے۔ یہ بیوی نہیں ناگن ہے جو ہر دم اسے ڈستی رہتی ہے۔ اس نے زندگی عذاب بنا دی ہے۔ اس ناگن سے تو اب جلد سے جلد چھٹکارا حاصل کر لینا چاہیے۔ اسی اثناء میں بیوی غصے سے بڑبڑاتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ اس وقت بھی اسے جلی کٹی سنا رہی تھی۔ انصار اس کی باتیں سن کر اور برافروختہ ہو گیا۔ تڑپ کر بستر سے اٹھا' بیوی کو تیکھے لہجے میں مخاطب کیا۔

"دیکھو صفیہ! اب میرا تمہارے ساتھ نباہ نہیں ہو سکتا۔" اس کا لہجہ اور درشت ہو گیا۔ "میں آئندہ اس گھر میں قدم نہیں رکھوں گا۔"

مگر وہ ذرا مرعوب نہ ہوئی، جل کر بولی۔ ''پہلے ہی کون سا سکھ پہنچاتے تھے، نہ آؤ گے تو کون سی قیامت آ جائے گی؟''

انصار چراغ پا ہونے کے بجائے سنجیدہ ہو گیا۔ ''میں وکیل کے ذریعے طلاق نامہ بھجوا دوں گا۔ خدا حافظ!'' وہ مڑا اور بیوی کے جواب کا انتظار کئے بغیر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

بیوی ابھی تک کمرے میں تھی۔ اس نے تڑپ کر دہائی دی۔ ''ہائے اللہ! آج میرا سہاگ اجڑ گیا۔'' اس نے پلنگ کی پٹی پر اس طرح زور سے ہاتھ مارا کہ کلائیوں میں پڑی ہوئی چوڑیاں چھن چھن کر کے ٹوٹ گئیں۔ ''میں آج بیوہ ہو گئی۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ انصار نے ان تمام آوازوں کو سنا مگر اس کے قدم نہ رکے۔ نہ مڑ کر بیوی کو دیکھا۔ گھر سے باہر گیا اور ملک عرفان علی کی کوٹھی کی جانب روانہ ہو گیا۔

رات گئے تک وہ بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا اور برابر سوچتا رہا۔ دوسرا دن بھی بے چینی میں گزرا۔ کئی روز اسی الجھن اور ذہنی خلفشار کے عالم میں گزرے۔ آخر اس نے بہت سوچ بچار کر کے بیگم صاحبہ کے نام خط لکھا۔ جس میں دبی زبان سے اس بات کا اظہار کیا کہ اگر اسے اپنی فرزندی میں قبول کر لیا جائے تو ہمیشہ کی طرح ان کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ خط تو اس نے لکھ لیا لیکن تمام دن اسے لیے بیٹھا رہا۔ دراصل ابھی تک وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکا تھا۔ مگر اس نے رات کا کھانا کھانے کے بعد بیگم صاحبہ کو جرات کر کے اپنا خط دے ہی دیا۔ یہ رات بھی بے چینی میں کٹی۔ کچھ تو ادھیڑ عمر نجومی کی بات اور کچھ ملک صاحب کے سرپرستانہ برتاؤ سے اسے یقین تھا کہ نتیجہ کچھ نہ کچھ بہتر ہی نکلے گا۔

لیکن صبح یہ دیکھ کر اسے سخت تعجب ہوا کہ نہ تو دونوں لڑکے پڑھنے کے لیے اس کے پاس آئے اور نہ بیگم صاحبہ نے اسے بلوایا۔ البتہ دن چڑھے ملک صاحب خود اس کے کمرے میں آئے۔ ان کے ماتھے پر بل دیکھ کر وہ گھبرا گیا۔ وہ ذرا دیر خاموش کھڑے رہے، پھر انہوں نے ایک سو بہتر روپے نکال کر اس کے سامنے ڈال دیئے اور تیکھے لہجے میں بولے۔

''یہ آپ کی آج تک کی تنخواہ ہے۔ میں آپ کو دو روز کی مہلت دیتا ہوں۔ اس عرصے میں اپنے رہنے کا کہیں اور انتظام کر لیجیے۔''

انہوں نے مڑ کر اس کی جانب دیکھا بھی نہیں۔ آگے بڑھے اور تیزی سے باہر چلے گئے۔ انصار سناٹے میں آ گیا۔ اس نے بیگم صاحبہ سے ملنا چاہا مگر وہ اس قدر ناراض تھیں کہ ملنا تک گوارا نہ کیا۔

انصار اس قدر نادم اور شرمسار تھا کمرے سے باہر نہ نکلا۔ دوپہر کا کھانا بھی ملازم کمرے ہی میں لے آیا تھا۔ طبیعت اس قدر

بوجھل ہو رہی تھی کہ وہ کھانا بھی نہ کھا سکا۔ چند ہی لقموں کے بعد اس نے ہاتھ کھینچ لیا۔ وہ کمرے میں گم صم بیٹھا رہا اور مسلسل سوچتا رہا۔ معاً اسے ادھیڑ عمر نجومی یاد آ گیا۔ اس نے جھنجلا کر دل ہی دل میں اس برا بھلا بھی کہا۔ حرام زادے نے ایسی پٹی پڑھائی کہ اپنا تو کباڑا ہو گیا۔ لگی لگائی نوکری بھی گئی اور خفت بھی اٹھانا پڑی۔ پھر اس نے سوچا' ہو سکتا ہے کہ وہ ٹھیک ہی کہہ رہا ہو۔ اسے اندھیرے میں امید کی کرن نظر آئی۔ اس نے نجومی سے ملنے کی ٹھانی۔ اٹھا اور غسل خانے میں جا کر غسل کیا۔ لباس تبدیل کیا اور کوٹھی سے نکل کر سیدھا لوٹس ریستوران پہنچا' مگر نجومی وہاں موجود نہ تھا۔

انصار ریستوران میں بیٹھ کر نجومی کا انتظار کرنے لگا۔ دن ڈھلنے لگا۔ سائے طویل ہو گئے۔ مگر نجومی نہ آیا۔ انصار کاؤنٹر پر پہنچا۔ منیجر سے نجومی کے بارے میں دریافت کیا۔ وہ اسے جانتا تھا۔ اس نے بتایا کہ کئی روز سے ادھر نہیں آیا۔ انصار نے مزید معلومات کی غرض سے پوچھا۔

''وہ کہاں کام کرتے ہیں؟''

یہ سن کر انصار کو تعجب ہوا کہ وہ کسی ٹیکسٹائل مل کے دفتر میں اکاؤنٹنٹ ہے۔ انصار کسی نہ کسی طور اسی روز اس سے ضرور مل لینا چاہتا تھا۔ دفتر میں تو اب اس کے ملنے کا امکان نہ تھا۔ اس نے منیجر سے اس کے گھر کا پتہ معلوم کرنا چاہا مگر اسے معلوم نہ تھا۔ البتہ اس نے ایک بیرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس بیرے کو شاید معلوم ہو۔ یہ ان کو اچھی طرح جانتا ہے۔''

انصار بیرے کے پاس گیا۔ اسے ایک طرف لے جا کر نجومی کے گھر کا پتہ دریافت کیا اور اس نے بتا بھی دیا۔

انصار ریستوران سے نکل کر نجومی کے گھر پہنچا۔ وہاں سب پریشان تھے۔ وہ پچھلے پانچ روز سے گھر نہیں پہنچا تھا۔ انصار کو یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوا کہ اس کے کئی چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ گھر میں کوئی بھی ایسا نہ تھا کہ پوری تندہی اور مستعدی سے اسے تلاش کرتا۔ صرف ایک بھتیجا تھا جو پچیس برس کے لگ بھگ تھا۔ مگر وہ بھی سگا بھتیجا نہ تھا۔ لاابالی اور یاوہ گو تھا اور سخت بدظن بھی معلوم ہوتا تھا۔ انصار کے دریافت کرنے پر منہ بگاڑ کر بے نیازی سے بولا۔

''پتہ نہیں کہاں چلے گئے؟ ہر جگہ ڈھونڈنے گیا مگر کہیں نہ ملے۔ میں تو کہتا ہوں چچی خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہیں۔'' وہ اپنی بات کہتے کہتے ہنسنے لگا۔ ''اجی وہ ہوں گے کہاں ۔۔۔۔۔۔ کہیں بیٹھے زائچوں زائچہ بنا رہے ہوں گے۔ ان پر تو ہر وقت نجوم کا بھوت سوار رہتا ہے۔ دن میں بھی ستاروں کی چال دیکھتے رہتے ہیں۔''

''مگر پانچ روز تک وہ کہیں بیٹھ کر زائچہ نہیں بنا سکتے۔'' انصار نے اپنے ردعمل کا اظہار کیا۔ ''کم از کم گھر پر تو اطلاع کر دیتے۔''

''اجی میں آپ کو کیا بتاؤں' وہ ایسے ہی من موجی آدمی ہیں۔'' وہ ذرا بھی پریشان اور متفکر نظر نہیں آتا تھا۔ ''میں تو یہاں آتا بھی نہیں۔ چچی بلانے آئیں تو چلا آیا۔''

''ان کا کوئی جوان بیٹا نہیں؟''

''لڑکیاں ہی جوان ہیں۔ ایک نہیں' اکٹھی چار۔ لڑکے سب ہی کم عمر ہیں اور ایک نمبر پاجی ہیں۔'' اس نے بیزاری سے کہا۔ ''سالے' تمام دن آوارہ گردی کرتے پھرتے ہیں' باپ غیب کا حال بتاتے پھرتے ہیں اور اپنے گھر کی خبر نہیں۔''

انصار نے اس سے مزید بات چیت نہ کی۔

وہاں سے لوٹا تو دل پر ایک بوجھ سا تھا۔ راستے میں اس نے شام کو شائع ہونے والا اخبار خرید ا اور اسے پڑھنے لگا۔ پچھلے صفحے پر ایک گوشے پر اس کی نظر پڑی تو دم بخود رہ گیا۔ پاسپورٹ سائز کی ایک تصویر کے نیچے یہ عبارت درج تھی۔

''یہ شخص ہماری فرم میں بحیثیت اکاؤنٹ ملازم تھا اور اب پچیس ہزار روپے کا غبن کر کے مفرور ہے۔ جو کوئی اس کی گرفتاری میں امداد وتعاون کرے گا اسے دو ہزار روپے بطور انعام پیش کئے جائیں گے۔''

یہ اشتہار ڈائمنڈ ٹیکسٹائل ملز کے مینجنگ ڈائریکٹر کی جانب سے شائع کرایا گیا تھا۔ انصار نے تصویر کو پہلی ہی نظر میں پہچان لیا۔ وہ ادھیڑ عمر نجومی ہی تھا۔ انصار کو صدمہ بھی ہوا اور تشویش بھی لاحق ہوئی۔ اس نے سوچا' نجومی اب تک روپوش کیوں ہے؟ اسے اپنے منصوبے کے مطابق اب تک اس سے مل لینا چاہیے تھا۔ اچھا ہی ہوا کہ وہ اس کے پاس نہ آیا' ورنہ عین ممکن ہے پولیس والے بھی اس کی تلاش میں پیچھے پیچھے پہنچ جاتے۔ چھاپہ پڑتا' نجومی تو گرفتار کر ہی لیا جاتا' اس کے ساتھ ساتھ اعانت جرم کے الزام میں وہ بھی دھر لیا جاتا اور جیل کی ہوا کھاتا۔ یہ خیال ذہن میں آتے ہی نجومی خطرہ بن کر انصار کے سر پر منڈلانے لگا۔ وہ کسی بھی وقت اس کے پاس پہنچ سکتا تھا۔

انصار اس وقت ملک عرفان کی کوٹھی کی جانب جا رہا تھا۔ چلتے چلتے اس کے قدم رک گئے۔ ملک عرفان علی کی کوٹھی جانا خطرے کو دعوت دینا تھا۔ وہ کچھ دیر گومگو کے عالم میں سڑک کے کنارے کھڑا رہا۔ پھر اس کے قدم گھر کی سمت اٹھ گئے اور وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔

◆◆◆

چور دروازہ

تڑاق سے کوئی چیز فرش پر گری۔ یہ شیشے کے برتن ٹوٹنے کی آواز تھی۔ میں گہری نیند سو رہا تھا۔ آہٹ سے آنکھ کھل گئی۔ ذرا ہی دیر بعد ایک اور چھنا کا ہوا۔ پھر تو لگا تار چھن چھن کر کے شیشے ٹوٹنے لگے۔ میز اور کرسیاں گرنے اور الٹنے لگیں۔ اور ان کے ساتھ ساتھ دھما دھم کی آوازیں آنے لگیں۔

شور اوپر کی منزل پر ہو رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دو آدمی گتھم گتھا ہو کر بڑے غیظ وغضب کے عالم میں لڑ رہے ہیں۔

جاڑوں کی سنسان رات تھی۔ باہر تیز ہوا چل رہی تھی۔ سردی کے مارے برا حال تھا۔ میں لحاف میں دبکا ہوا سکتے کے عالم میں خاموش پڑا رہا۔ کئی منٹ بعد رات کے سناٹے میں پروفیسر کی آواز سنائی دی۔ وہ غصے سے چیخ رہا تھا۔

"بے ہودہ' بدتمیز' نامعقول"

"نکل جاؤ یہاں سے۔"

"دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔"

اچانک لکڑی کے زینے پر بھاری بھاری قدموں کی آہٹ ابھری۔ دروازہ تیزی سے کھلا اور بند ہو گیا۔ میں اسی طرح سہما ہوا بستر میں دبکا ہوا لیٹا رہا۔ کچھ ہی دیر بعد میرے کمرے کے دروازے پر کسی نے آہستہ سے دستک دی۔

"شہیر ــــــــ مسٹر شہیر!"

یہ پروفیسر کی آواز تھی۔ اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔ میں نے اس وقت اٹھ کر دروازہ کھولنا مناسب نہ سمجھا۔ مست مارے پڑا رہا۔ پروفیسر رک رک کر دھیمے لہجے میں مجھے پکارتا رہا۔ آخر جھنجھلا کر گویا ہوا۔ "یہ شخص تو بڑی خراب نیند سوتا ہے۔" اور بڑبڑاتا ہوا اوپر چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد بھی مجھے دیر تک نیند نہ آئی۔ بے چینی سے پڑا کروٹیں بدلتا رہا۔

سویرے میں پروفیسر کے پاس گیا تو دیکھا' کمرے میں ہر طرف شیشے کے ٹکڑے بکھرے ہیں۔ ان میں ٹوٹے ہوئے گلاس تھے' گلدان تھے' تصویروں کے فریم تھے۔ ایک طرف وسکی کی خالی بوتل بھی پڑی تھی۔ کمرے کا سارا فرنیچر الٹا پلٹا ہوا تھا۔ سامنے

ایک ٹوٹے ہوئے صوفے پر پروفیسر ٹھوڑی پر ہاتھ رکھے خاموش بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔ اس کا چہرہ ویران اور اجڑا ہوا نظر آ رہا تھا۔ ہونٹ خشک تھے۔ آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تمام رات اسی ٹوٹے ہوئے صوفے پر جاگ کر گزاری ہے۔ اسی عالم میں اس نے میری طرف ایسی نظروں سے دیکھا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔

اسے پریشان دیکھ کر میں نے پوچھا۔ ''پروفیسر صاحب خیریت تو ہے؟''

بیزاری سے بولا۔ ''جی ہاں' سب خیریت ہی ہے۔'' اس نے کمرے میں بکھرے ہوئے سامان کی طرف ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ ''دیکھ رہے ہیں آپ یہ خیریت؟''

میں نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔ ''آخر ہوا کیا؟''

وہ اسی طرح تلخ لہجے میں مخاطب ہوا۔ ''مجھ سے سوال کرنے کے بجائے یہ کیوں نہیں سوچتے کہ میں کتنا احمق واقع ہوا ہوں۔''

سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دوں' آخر وہ خود ہی بولا۔

''اس دور کا المیہ سب سے بڑا یہ ہے کہ آج کا انسان بے حد اذیت کوش ہو گیا ہے۔''

اس بات کا بھی کمرے میں بکھرے ہوئے ٹوٹے پھوٹے سامان سے بظاہر کوئی تعلق معلوم نہ ہوتا تھا۔ لہٰذا کچھ کہتے ہوئے مجھے جھجک محسوس ہوئی۔ مجھے خاموش پا کر اس نے بڑے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''بات صرف اتنی ہے کہ گزشتہ شب کوئی گیارہ بجے ایاز صاحب تشریف لائے تھے۔ طبیعت میری خراب تھی۔ لہٰذا جلدی سو گیا تھا۔ انہوں نے مجھے زبردستی جگایا۔ نشے میں دھت ہو رہے تھے۔ قدم کہیں پڑ رہے تھے۔ کہتے کچھ تھے زبان سے نکلتا کچھ تھا۔ آتے ہی جیب سے بوتل نکالی اور شغل بادہ نوشی شروع کر دیا۔ میرے سپرد ساقی گری کی خدمت ہوئی۔ یہ تو آپ جانتے ہیں کہ میں رات کے وقت اپنی ضرورت کے لیے بھی کبھی ملازم کی نیند خراب نہیں کرتا۔ لہٰذا وہ جو آرڈر کرتے گئے میں تعمیل کرتا رہا۔'' وہ بڑے اطمینان سے ایک ایک تفصیل بتا رہا تھا۔ اب نہ اس کے چہرے پر جھنجلاہٹ تھی اور نہ لہجے میں تلخی۔ البتہ باتوں میں بلا کا طنز تھا۔ ''تو صاحب مجھ سے کچھ حکم عدولی ہو گئی۔ پھر کیا تھا' آپے سے باہر ہو گئے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اس کا اندازہ آپ کمرے کی حالت دیکھ کر لگا سکتے ہیں۔ وہ اودھم دھاڑ مچایا کہ اب میں آپ سے کیا عرض کروں۔''

''شور تو کل رات کچھ میں نے بھی سنا تھا۔''

''آپ تو بڑی گہری نیند سوتے ہیں۔ میں نے تو آپ کو آوازیں بھی دیں مگر آپ کی آنکھ نہ کھل سکی۔'' وہ اس وقت بڑے تکلف

کے ساتھ گفتگو کر رہا تھا۔

میں نے سخن سازی سے کام لیا اور پشیمانی کا اظہار کرنے لگا۔ ''نیند تو واقعی میری بہت خراب ہے۔ میرے سر کے اوپر اتنا بڑا ہنگامہ ہوا اور میری آنکھ تک نہیں کھلی۔'' میں نے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو آپ کے ساتھ بڑی زیادتی ہے۔''

وہ حیرت زدہ ہو کر بولا۔ ''زیادتی۔۔۔۔۔۔۔ہاں بھئی یہی کہہ لو۔''

میں نے سوچا کہ زیادتی کا لفظ استعمال کر کے میں نے پروفیسر کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ ''یہ تو سراسر ظلم ہے۔'' لہٰذا میں نے اس کی تلافی کرنے کی غرض سے کہا۔ ''معاف کیجئے گا پروفیسر صاحب' مجھے صحیح طور پر آپ دونوں کے مراسم کا اندازہ نہیں' مگر میں اتنا ضرور عرض کروں گا کہ ایاز صاحب کا اب یہاں آنا جانا بند کرا دیجئے۔''

''اب یہی میں نے بھی سوچا ہے۔''

میں نے اس سلسلے میں مزید کچھ کہنا خلاف مصلحت سمجھا۔ علاوہ ازیں دفتر کا وقت ہو گیا تھا۔ میں پروفیسر سے رخصت ہو کر دفتر کی جانب چل دیا۔ لیکن راستے بھر اس کے متعلق سوچتا رہا۔ دل ہی دل میں اس کی ضرورت سے زیادہ فراخ دلی اور بھلمنساہٹ پر کڑھتا بھی رہا۔

میری نئی نئی ملاقات تھی۔ پروفیسر کے ساتھ رہتے ہوئے ابھی اہفتے بھر نہ ہوا تھا۔ وہ میرے بڑے بھائی کا کلاس فیلو رہ چکا تھا۔ لہٰذا اس کی نجی زندگی کے متعلق مجھے بہت کچھ علم تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جنہوں نے حالات کے خلاف بغاوت کرنے کی جرات نہیں کی' ہمیشہ زندگی سے سمجھوتہ قائم رکھا۔ اس سمجھوتے بازی میں حادثات کو بہت بڑا دخل تھا۔ وہ مشکل سے دس برس کا تھا کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ ماں نے بھلے گھر کی بہو بیٹیوں کی طرح اولاد ہی کو سب کچھ جانا اور انہی کے سہارے پورا رنڈاپا گزار دیا۔ عزیزوں نے عقد ثانی کے لیے بہت اصرار کیا مگر انہوں نے کسی کی ایک نہ سنی۔ اس انکار سے خاندان والوں سے کچھ اس قدر بدمزگی بڑھی کہ سب سے ملنا جلنا ترک کر دیا۔ بات کی اتنی دھنی تھیں کہ برے سے برا وقت دیکھا مگر کسی رشتہ دار کے آگے ہاتھ نہ پھیلایا۔ شوہر نے مرتے وقت اتنا بھی اثاثہ نہ چھوڑا جس سے سال چھ مہینے کٹ جاتے۔ جہیز میں جو دو چار زیور ملتے تھے وہی کل سرمایہ تھا۔ اسے فروخت کر کے انہوں نے کپڑے سینے کی مشین خرید لی۔ پاس پڑوس میں رہنے والوں کے کپڑے سی کر اپنا اور چار بچوں کا پیٹ پالتی رہیں۔

جس وقت باپ کا انتقال ہوا وہ چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا۔ بیوہ ماں نے کسی نہ کسی طرح اس کی تعلیم جاری رکھی۔ خود اسے بھی پڑھنے کی لگن تھی۔ دن بھر اسکول میں پڑھتا۔ شام کو جلد سازی کی دکان پر کاغذ کاٹنے کی مشین چلاتا جس سے پڑھائی کی فیس نکل آتی۔ رات کو اکثر ایسا ہوتا کہ گھر میں جلانے کا تیل ختم ہو جاتا تو میونسپلٹی کے لیمپ کی روشنی میں جا کر رات گئے تک پڑھا کرتا۔ دھندلی

روشنی میں آنکھوں پر زور دے کر پڑھنے سے بینائی خراب ہوگئی۔ چنانچہ کم سنی ہی میں اس نے موٹے موٹے شیشوں کا چشمہ لگانا شروع کر دیا تھا۔ غرض کہ اس نے ابتدائی زندگی بدحالی اور تنگ دستی میں بسر کی۔ تعلیم سے فارغ ہو کر برسرِ روزگار ہوا تو تین جوان بہنوں کی شادی کی فکر دامن گیر ہوئی۔

سب سے چھوٹی بہن کی شادی کے فرض سے تین چار سال ہی ہوئے ہوں گے کہ وہ فارغ ہوا تھا۔ خود اب تک بیاہ نہیں کیا تھا۔ ماں زندہ ہوتی تو شاید وہ ازدواجی زندگی میں الجھ جاتا۔ مگر اب کون ایسا تھا جو گھر بسانے کے لیے مجبور کرتا۔ بہنیں اپنے گھربار کی ہو چکی تھیں۔ اب اس کی عمر بھی پچاس سے تجاوز کر چکی تھی۔ سر کے بال کھچڑی ہو چکے تھے۔ چہرے کے خدوخال بھدے ہو گئے تھے۔ قوا مضمحل ہوتے جا رہے تھے۔ زیادہ ذہنی مشقت کرنے کے باعث وہ اپنی عمر سے زیادہ سن رسیدہ معلوم ہونے لگا تھا۔

گھر میں وہ بالکل تنہا رہتا تھا۔ دیکھ بھال کے لیے ادھیڑ عمر کا ملازم تھا جو بہرہ بھی تھا اور اسے سجھائی بھی کم دیتا تھا۔ ان خامیوں کے باوجود وہ کئی سال سے اس کے ساتھ نباہ کر رہا تھا۔ لیکن مجرد اور عزلت نشینی کی زندگی سے آدمی کا مزاج جس قدر وہمی اور چڑچڑا ہو جاتا ہے وہ اس میں نام کو نہیں تھا۔

پہلی بار جب میں بھائی جان کا خط لے کر اس کے پاس گیا تو بڑی خندہ پیشانی سے پیش آیا تھا۔ خط پڑھتے ہی بولا۔ ''نہیں میاں' تم کو یہاں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ نیچے کا کمرہ میں خالی کرائے دیتا ہوں۔ آج ہی اپنا سامان لے کر آ جاؤ۔'' چنانچہ شام کو ہوٹل سے سامان اٹھوا کر اس کے گھر منتقل ہو گیا۔ وہ ان دنوں ایک مقامی کالج میں وائس پرنسپل تھا اور انگریزی پڑھاتا تھا۔

یوں تو دن بھر میں اس سے میری کئی بار ملاقات ہوتی تھی لیکن بات چیت کرنے کے معاملے میں وہ بخل سے کام لیتا تھا۔ البتہ ایاز کا ذکر کبھی آ جاتا تو ذرا کھل کر بات کرتا۔

ایاز سے ابھی تک میری ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ پروفیسر کی گفتگو سے مجھے اس کے متعلق صرف اتنا معلوم ہو سکا تھا کہ جب پروفیسر اس شہر میں نیا نیا آیا تھا اسی زمانے میں ایاز سے اس کی جان پہچان ہوئی تھی۔ وہ اس کے پاس کریکٹر سرٹیفکیٹ لینے آیا تھا۔ کہیں ملازمت کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ سرٹیفکیٹ اسی مقصد کے لیے درکار تھا۔ ایاز نے اسی سال میٹرک پاس کیا تھا۔ والد پر فالج گرا تھا۔ وہ اپاہجوں کی سی زندگی بسر کر رہے تھے۔ بڑے بھائی پر گھر کا سارا بار تھا' لہٰذا وہ آگے تعلیم دلانے کے حق میں نہیں تھا۔ پروفیسر نے گفتگو کی تو ذرا ہی دیر میں اسے ایاز کی ذہانت کا اندازہ ہو گیا۔ وہ اس سے کچھ اس قدر متاثر ہوا کہ ملازمت کا خیال ترک کروا کے اسے تعلیم جاری رکھنے کا مشورہ دیا۔ خود ایاز کی بھی یہی خواہش تھی۔ چنانچہ بی اے تک اس کی تعلیم کا سارا بار پروفیسر برداشت کرتا

رہا۔اب وہ کسی سرکاری محکمے میں اچھے عہدے پر فائز تھا۔

شام کو دفتر سے لوٹتے ہی سیدھا پروفیسر کے پاس پہنچا۔شام کی چائے ہم دونوں بلاناغہ ایک ساتھ پیتے تھے۔اوپر جا کر میں نے دیکھا' میز پر چائے کا سامان رکھا ہے۔اس روز کچھ خاص اہتمام بھی کیا گیا تھا۔

مگر پروفیسر کا کہیں پتہ نہ تھا۔میں نے اس کی لائبریری میں جا کر دیکھا' وہاں بھی موجود نہیں تھا۔اب تو تشویش ہوئی۔اس لیے کہ وہ اپنا بیشتر وقت لائبریری ہی میں گزارتا تھا۔

لائبریری سے نکلتے ہوئے اچانک میری نظر برابر والے کمرے کی جانب اٹھ گئی۔پروفیسر قد آدم آئینے کے سامنے کھڑا تھا۔میں نے اسے دیکھا تو حیرت سے چونک پڑا۔اس وقت وہ شوخ رنگ کی بش شرٹ پہنے بے ڈھنگے پن سے مسکرا رہا تھا۔حیرت کی بات ہی تھی۔میں نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ پروفیسر کے ایسا زاہد خشک' لڑکیوں کے پیچھے سڑکوں پر سیٹیاں بجانے والے آوارہ گرد نوجوانوں کی سی وضع قطع اختیار کر سکتا ہے۔دل ہی دل میں کہا' یہ اپنا پروفیسر تو بڑا چھپا رستم نکلا۔میں نے اس کمرے میں جانا مناسب نہ سمجھا۔تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا دوسرے کمرے کی طرف چل دیا۔

پروفیسر نے ٹوکا۔"ارے بھئی شہیر!تم آگئے' کہاں چلے' ادھر آؤ۔"

غالباً اس نے آئینے میں میرا عکس دیکھ لیا تھا۔مجبوراً مجھے اس کے پاس جانا پڑا۔اس کی بش شرٹ قریب سے دیکھی تو ہنسی معلوم ہوئی۔اس پر جگہ جگہ خبروں کے تراشے تھے۔کہیں سمندر کے کنارے کوئی دوشیزہ ریت پر لیٹی اپنی ننگی ٹانگوں کی نمائش کر رہی تھی' کہیں کوئی نوجوان جوڑا بڑی شہوت انگیز انداز میں بوس و کنار میں محو تھا۔اس بش شرٹ کو پہن کر وہ اچھا خاصا ٹیڈی بوائے نظر آ رہا تھا۔

پروفیسر میری نظروں کو بھانپ گیا۔کھسیانی ہنسی ہنس کر بولا۔"وہ بے غیرت آج پھر آیا تھا۔" یہ ایاز کی جانب اشارہ تھا۔

پروفیسر کے لہجے سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ رات کے افسوس ناک واقعے پر اس نے ایاز کو معاف کر دیا ہے۔

میں نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔"کون؟"

اس دفعہ وہ کسی قدر بے تکلفی سے گویا ہوا۔"وہی نامعقول ایاز کا بچہ۔۔۔۔۔۔اور کون۔ابھی ذرا ہی دیر پہلے تو یہاں سے گیا ہے۔"

اس کے اس انداز پر میں جل بھن کر رہ گیا۔عجیب سادہ لوح آدمی ہے۔کل رات جس شخص نے اسے اس قدر پریشان کیا' آج اس کا اس طرح تذکرہ کر رہا ہے گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔"

مجھے خاموش پا کر پروفیسر نے کہا۔ "یہ سارا الم غلم سامان خرید کر وہی لا یا تھا"
میں نے دیکھا' کمرے میں ایک طرف شوخ رنگ کی ٹائیاں اور رومال' پرفیوم کی شیشیاں اور اسی طرح کی کئی بش شرٹیں پڑی ہیں جو اس وقت پروفیسر پہنے ہوئے تھے۔ سامان دیکھ کر میں نے اندازہ لگایا کہ اس پر ڈھائی سو سے کیا کم خرچ ہوئے ہوں گے۔ اگر پروفیسر کو منانے کے لیے ایاز اتنی رقم خرچ کر سکتا ہے تب تو پروفیسر کا اس طرح من جانا بے جا نہیں تھا۔ میں ازراہ تمسخر کہا۔
"معلوم ہوتا ہے ایاز کو آپ کے ٹیسٹ کا بخوبی اندازہ ہے۔"
وہ شرمندہ ہو کر گویا ہوا۔ "یہ نئی بات نہیں۔ وہ اکثر ایسی حرکتیں کرتا ہے۔ ایک تو یہ فضول سامان اٹھا لایا۔ اس پر یہ اصرار کہ اسے پہنو بھی۔ میرے سر ہو گیا۔ زبردستی یہ بش شرٹ پہنا کر گیا ہے۔ اب تم ہی بتاؤ' یہ بش شرٹ مجھ پر کیا اچھی لگے گی۔"
میں نے اس کے لہجے سے اندازہ لگایا کہ اس بیزاری میں بھی کہیں اس کے دل کا چور چھپا ہوا ہے۔ میں نے فوراً جواب دیا۔
"نہیں پروفیسر صاحب' سچ مچ یہ تو آپ پر بہت کھل رہی ہے۔ بڑے سمارٹ نظر آ رہے ہیں۔"
جھوٹ موٹ کی خفگی کا اظہار کرتے ہوئے گویا ہوا۔ "اب تم مجھے بیوقوف بنانے کی تو کوشش کرو نہیں۔"
میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اسی اثناء میں دروازے پر آہستہ سے دستک ہوئی۔ میں نے سوچا' شاید ایاز آیا ہے۔ پروفیسر گھبرا کر بولا۔
"دیکھو وہ میری اسٹوڈنٹ عذرا آئی ہو گی' تم جا کر اسے بٹھاؤ۔ میں ابھی کپڑے تبدیل کر کے آتا ہوں۔"
میں نے دروازے پر جا کر دیکھا' سانولے رنگ کی ایک شرمیلی سی لڑکی وہاں کھڑی ہے۔ میں نے اس سے کہا۔ "اندر آ جایئے' پروفیسر صاحب ابھی آتے ہیں۔"
میری بات کا اس نے کوئی جواب نہ دیا اور اندر آ کر چپ چاپ صوفے پر بیٹھ گئی۔ ذرا ہی دیر بعد پروفیسر بھی وہاں آ گیا۔ وہ رنگ برنگی بش شرٹ اتار آیا تھا۔
میں نے غور کیا کہ سانولی سلونی شرمیلی لڑکی عذرا میرے سامنے پروفیسر سے بات کرتے ہوئے کچھ جھجک رہی ہے۔ لہٰذا میں نے جلدی جلدی چائے کی پیالی ختم کی اور اٹھ کر نیچے اپنے کمرے میں چلا گیا۔
کچھ دیر بعد پروفیسر میرے کمرے میں گھبرایا ہوا آیا۔ "آج تم باہر گھومنے نہیں گئے؟ طبیعت تو ٹھیک ہے؟" اور میرے جواب کا انتظار کئے بغیر چلا گیا۔ لمحہ بھر بعد وہ پھر کمرے میں آ گیا۔ آتے ہی وہی سوال کیا۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟" اور اسی طرح گھبرایا ہوا کمرے سے چلا گیا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد لکڑی کے زینے پر اس کے قدموں کی آہٹ ابھری۔

ایک بار پھر وہ کمرے کے دروازے پر کھڑا تھا۔لیکن اس دفعہ اس نے کوئی بات نہیں کی۔ کچھ ڈھونڈنے کے سے انداز میں نظریں گھما پھرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

اس کی گھبراہٹ نے مجھے خواہ مخواہ پریشانی میں مبتلا کر دیا۔ میں ابھی تک یہ طے نہیں کر سکا تھا کہ اس وقت اس سے بات کرنا مناسب بھی ہوگا کہ نہیں' وہ خود ہی بولا۔

''تم سے ایک کام تھا۔''

میں نے مستعدی سے جواب دیا۔''فرمائیے''

مگر وہ اپنی بات کہتے کہتے رک گیا۔ سر کے بالوں کو کریدتے ہوئے بولا۔ ''تمہارے پاس اس وقت چالیس روپے تو نہیں ہوں گے؟''

میں نے جلدی سے کہا۔''جی ہاں' ابھی حاضر کیے دیتا ہوں۔''

میں نے اسی وقت روپے نکالے اور اسے دے دیے۔ روپے لے کر کہنے لگا۔''پہلی تاریخ کو تم مجھ سے لے لینا' اس وقت کچھ ایسی ہی ضرورت پیش آ گئی تھی۔''

اس نے بات کرنے کا مجھے موقع ہی نہ دیا۔ کمرے سے باہر نکلتے ہوئے تو اس نے اپنا جملہ پورا کیا تھا۔ وہ تیز تیز قدموں سے زینے پر چڑھتا ہوا اوپر چلا گیا۔

میں خاموش بیٹھا سوچتا رہا کہ پروفیسر اتنا گھبرایا ہوا کیوں ہے؟ کئی اوٹ پٹانگ قسم کی باتیں میرے ذہن میں گردش کرنے لگیں۔

پروفیسر اس لڑکی کے ساتھ ساتھ نیچے آیا۔ وہ تو باہر چلی گئی البتہ پروفیسر میرے پاس آ گیا۔ اب اس کے چہرے پر گھبراہٹ تھی بلکہ وہ کسی قدر بشاش نظر آ رہا تھا۔

''بھئی تم نے اس وقت بہت بڑا کام کیا ہے۔''

''آپ خواہ مخواہ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔''

''بھئی اس لڑکی کی ابھی تک فیس جمع نہیں ہو سکی۔ فائنل ائیر ہے۔ بے چاری بے حد پریشان تھی۔ اپنا حال یہ ہے کہ اس مہینے ایاز نے کچھ قرض لے لیا تھا' لہٰذا اپنی جیبیں خالی ہیں۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح اس کی فیس کے لیے روپیہ فراہم کروں' مگر تم نے......''

میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "دیکھئے پروفیسر صاحب' آپ مجھے بار بار شرمندہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

وہ مسکرا کر خاموش ہو گیا۔

بات آئی گئی ہو گئی۔

لیکن دوسرے ماہ کی ابتدائی تاریخوں میں ہی مجھے یہ بات معلوم ہو گئی کہ عذرا کے علاوہ اور بھی کئی طالب علم تھے جن کی وہ وقتاً فوقتاً امداد کیا کرتا تھا۔ اس کی تنخواہ کا ایک حصہ اسی مد میں چلا جاتا تھا۔

اس کا ذاتی خرچ زیادہ نہیں تھا۔ بڑی سادہ زندگی بسر کر رہا تھا۔ اسے صرف ایک ہی شوق تھا۔ اور وہ تھی کتابوں کے ساتھ گہری دلچسپی۔ ہر مہینے وہ کچھ کتابیں خرید کر ضرور لاتا۔ اس طرح اس نے بڑی اچھی لائبریری بنالی تھی۔ زیادہ تر وہ اسی میں بیٹھ کر اپنا وقت گزارتا تھا۔

اتوار کا دن تھا۔ پروفیسر نے صبح ہی صبح الماریوں سے کتابیں نکال کر فرش پر جگہ جگہ انبار لگا دیئے تھے۔ ان کتابوں کو وہ نئے ڈھنگ سے آراستہ کرنے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ اس کام میں اس قدر مصروف تھا کہ اس روز اس نے چائے بھی وہیں پی۔

دوپہر کو میں اس کے پاس گیا۔ مگر وہ کتابوں کی ترتیب میں بری طرح الجھا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ اور کپڑے دھول سے اٹے تھے۔ اس وضع قطع میں وہ بڑا دل جلول نظر آ رہا تھا۔ مگر اسے اپنے آپ کا ذرا ہوش نہیں تھا۔

مجھے دیکھ کر اس نے کچھ کہنا چاہا۔ مگر اسی وقت ایک بوسیدہ سی کتاب پر اس کی نظر پڑ گئی۔ وہ اسے اٹھا کر ورق گردانی کرنے لگا۔ ایک جگہ حاشیئے پر کوئی عبارت درج تھی۔ اسے بہت غور سے دیکھنے لگا اور پڑھنے میں کچھ ایسا محو ہو گیا کہ میری موجودگی کا احساس ہی اس کے ذہن سے نکل گیا۔

میں کئی منٹ تک خاموش کھڑا رہا۔ مگر اس نے پلٹ کر دیکھا ہی نہیں۔ میں اپنی موجودگی کو مداخلت بے جا سمجھتے ہوئے کمرے میں واپس آ گیا اور بستر پر لیٹ کر سو گیا۔

شام کا اندھیرا پھیلنے سے کچھ دیر پہلے پھر اس کے پاس گیا۔ تب وہ ساری کتابیں قرینے سے آراستہ کر چکا تھا۔ اس وقت وہ بڑا مسرور نظر آ رہا تھا۔ بلاشبہ اس نے کتابوں کی ترتیب میں بڑی نفاست سے کام لیا تھا۔

دن بھر کام کرتے کرتے اب وہ تھک چکا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ ذرا دیر اس سے بات چیت کروں گا مگر اس دفعہ بھی بات کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ کوئی پروگرام نہ تھا۔ میں وہاں سے اٹھ کر سینما چلا گیا۔

پہلے شو میں بڑا رش تھا۔ اس لیے ٹکٹ نہیں مل سکا۔ لیکن سینما دیکھنے کا اس روز چونکہ پروگرام بنا چکا تھا لہٰذا دوسرا شو دیکھا اور رات کو کوئی ساڑھے بارہ بجے گھر واپس پہنچا۔ اوپر کی منزل میں ابھی تک روشنی ہو رہی تھی۔

پروفیسر ابھی تک جاگ رہا تھا۔ دروازہ کھلا تھا۔ روشنی لائبریری میں ہو رہی تھی۔ میں اسی طرف چل دیا۔ مگر دروازے پر پہنچ کر میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

سامنے فرش پر ہر طرف کتابیں پھیلی ہوئی تھیں۔ بعض کتابیں پھٹ گئی تھیں۔ ان کے اوراق ہر طرف بکھرے ہوئے تھے۔ الماریاں الٹی پلٹی پڑی تھیں۔ ان کے شیشے ٹوٹ گئے تھے۔ لائبریری کے آتش دان میں ابھی تک کتابیں جل رہی تھیں۔ ہوا کا جھونکا آتا تو شعلے بھڑک اٹھتے۔ میں گم صم کھڑا حیران و پریشان نظروں سے یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔

ایک گری ہوئی الماری سے ٹیک لگائے' بکھری ہوئی کتابوں کے درمیان' پروفیسر فرش پر بت بنا بیٹھا تھا۔ لحظہ بھر کو میری نظریں اس کی نظروں سے ٹکرائیں۔ اس کی آنکھوں میں اس بلا کا کرب تھا کہ میں تاب نہ لا سکا۔ خود بخود میری نگاہیں جھک گئیں۔

کئی لمحے خاموشی میں گزر گئے۔ آخر کمرے کے سکوت میں پروفیسر کی آواز ابھری۔ ''کب آئے تم؟'' اس کے لہجے میں درد کی کسک تھی۔

میں نے اس کے چہرے کی جانب دیکھا۔ اس وقت وہ بہت بوڑھا اور لاغر نظر آ رہا تھا۔ مجھے خاموش پا کر اس نے کہا۔

''تم اتنے پریشان کیوں ہو گئے؟'' وہ زبردستی مسکرانے کی کوشش کرنے لگا۔ ''میں ان کو پھر درست کر لوں گا۔''

میں نے پوچھا۔ ''یہ آپ کو سوجھی کیا؟ کتنی تندہی سے تو آپ نے لائبریری کو آج دن بھر میں آراستہ کیا تھا۔'' میری بات پر وہ ذرا کھل کر مسکرایا۔ پھر اس نے بڑا بے تکا سوال کیا۔

''تمہارا نام شہیر احمد ہے نا؟''

میں نے جواب دیا۔ ''جی ہاں''

اس کا دوسرا سوال بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ ''تم واکر اینڈ واکر میں سپروائزر بھی ہو۔''

میں نے اس دفعہ بھی اس کی بات کا صحیح مفہوم سمجھے بغیر کہہ دیا۔ ''ہاں''

''اور اس وقت تم میری لائبریری میں کھڑے ہو۔'' پھر وہی بے تکا سوال۔

میں نے رٹے ہوئے سبق کی طرح پھر ''جی ہاں'' کہہ دیا۔ لیکن اس کے کسی اور بے تکے سوال سے قبل ہی میں نے گھبرا کر پوچھا۔

''ان سوالوں سے آخر آپ کا مطلب کیا ہے؟''

''اس کا مطلب یہ ہے کہ میں اپنے ہوش وحواس میں ہوں اور جب میں اپنے ہوش وحواس میں ہوں تو پھر لائبریری کا یہ حلیہ کیسے بنا سکتا ہوں۔''

''یہی تو میں بھی سوچ رہا ہوں۔'' میں نے فوراً وضاحت کی۔

اس نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا اور آتش دان میں سلگتی ہوئی ایک کتاب دیکھنے لگا جس کی جلد چیخ کر دو حصوں میں پھیل گئی تھی۔ کمرے میں دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ آتش دان میں انگارے دہکتے رہے۔ دریچے سے کبھی کبھار ہوا کا تیز جھونکا آتا تو شعلے بھڑک اٹھتے اور فرش پر بکھرے ہوئے اوراق کھڑ کھڑانے لگتے۔ اس نے مڑ کر میری جانب دیکھا اور ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ اسی عالم میں گویا ہوا۔

''تم اس سارے ہنگامے کی وجہ جاننے کے لیے بے چین ہو رہے ہو۔ بھئی بات صرف اتنی ہے کہ شام کو تمہارے جانے کے تھوڑی دیر بعد عذرا آ گئی۔ اسے دو کتابوں کی تلاش تھی۔ اتفاق سے دونوں ہی کتابیں میرے پاس نکل آئیں۔ میں ڈرائنگ روم میں بٹھا کر اس سے ان کتابوں کے موضوع پر بات کر رہا تھا کہ اسی اثناء میں ایاز آ گیا۔ دروازے سے داخل ہوتے ہی میں نے دیکھا اس کا چہرہ تمتمایا ہوا ہے۔ پیشانی پر بل پڑے ہیں۔ میں نے اسے بھی وہیں بٹھا لیا۔ مگر وہ روٹھا ہوا منہ پھلائے خاموش بیٹھا رہا۔''

میں نے کوئی تبصرہ نہ کیا۔ چپ چاپ اس کی باتیں سنتا رہا۔ وہ آہستہ آہستہ بولتا رہا۔ ''میں ایاز کی خفگی کی وجہ سمجھ گیا تھا۔ اس اتوار کو اس نے پکنک کا پروگرام بنایا تھا۔ مجھے بڑے اصرار سے بلایا گیا تھا۔ لیکن میں کتابوں کی ترتیب میں ایسا پھنسا کہ کسی بات کا ہوش ہی نہ رہا۔ لہٰذا میں نے عذرا کی موجودگی ہی میں معذرت کرتے ہوئے اسے ساری بات بتا دی۔ اس نے میری باتوں کو خاموشی سے سنا۔ مگر کسی قسم کا ردعمل ظاہر نہ کیا۔ بت کی طرح بیٹھا رہا۔ ذرا دیر بعد اٹھ کر لائبریری میں چلا گیا اور یہاں آ کر اس نے جو کچھ کیا وہ تمہارے سامنے ہے۔''

میں نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے دریافت کیا۔ ''آپ نے کوئی مزاحمت نہیں کی؟''

''اگر میں اسے روکتا نہیں تو شاید آج اس نے ساری لائبریری ہی پھونک دی ہوتی۔ ہوا یہ کہ اس کے لائبریری میں جانے کے کچھ ہی دیر بعد میں نے کتابیں گرنے کی آواز سنی۔ لیکن جب ایک الماری شور کرتی ہوئی فرش پر آ گئی تو میں گھبرا کر وہاں پہنچا۔ مگر

دروازہ اندر سے بند تھا۔ لائبریری سے کتابوں کے پھٹنے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ الماریاں دھڑا دھڑ گر رہی تھیں۔ شیشے ٹوٹ رہے تھے۔"

وہ بجھے ہوئے لہجے میں مجھے بتاتا رہا۔ "اس وقت تک عذرا بھی میرے ساتھ ہی تھی بلکہ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ روشن دان کے راستے اندر جانے کی ترکیب بھی اسی نے بتائی تھی۔ بڑی مشکل سے میں اندر پہنچا۔ یہ دیکھو گھٹنے پر سے پتلون بھی پھٹ گئی' بازو الگ چھل گیا۔"

وہ مجھے اپنی پھٹی ہوئی پتلون اور زخمی بازو دکھانے لگا۔ میں نے اس کی تکلیف سے متاثر ہوئے بغیر جل کر پوچھا۔

"آخر اتنی سی بات پر ایاز اس قدر دیوانہ کیوں ہو گیا؟"

"تم ایاز سے ملے نہیں' وہ بڑا سرپھرا اور سرکش نوجوان ہے۔" پروفیسر نے وضاحت کی۔ "اس لائبریری سے تو اسے ہمیشہ سے بیر ہے۔ اسے وہ قبرستان کہا کرتا ہے۔ اس کا تو قول ہے کہ کتابیں انسانی فکر کی قبریں ہیں۔ زندگی کتابوں سے بھرے ہوئے اس بند کمرے میں نہیں ہے۔ زندگی کوچہ و بازار میں ہے' شراب خانوں میں اور رقص گاہوں میں ہے۔ اپنی اس بات کو منوانے کے لیے وہ اکثر مجھ سے الجھ پڑتا ہے۔ آج اس نے جو پروگرام بنایا تھا اس میں کچھ بے فکرے نوجوان اور فلرٹ ٹائپ کی تیز طرار لڑکیاں بھی شامل تھیں۔ تمام دن ساحل سمندر پر ہیپی کرگانے ناچنے' پانی میں اچھل کود کرنے اور ایسے ہی ہنگامے برپا کرنے کا پروگرام تھا۔" وہ زیر لب مسکرایا۔ "اب تم ہی بتاؤ' میں ان لوگوں کے ساتھ اس دھماچوکڑی میں کیا اچھا معلوم ہوتا۔ میں نے اسے سمجھایا بھی' مگر وہ برابر یہی کہتا رہا کہ تم خواہ مخواہ خود کو بوڑھا سمجھنے لگے ہو۔ میں نے تو ساٹھ ساٹھ سال کے معمر امریکنوں کو ایسے موقعوں پر عام طور پر قہقہے پہ قہقہے لگاتے دیکھا ہے۔"

پروفیسر اپنی بات کہہ چکا تو معاً مجھے افسوس ہوا کہ تمام برائیوں کے باوجود ایک بات ضرور ہے' وہ یہ کہ ایاز واقعی پروفیسر سے بہت خلوص رکھتا ہے۔ اس نے جو کچھ کیا وہ صرف اس کی ہمدردی میں کیا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ کبھی کبھی ہمدردی بہت مہنگی بھی پڑ جاتی ہے۔ ایاز کی جانب سے مجھے جو غم و غصہ تھا اب رفع ہو چکا تھا۔

لیکن پروفیسر نے اسے ابھی تک معاف نہیں کیا تھا۔ اس کا اندازہ میں نے اسی طرح لگایا کہ ایک پھٹی ہوئی کتاب کے ورق سمیٹتے ہوئے اس نے بڑے طیش کے عالم میں کہا۔

"شہیرا میں نے یہ کتاب پندرہ سال پہلے خریدی تھی۔ اس الو کے پٹھے نے اسے پھاڑ تو ڈالا مگر اسے کیا خبر کہ اس کتاب کو

خریدنے کے لیے میں نے اپنے ایک دوست کی گھڑی چرائی تھی۔ رات بھر حوالات میں بند رہنا پڑا تھا۔" وہ اچانک بڑا جذباتی ہو گیا۔ "کسی کو کیا خبر کہ ان کتابوں کے ساتھ میری زندگی کی کتنی دردناک یادیں وابستہ ہیں۔"

دیر تک وہ اسی طرح بیٹھا پیچ و تاب کھاتا رہا۔ بڑی مشکل سے میں نے اسے وہاں سے اٹھا کر بستر پر پہنچایا' ورنہ وہ ساری رات وہیں گزار دیتا۔ ہوسکتا ہے میرے جانے کے بعد وہ پھر وہاں پہنچ گیا ہو۔

اس واقعے کو ہفتہ بھر سے زیادہ عرصہ ہو گیا۔ پروفیسر سے اکثر ادھر ادھر کی باتیں ہوتیں مگر اس نے بھول کر بھی ایاز کا تذکرہ نہیں کیا۔ میں نے ایک بار چھیڑ کر ایاز سے پوچھا بھی تو وہ نظر انداز کر دیا۔ گھما پھرا کر پھر اس کا تذکرہ لانا چاہا تو میں نے دیکھا کہ اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ چہرہ تمتما اٹھا۔ اس دفعہ ایاز نے واقعی اسے بہت سخت صدمہ پہنچایا تھا۔

ایک رات خلاف معمول پروفیسر دیر سے واپس آیا۔ میں اس وقت جاگ رہا تھا۔ میرے کمرے میں داخل ہو کر اس نے اظہار معذرت کرتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔ "بھئی معاف کرنا' میں نے تم کو ڈسٹرب تو نہیں کیا؟"

اس قسم کے تکلفات وہ اکثر کیا کرتا تھا۔ حالانکہ وہ اس وقت بڑے اچھے موڈ میں تھا۔ چہرے پر تازگی بھی تھی اور لہجے میں خاص کھرج تھی۔ میں نے جواب دیا۔

"ہرگز نہیں' مگر آج آپ کو اتنی دیر کہاں ہوگئی؟"

وہ بے ساختہ ہنسنے لگا۔ "ارے بھئی کچھ پوچھو نہیں' اس نامعقول سے راستے میں مڈبھیڑ ہوگئی۔ نہ جانے کہاں سے بڑی شاندار کار لے آیا تھا۔ ساتھ میں لڑکیوں کی پوری پلٹن تھی۔ کم بخت ان میں راجہ اندر بنا بیٹھا تھا۔ دیکھتے ہی سب کو چھوڑ چھاڑ کر میرے پاس آ گیا۔ اتنی بات ضرور ہے کہ وہ میری عزت اب بھی اسی طرح کرتا ہے۔ ذرا دیر تک تو ہم دونوں ادھر ادھر گھومتے رہے۔ پھر مجھے اپنے ساتھ زبردستی کلب لے گیا۔ بھئی پوکر تو وہ کمال کا کھیلتا ہے۔ یہ تو مجھے آج ہی پتہ چلا۔ ذہین اس بلا کا ہے کہ آج تو سارے لوگ دنگ رہ گئے۔"

وہ کرسی کھینچ کر اطمینان سے بیٹھ گیا۔ "ایسا ہوا کہ ایک بھاری بھرکم بدن کا آدمی خوب جیت رہا تھا۔ کارڈ اسے بڑا فیور کر رہا تھا۔ ایک بار کارڈ ڈیل ہونے سے پہلے ایاز کو نہ جانے کیا سوجھی اچانک اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ تاشوں کی گڈی اپنے ہاتھ میں لی۔ اس میں سے چار تاش نکال کر جیب میں ڈال لیے اور بازیگر کی طرح کھلاڑیوں سے کہنے لگا۔ دیکھئے ابھی میں اپنے جادو منتر کے زور سے یہ کارڈ آپ کی جیب سے نکالتا ہوں۔ اور اس بھاری بھرکم جسم والے آدمی کی جیب میں ہاتھ ڈال کر چاروں کارڈ نکال کر دکھائے۔" اس نے

زور کا قہقہہ لگایا۔ "آج تک کسی نے شار پر کو اس طرح نہ پکڑا ہوگا۔ وہ شخص بگڑا تو ایاز نے اس کی ٹائی پکڑ کر وہ مکا مارا کہ کرسی سمیت فرش پر آ رہا۔ پھر تو سب ہی اس پر ٹوٹ پڑے۔ وہ مرمت ہوئے کہ بس کچھ پوچھو نہیں۔"

شاید پروفیسر کی نظروں میں وہ پورا منظر آ گیا تھا۔ وہ برابر ہنسے جا رہا تھا۔ میں نے اس قدر فراخ دلی سے اسے ہنستے بہت کم دیکھا تھا۔

رات اب زیادہ ہو گئی تھی۔ لہٰذا وہ تھوڑی ہی دیر بعد اوپر چلا گیا۔

اب پھر ایاز کا ذکر شروع ہو گیا تھا۔ کوئی بات ہوتی' کسی کا تذکرہ ہوتا وہ خواہ مخواہ گفتگو میں ایاز کو ضرور لے آتا۔ اکثر مجھے اس کے اس رویے پر جھنجلاہٹ بھی ہوتی۔ ایک بار ایسا ہوا کہ میں اپنا نیا سوٹ پہن کر کہیں جا رہا تھا' دروازے پر پروفیسر سے مڈبھیڑ ہو گئی' مسکرا کر بولا۔

"سوٹ تو تم نے بڑا شاندار سلوایا ہے' کپڑا بھی قیمتی معلوم ہوتا ہے۔" پھر ناقدانہ نظر ڈالتے ہوئے تبصرہ کیا۔ "لیکن کمر کے پاس جھول آ گیا ہے۔ اس عیب نے سوٹ کی وقعت گھٹا دی۔ اسی کپڑے کا میں نے ایاز کے پاس بھی ایک سوٹ دیکھا ہے۔ نہ جانے کس درزی سے سلوایا ہے' بڑی عمدہ فٹنگ ہے۔ اس کا جسم بھی خوبصورت ہے' پہن کر چلتا ہے تو بالکل رابرٹ ٹیلر معلوم ہوتا ہے۔"

ایاز میں لاکھوں خوبیاں سہی مگر اس وقت اس کے ذکر کا موقع نہیں تھا۔

اسی طرح ایک روز میں بڑا قیمتی پرفیوم لے کر آیا۔ ایک دوست پیرس سے بطور خاص میرے لیے لایا تھا۔ پروفیسر اس کی دیر تک تعریف کرتا رہا۔ پھر نا معلوم کیسے اسے ایاز کا خیال آ گیا' کہنے لگا۔

"لیکن ایاز کے پاس میں نے جو پرفیوم دیکھے ہیں' ان کی مہک سے روح پر وجد طاری ہو جاتا ہے۔ خوشبوؤں کے انتخاب میں وہ بڑا نفاست پسند واقع ہوا ہے۔"

اس دفعہ بھی میں غصہ پی گیا۔ البتہ اس روز تو میں اس کے ریمارک پر سخت چراغ پا ہوا' اس نے خواہ مخواہ ایاز کا ذکر چھیڑ دیا۔ بات صرف اتنی تھی کہ والدہ نے خط کے ساتھ ایک لڑکی کی تصویر بھیجی تھی۔ اس کے ساتھ وہ میری نسبت طے کر رہی تھی۔ لڑکی صورت شکل کی جیسی بھی ہو مگر فوٹو اس قدر غضب کا تھا کہ دیکھ کر آدمی خود تصویر بن جاتا۔ شامت اعمال میں نے وہ تصویر پروفیسر کو بھی دکھا دی۔

ذرا دیر تک وہ اسے دیکھتا رہا۔ پھر مسکرا کر بولا۔ "بہت خوب" وہ بڑی محویت کے ساتھ تصویر دیکھنے لگا۔ اسے دیکھتے دیکھتے ناگاہ مڑ کر میری جانب متوجہ ہوا۔ "تو گویا تمہارے لیے اسے منتخب کیا گیا ہے۔ واقعی بڑی حسین لڑکی ہے۔ کہیں ایاز کے ساتھ اس کا رشتہ ہو جائے تو دونوں کا مثالی جوڑا ہو۔"

کہنے کو تو وہ یہ بات کہہ گیا مگر معاملہ فہم اور جہاندیدہ آدمی تھا' فوراً ہی غلطی کا احساس ہوا۔ گھبرا کر میری طرف دیکھا۔ میں اس وقت غم وغصے کے عالم میں تھا۔ وہ شرمسار ہو کر اظہار معذرت کرنے لگا۔

''بھئی برا نہ ماننا' میں نے یوں ہی بے خیالی میں یہ بات کہہ دی۔'' وہ صفائی پیش کرنے کے ساتھ ساتھ دیر تک اس لڑکی کے حسن کی تعریف کرتا رہا۔ مگر اس کی بات دل میں ایسی لگی کہ میں اداس اور دل گرفتہ ہو گیا تھا۔ مجھے کبیدہ خاطر دیکھ کر بولا۔ ''تم واقعی برا مان گئے۔ بڑے جذباتی ہو۔''

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور میری پیٹھ تھپک کر نرم لہجے میں گویا ہوا۔ ''اچھا آؤ' میں تم کو بڑی دلچسپ چیز دکھاؤں۔''

اس کے ساتھ جانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا مگر اصرار کر کے وہ مجھے اپنی خواب گاہ میں لے گیا۔ اس نے اپنے سرہانے دیوار پر آویزاں ایک مجسمے کو دکھایا۔ نہ جانے کس پتھر کا بنا ہوا تھا۔ اس کے اندر بجلی کا بلب روشن تھا۔ وہ دیوار گیری کی طرح لگایا گیا تھا۔ مجسمے میں سے سبزی مائل نیلی نیلی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ یہ کسی نوجوان عورت کا مجسمہ تھا۔ وہ رقص کے انداز میں کھڑی تھی۔ کچھ اس طرح کے اس میں جھجک بھی تھی اور خودسپردگی بھی۔ اس کے بدن کا ایک ایک خم' ایک ایک لوچ نکھر گیا تھا۔ سنگ تراش نے اس فٹ بھر کے مجسمے میں صناعی کا کمال دکھایا تھا۔ میں دیر تک اسے ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ پروفیسر مجھے اس عالم میں دیکھ کر مسکرا دیا۔

''تم تو اسے دیکھ کر مسحور ہو گئے۔ چند ہی روز قبل میرے ایک دوست روم سے لائے تھے۔ بھئی اطالوی سنگ تراشی کی کیا بات ہے۔ میں نے اب تک تم کو اس لیے نہیں دکھایا تھا کہ تم اسے میرے کمرے میں دیکھ کر نہ جانے کیا سوچو گے۔''

نہ معلوم اسے اپنے سن رسیدہ ہونے کا اس قدر کیوں احساس تھا۔ بہر حال ہم دونوں کوئی گھنٹہ بھر تک صرف اس مجسمے کے موضوع پر باتیں کرتے رہے۔ سنگ تراشی پر بات چلی تو اس نے اس انداز سے گفتگو کی کہ اس کے وسیع مطالعے پر میں ششدر رہ گیا۔

لیکن اس کی فطرت کا نہ جانے یہ کون سا پہلو تھا کہ جب اس کا موڈ ہوتا تو کسی بھی موضوع پر بے تکان باتیں کرتا' ورنہ ایسا بھی ہوتا کہ کوئی سوال پوچھنے پر بھی اس طرح خاموش بیٹھا رہتا جیسے سنا ہی نہیں۔ یہی بات اس مجسمے کے سلسلے میں بھی ہوئی۔ دوسرے روز میں نے اس کا ذکر چھیڑا تو چند جملے کہہ کر خاموش ہو گیا۔

اس مجسمے سے اس قدر متاثر ہوا تھا کہ میں نے چھیڑ کر پھر اس کا ذکر نکالا۔ وہ ٹالنے کی کوشش کرنے لگا۔

میں نے اصرار کیا تو بے زاری سے منہ بگاڑ کر اٹھا اور لائبریری میں چلا گیا۔ جب وہ کسی ذہنی پریشانی میں ہوتا تو ہمیشہ لائبریری میں جا کر پناہ لیتا تھا۔

دوسرے یا تیسرے روز کا ذکر ہے۔ میں رات کو دیر سے لوٹا۔ کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ دن بھر میں پروفیسر سے نہیں مل سکا تھا۔ اوپر کی منزل میں روشنی ہو رہی تھی۔ میں نے سوچا ابھی نیند تو آئے گی نہیں، پروفیسر ہی کے ساتھ کچھ وقت گزر جائے تو اچھا ہے۔ زینے کی سیڑھیاں طے کر کے اس کے کمرے میں چلا گیا۔

وہ بجائے صوفے کے گل دان رکھنے کے اونچے سٹول پر بندر کی طرح سکڑا سکڑایا بیٹھا تھا۔ کپڑے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے تھے۔ ماتھے پر سے خون بہہ کر رخسار پر آ کر جم گیا تھا۔ بدن پر اور بھی کئی جگہ خراشیں تھیں۔ میرا ماتھا ٹھنکا کہ آج پھر یہاں کچھ ہنگامہ برپا ہوا ہے۔

وہ کچھ اس طرح بت بنا بیٹھا تھا کہ کچھ پوچھنے کی ہمت نہ پڑی۔ ایک دفعہ اس نے مجھے دیکھا بھی مگر چپ بیٹھا رہا۔ میں بھی خاموش کھڑا رہا۔ آخر اس نے خود ہی کہا۔

"کھڑے کیوں ہو، بیٹھ جاؤ۔"

میں نے وہیں کھڑے کھڑے پوچھا۔ "آپ کچھ پریشان معلوم ہو رہے ہیں۔"

پروفیسر نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ بلکہ کھوئی کھوئی نظروں سے مجھے دیکھتا رہا۔ ذرا دیر بعد وہ اسٹول پر سے اتر کر نیچے آ گیا۔ اس نے مجھے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ وہ مجھے لیے ہوئے خواب گاہ کی طرف چل دیا۔ دروازے پر پہنچ کر میں ٹھٹک کر رہ گیا۔ سامنے مجسمے کے دو ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ بے ساختہ میری زبان سے نکل گیا۔

"ایاز!" میں نے پوچھا۔ "کیا وہ آیا تھا؟"

"ہاں" اس نے جواب میں صرف ایک لفظ کہا۔

میں نے غصے سے تقریباً چیخ کر کہا۔ "آخر وہ چاہتا کیا ہے؟"

"وہ کہتا ہے، جو لوگ پتھر کے مجسموں میں اپنی تسکین کا سامان ڈھونڈتے ہیں وہ پتھر کی طرح سرد پڑ جاتے ہیں۔ یہ موت کی علامت ہے۔ وہ مجھے موت کے منہ میں جاتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ لہٰذا اس نے غضب ناک ہو کر مجسمہ توڑ دیا۔ میں نے اسے باز رکھنے کی کوشش کی تو وہ وحشیوں کی طرح مجھ سے الجھ گیا۔ بالکل پاگلوں کی سی حرکتیں کر رہا تھا۔" وہ بڑے اطمینان سے ایک ایک لفظ چبا چبا کر ادا کر رہا تھا۔

مجھے اس کا رویہ بے حد ناگوار گزرا۔ میں نے جل کر کہا۔ "اس الو کے پٹھے کو آپ نے خواہ مخواہ سر چڑھا لیا ہے۔"

میری بات پر برا ماننے کی بجائے وہ بے نیازی سے مسکرا کر بولا۔ "تم بھی ٹھیک کہتے ہو۔"

وہ خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگا۔ میں بھی خاموش رہا۔ یکا یک اسے نہ جانے کیا خیال آیا کہ اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا کر بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔

پہلے تو میں نے سوچا کہ اسے تسلی دے کر چپ کرادوں' مگر اس وقت رونا ہی اس کے حق میں مناسب تھا۔ وہ دکھ جو بہت دیر سے وہ اپنے سینے میں دبائے بیٹھا تھا آنسوؤں کے ذریعہ تحلیل ہو کر نکل رہا تھا۔ کمرے کے گہرے سکوت میں اس کی سسکیاں دیر تک ابھرتی رہیں۔ سامنے فرش پر اس مجسمے کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے جس کے وجود میں ایک حسینہ کے جسم کا لوچ تھا پیچ و خم تھے اور جو اطالوی سنگتراشی کا نادر نمونہ تھا۔

پروفیسر کا چہرہ مردے کی طرح خاکستری ہو گیا تھا۔ رخسار کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔ اسی اثناء میں پروفیسر پر کھانسی کا دورہ پڑا۔ اس نے اپنا سینہ دونوں ہاتھوں سے بھینچ لیا اور دمے کے مریض بوڑھوں کی طرح کھانسنے لگا۔

کھانسی سے جب ذرا قرار آیا تو مجھ سے کہنے لگا۔ "تم اس وقت مجھے تنہا چھوڑ دو میں تمہارا بہت ممنون ہوں گا۔" یہ بات اس نے کچھ ایسے کربناک لہجے میں کہی کہ میرے لیے اب وہاں ٹھہرنا کسی طور مناسب نہ تھا۔

میں چپ چاپ نیچے اپنے کمرے میں چلا آیا۔ دیر تک بستر پر پڑا کروٹیں بدلتا رہا۔ مگر بے چینی میں نیند نہ آ سکی۔ اوپر پروفیسر کے کمرے سے اب تک رک رک کر کھانسی ابھر رہی تھی۔ جب تک میں جاگتا رہا کھانسی برابر سنائی دیتی رہی۔ پتہ نہیں وہ کسی لمحے سویا بھی یا ساری رات آنکھوں میں ہی کاٹ دی۔

میں نے ایاز کا اس قدر بے چینی سے کبھی انتظار نہیں کیا تھا مگر اس رات کے واقعہ کے بعد تو ہر وقت یہی دھن سوار رہتی کہ کسی طرح وہ مل جائے تو اس طرح ذلیل و خوار کر کے نکالوں کہ دوبارہ اس طرف کا رخ نہ کرے۔

اسی ارادے کے تحت میں نے دفتر سے ہفتہ بھر کی چھٹی لے لی۔ گھر سے نکلنا بھی بند کر دیا۔ ہر وقت بیٹھا ایاز کی راہ تکتا رہتا۔ لیکن وہ بھول کر بھی اس طرف نہ آیا۔ پروفیسر کو یہ بات نہیں بتائی مگر ایاز کی اتنی طویل غیر حاضری سے میں نے یہ اندازہ لگا لیا کہ اس رات دونوں میں سخت جھگڑا ہوا۔

پروفیسر سے ان دنوں کم ہی ملاقات ہوتی۔ اس کا بوڑھا ملازم اچانک بیمار پڑ گیا تھا۔ ڈاکٹروں نے ٹائیفائڈ بتایا تھا۔

پروفیسر تن دہی سے اس کی تیمارداری کر رہا تھا۔ خود ہی دوا پلاتا' اپنے ہاتھ سے اس کے لیے دودھ گرم کرتا۔ چونکہ دواؤں کا ان

دونوں قحط تھا لہٰذا دن بھر اس کے لیے دوائیں ڈھونڈتا پھرتا۔ رات کو سرہانے بیٹھ کر اس کا سر دباتا۔ نیند سے اٹھ اٹھ کر پانی پلاتا۔ لیکن ملازم کی بیماری میں کوئی افاقہ نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ ڈاکٹروں کے مشورے پر اسے سول اسپتال میں داخل کرا دیا۔ لیکن سہ پہر بلا ناغہ اسپتال جاتا اور رات گئے تک اس کے پاس رہتا۔ کوئی مہینہ بھر بعد اس کی طبیعت کچھ سنبھلی۔

جس روز ملازم کو اسپتال سے واپس گھر لایا' اس روز اس کے چہرے پر بڑا چھوتی چمک تھی' ایسی تازگی جو شبنم سے بھیگ کر پتوں پر آ جاتی ہے۔

بوڑھا ملازم تو اب صحت یاب ہو گیا تھا۔ مگر اس کی بیماری پر نہ صرف ہم دونوں کی مہینہ بھر کی تنخواہیں صرف ہو گئیں بلکہ کچھ قرض بھی چڑھ گیا۔ اور قرض خواہ اکثر آ کر پریشان کیا کرتے۔ دوسروں کو تو اس نے آئندہ ماہ پر ڈال دیا' مگر جس دکان سے راشن آتا تھا وہ روزانہ کسی نہ کسی وقت بلائے بے درماں کی طرح نازل ہو جاتا۔

بڑی سرد رات تھی۔ یہی کوئی ساڑھے نو کا عمل ہوگا۔ لیکن سردی زیادہ تھی۔ لہٰذا سر شام ہی سناٹا پڑ گیا تھا۔ باہر تیز ہوا چل رہی تھی۔ ہم دونوں کمرے کے تمام دروازے اور کھڑکیاں بند کر کے آتش دان کے سامنے بیٹھے گرم گرم کافی پی رہے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔ پروفیسر خوشگوار موڈ میں تھا۔ وہ اس وقت یونانی دیومالا کے متعلق بڑی اچھی باتیں بتا رہا تھا۔ اسی اثناء میں دروازے پر دستک ہوئی۔ سردی میں آگ کے پاس سے اٹھ کر دروازے تک جانا ناگوار معلوم ہوا' مگر یہ سوچ کر کھڑا ہو گیا کہ کہیں اس وقت ایاز نہ آیا ہو۔

دروازہ کھول کر دیکھا۔ اندھیرے میں کوئی خاموش کھڑا تھا۔ لیکن یہ تو وہی بلائے بے درماں تھی۔ وہ جھٹ اندر آ گیا اور سیدھا پروفیسر کے پاس پہنچا۔

''دیکھئے صاحب' آج ہمارا حساب صاف ہونا چاہیے۔''

پروفیسر نے حسب معمول نرمی سے کہا۔ ''بھئی راشن تو تمہارے یہاں سے آ ہی رہا ہے' آئندہ مہینے اکٹھا حساب صاف کر دیں گے۔''

وہ بے رخی سے بولا۔ ''نہیں صاحب اس طرح کام نہیں چلے گا۔ مجھے تو ابھی روپے کی ضرورت ہے۔''

پروفیسر نے ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''شیخ جی! ایسی بات مت کہو۔ اس مہینے تم کسی طرح اپنا کام چلا لو دوسرے مہینے جی چاہے تو مجھ سے کچھ زیادہ لے لینا۔''

وہ بدتمیزی پر اتر آیا۔ "اجی زیادہ تو آپ کیا دیں گے' جو نکلتا ہے وہی مل جائے تو بہت ہے۔"

پروفیسر بھی اب بے قابو ہوئے جا رہا تھا۔ "خیر اس مہینے تو کچھ نہیں مل سکے گا۔"

وہ آنکھیں نکال کر گویا ہوا۔ "ملے گا کیسے نہیں؟ میں آج ہی سارا حساب لے کر جاؤں گا اور ابھی۔"

وہ آستین چڑھا کر کھڑا ہو گیا۔ بات بڑھ جاتی' پروفیسر کا چہرہ بھی سرخ ہو گیا تھا۔ میں جانتا تھا' اسے کبھی غصہ آتا ہی نہیں اور جب آتا ہے تو غضب کا آتا ہے۔ میں نے فوراً مداخلت کی۔

"شیخ جی! تم کو اپنا روپیہ چاہیے ہے نا؟"

وہ ذرا نرم ہو کر بولا۔ "جی ہاں"

میں نے کہا۔ "ایک گھنٹہ بعد تم آ کر مجھ سے اپنا پورا حساب لے جانا۔"

وہ فی الفور رضامند ہو گیا۔ "بہت اچھی بات ہے' میں دس بجے آؤں گا۔" اتنا کہہ کر وہ چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد پروفیسر نے مجھے قہر آلود نظروں سے دیکھا۔

"تم اس کمینے کی گیدڑ بھبکی سے ڈر گئے۔ ذرا تم رک تو جاتے میں اس بدتمیزی کا وہ مزا چکھاتا کہ زندگی بھر یاد رکھتا۔"

وہ بڑے جلال میں بول رہا تھا۔ میں نے ہڈیاں نکلے اس کے جسم کو دیکھا اور اس کے مقابلے میں موٹے تگڑے شیخ جی کے بارے میں غور کیا تو ہونٹوں پر ہنسی آتے آتے رہ گئی۔ میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔

"اس سے جھگڑا کرنا آپ کو زیب نہیں دیتا۔"

میری بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ "یہی سوچ کر تو میں چپ رہا۔ ورنہ یہ مت سمجھنا کہ میں دبلا پتلا ہوں۔ ایک مکا مارتا تو مریل بیل کی طرح دھڑام سے فرش پر جاتا۔"

باتوں پر وقت صرف کرنے کا موقع نہیں تھا۔ میں نیچے جا کر کپڑے تبدیل کئے اور اس جاڑے پالے میں ایک دوست کے پاس پہنچا۔ اسے اسی وقت جگا کر روپے قرض لیے اور واپس آیا' مگر یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ پروفیسر جسے میں جلے کباب کی طرح غصے کے عالم میں چھوڑ گیا تھا' بڑے معنی خیز انداز میں بیٹھا مسکرا رہا ہے۔

"تم نے تاخیر کر دی' ذرا دیر پہلے آ جاتے تو تماشا دیکھتے۔ الو کا پٹھا شیخ جی دس بجے سے پہلے ہی نازل ہوا۔ اس کے پیچھے پیچھے ایاز بھی آ گیا۔ آتے ہی شیخ جی نے اسی بدتمیزی سے تقاضا کیا۔ تم کو بھی برا بھلا کہنے لگا۔ جلا ہوا تو بیٹھا ہی تھا مجھے بھی تاؤ آ گیا۔ مگر ایاز

نے مجھے تو ایک طرف کر دیا اور اس کے منہ پر دو تین مکے جو رسید کیے تو شیخ جی کا سارا طنطنہ نکل گیا۔ لگا غیں غیں کرنے۔ ایاز اسے دروازے تک دھکے دیتا لے گیا اور نکال باہر کیا۔ شریف ہو گا تو اب کبھی ایسی حرکت نہیں کرے گا۔"

میں خاموش بیٹھا اس کی باتیں سنتا رہا۔ وہ دیر تک اس ہنگامے کی ایک ایک تفصیل بتاتا رہا۔ گیارہ بجے کے قریب میں اٹھ کر اپنے کمرہ میں آ گیا۔ کپڑے تبدیل کرتے ہوئے اچانک مجھے خیال آیا کہ اس وقت تو ایاز نے شیخ جی کو مار پیٹ کر خاموش کر دیا لیکن وہ شورہ پست قسم کا آدمی معلوم ہوتا ہے' کالج جاتے ہوئے راستے میں اگر اس نے پروفیسر کے خلاف انتقاماً کوئی کارروائی کی تو کیا ہو گا؟ جلا برا ہوتا ہے۔ وہ باز نہیں آئے گا' ضرور کچھ نہ کچھ کرے گا۔ کچھ یہی سوچ کر میں فوراً ہی شیخ جی کی طرف چل دیا۔ وہ ابھی سویا نہیں تھا۔ نکل کر باہر آیا۔ میں نے اس سے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ ابھی آپ گھر گئے تھے۔ مجھے ذرا دیر ہو گئی۔ آپ کے ساتھ ایاز نے جو زیادتی کی ہے' وہ بہت بری بات ہوئی' مجھے اس کا افسوس ہے۔"

وہ حیرت زدہ ہو کر بولا۔ "آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔۔۔۔۔۔کون ایاز' کس کا جھگڑا۔۔۔۔۔۔۔ میں گیا ہی کب تھا۔ پروفیسر صاحب یہاں خود آئے تھے' اپنی گھڑی دے گئے ہیں اور یہ کہہ گئے ہیں کہ چند ہی روز میں روپے کا بندوبست کر کے گھڑی لے جائیں گے۔ وہ تو بے چارے کتنی دیر تک خوشامد کرتے رہے اور آپ جھگڑے کی بات کر رہے ہیں۔" وہ ایک سانس میں ساری باتیں کہہ گیا اور میں سکتے کے عالم میں بت بنا اس کی باتیں سنتا رہا۔

میں نے جیب سے روپے نکالے اور اسے سمجھانے لگا۔

"بھئی ان کے ملازم تو مجھ سے یہی کہا تھا۔" میں نے پروفیسر کا نام تو لیا نہیں' سارا الزام نوکر پر رکھ دیا۔

"بہرحال آپ یہ روپے رکھ لیجئے اور کل گھڑی پروفیسر کو واپس دے دیجئے گا۔ میرے یہاں آنے اور روپے ملنے کا ان سے کوئی تذکرہ نہیں کیجئے گا۔"

میں نے روپے اسے دیئے اور اچھی طرح سمجھا بجھا کر واپس آ گیا۔

پروفیسر کی اس غلط بیانی پر مجھے حیرت بھی ہوئی اور غصہ بھی آیا۔ اس نے صرف ایاز کی توقیر بڑھانے کے لیے میرے سامنے یہ ڈھونگ رچایا تھا۔ دراصل ایک عرصے سے ایاز اس کے پاس بھی نہیں تھا۔ اب وہ اس کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ سوچا ہو گا کہ اگر یوں سیدھے طور پر ایاز کو منا کر لائے گا تو ممکن ہے کہ مجسمہ توڑنے والے واقعہ کے باعث میں اس سے لڑ بیٹھوں۔ لہٰذا اس نے پیش

بندی کے طور پر یہ سب کچھ کیا تھا۔

بہر صورت یہ بات تو اب بخوبی واضح ہو گئی تھی کہ وہ ایاز سے زیادہ عرصے تک قطع تعلق نہیں رکھ سکتا۔ وہ اس کی بہت بڑی کمزوری بن چکا تھا۔ اس کمزوری کے پس پردہ کیا راز پنہاں تھا اسے وہی بہتر جانتا ہوگا۔

دوسرے ہی روز سے پروفیسر نے پھر ایاز کی باتیں شروع کر دیں۔ لیکن وہ جس قدر اس کے ذکر میں لذت محسوس کرتا' مجھے اتنا ہی ناگوار معلوم ہوتا۔ البتہ مجھے ایاز سے ملنے' اسے دیکھنے اور کے ساتھ بات چیت کرنے کا اشتیاق اور بڑھ گیا تھا۔

لیکن کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ اس تمام عرصے میں ایک بار بھی اس سے مڈبھیڑ نہ ہو سکی۔ اس کے اسباب دو ہی ہو سکتے تھے۔ یا تو پروفیسر مجھے ایاز سے ملانا نہیں چاہتا تھا یا پھر اس میں محض حادثات کو دخل تھا۔

اس روز بوندا باندی ہو رہی تھی۔ طبیعت بھی کچھ گری گری ہو رہی تھی۔ میں دفتر بھی نہیں گیا۔ تمام دن بستر پر پڑا رہا۔ شام کو جب پڑے پڑے الجھن ہونے لگی تو میں نے لباس تبدیل کیا اور باہر چلا گیا۔ اس وقت بارش بند ہو چکی تھی۔ لیکن بادل گھرے ہوئے تھے۔ سڑکوں پر کیچڑ تھی۔ لہٰذا کوچہ و بازار کے چکر کاٹنے کی بھی گنجائش نہ تھی۔ فوراً ہی واپس جانے کا بھی ارادہ نہ تھا۔

سڑک کے ایک موڑ پر کھڑا سوچ رہا تھا کہ اب کیا پروگرام بنایا جائے' اسی اثناء میں ایک نوجوان میرے قریب سے گزرتے ہوئے ٹھٹکا۔ اس کی نظروں سے معلوم ہوتا تھا جیسے مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہے۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ وہ آگے بڑھ گیا۔ ذرا ہی دیر بعد وہ پلٹا۔ اس دفعہ وہ میرے بالکل قریب آ گیا۔ ہچکچاتے ہوئے بولا۔

''میں نے پروفیسر الیاس کے یہاں آپ کو اکثر دیکھا ہے۔''

''جی ہاں' میں ان کے ساتھ ہی رہتا ہوں۔''

وہ بے تکلفی سے مسکرا کر مخاطب ہوا۔ ''مہربانی فرما کر یہ کتابیں ان کو دے دیجئے۔ بادل گھرے ہوئے ہیں ان کے گھر آنے جانے میں بارش نے آ لیا تو مصیبت آ جائے گی۔''

اتنا کہہ کر اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور آگے بڑھ گیا۔ جب وہ کچھ دور چلا گیا تو اچانک میں نے سوچا' یہ ایاز تو نہیں ہے۔ وہی ہو گا۔ وہ قیمتی سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ جسم بھی صحت مند تھا۔ میں نے اس کا چہرہ غور سے نہیں دیکھا۔ وہ خوش رو اور اسمارٹ بھی ہوگا۔ بڑی کوفت ہوئی۔ اس وقت تو اس سے تفصیلی ملاقات ہو جاتی۔

ابھی وہ زیادہ دور نہیں گیا تھا۔ سوچا کہ اگر مل جاتا تو اصرار کر کے اسے کسی چائے خانے میں لے جاؤں گا۔ وقت بھی گزر جائے گا

اوراس سے ملنے کا جو اشتیاق تھا وہ بھی پورا ہو جائے گا۔ لیکن پوری سڑک چھان ڈالی۔ ہر راہ گیر کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا' مگر وہ دوبارہ نظر نہ آیا۔ چھلاوے کی مانند آن کی آن میں اوجھل ہو گیا۔

واپس گھر پہنچا تو بہت تھک چکا تھا۔ لیکن ابھی میں کوٹ اتار کر ہینگر پر ٹانگنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اوپر کی منزل کا دروازہ بڑے زور سے کھلا۔ میں گھبرا کر کمرے سے باہر آ گیا۔ پروفیسر بدحواسی کے عالم میں لکڑی کے زینے پر سے دھم دھم کر کے اتر رہا تھا۔ اس وقت اس کا عجیب حلیہ تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے' چہرے پر وحشت' ایک ہاتھ کوٹ کی آستین میں اور دوسرا باہر۔ میرے سامنے آیا تو تیکھے لہجے میں بولا۔

''تم نے اس حرام زادے کو نہیں تو دیکھا۔ ابھی کھڑکی پر سے کود کر بھاگا ہے۔''

یہ کہتا ہوا وہ گھر سے باہر نکلا۔ میں بھی گھبرا کر اس کے پیچھے پیچھے چلا۔ وہ اسی انداز سے بولتا رہا۔ ''اس نے وہ کمینہ پن کیا ہے کہ میں زندگی بھر اسے معاف نہیں کروں گا۔'' اس کے منہ سے کف جاری تھا۔ آواز غصے سے لرز رہی تھی۔

''میں اسے قتل کر دوں گا' میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

میں اور بھی گھبرا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ آج کوئی سنگین واردات ہو گئی۔ پروفیسر کی حالت دیوانوں کی سی ہو رہی تھی۔ میں نے جلدی سے قریب جا کر پوچھا۔

''پروفیسر صاحب! آخر ہوا کیا۔۔۔۔۔۔۔ چلئے' میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔''

وہ پلٹ کر مجھ پر برس پڑا۔ ''جی نہیں' آپ میرے ساتھ کیوں جائیں گے؟''

میں نے مطلق برا نہیں مانا' رسان سے کہا۔ ''آپ کا تنہا جانا مناسب نہیں۔''

''ایک بار میں نے کہہ دیا کہ آپ میرے ساتھ نہیں جا سکتے۔ یہ میرا نجی معاملہ ہے۔ آپ اس میں مداخلت کرنے والے کون؟''

اس نے یہ بات اتنے زور سے چیخ کر کہی کہ کئی راہ گیر ٹھٹک کر ہم دونوں کو دیکھنے لگے۔ سوچا کہ اب میں نے مزید کچھ کہا تو پروفیسر لڑ پڑے گا۔ وہ اس وقت سخت غیظ و غضب کے عالم میں تھا۔ لہٰذا میں بغیر کچھ کہے سنے کمرے میں واپس آ گیا۔

کچھ دیر اپنے کمرے میں ٹھہرنے کے بعد سوچا' ذرا چل کر اوپر تو دیکھوں کہ آج کیا ہنگامہ کارزار برپا ہوا ہے۔ لیکن جب میں وہاں گیا تو ہر چیز قرینے سے اپنی جگہ موجود تھی۔ ابھی میں کھڑا متجسس نظروں سے کمرے کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ اچانک ہلکی ہلکی سسکیاں سنائی دیں۔ لائبریری میں کوئی رو رہا تھا۔ میں لپک کر وہاں گیا۔ لائبریری میں اندھیرا تھا۔ آتش دان میں تھوڑے سے

کوئلے دہک رہے تھے۔ دھندلی دھندلی روشنی میں دیوار کے پاس کوئی زمین پر پڑا ہوا نظر آیا۔

آہستہ آہستہ چلتا ہوا میں اس کے نزدیک پہنچ گیا۔ لیکن میں نے زبان ثرا یک لفظ بھی نہ نکالا تھا کہ سسکیوں میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری۔

''خبردار جو میرے قریب آئے۔''

یہ تو عذرا تھی' شرمیلی سی سانولی سلونی لڑکی۔

تو کیا آج ایاز۔۔۔۔۔۔ پھر میں نے خود ہی اس خیال کی تردید بھی کر دی۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے سوچا' نہیں ایسا ہی ہوگا' ورنہ پروفیسر غصے سے اتنا پاگل نہ بن جاتا۔

میں نے فوراً ہی سوئچ دبا کر کمرے میں روشنی کی۔ عذرا فوراً اٹھی اور دیوار سے لگ کر بیٹھ گئی۔ اس کا لباس جگہ جگہ سے مسک گیا تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ وہ گھٹنوں پر چہرہ رکھے سسکیاں بھر رہی تھی۔ میں نے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔

''یہ تو سراسر درندگی ہے۔''

وہ اسی طرح سسکیاں بھرتی رہی۔

''اگر مجھے سور کا بچہ ایاز مل جائے تو میں اس کا خون پی لوں گا۔ ایک کمزور لڑکی پر اس طرح ظلم کرتے ہوئے اس کمینے کو ذرا بھی غیرت نہ آئی۔''

اس نے اس دفعہ گردن اٹھا کر میری طرف دیکھا اور حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر بولی۔ ''کون ایاز؟''

میں ٹپٹا کر رہ گیا۔ معاً میری زبان سے نکلا۔ ''تو کیا پروفیسر۔۔۔۔۔۔؟'' میں جملہ پورا نہ کر سکا۔

اس نے بڑے الہڑپن سے کہا۔ ''ہاں' اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

حیرت و استعجاب کا مجھ پر ایسا اچانک حملہ ہوا کہ میں لڑکھڑا کر رہ گیا۔

آتش دان میں سلگتے ہوئے کوئلے اب بجھ چکے تھے۔ عذرا کی سسکیاں دھیمی پڑ چکی تھیں۔ بادل زور زور سے گرجنے لگے تھے۔ بارش شروع ہونے والی تھی۔ میں نے اسے تسلی دی اور گھر واپس جانے پر آمادہ کیا۔

باہر آ کر میں نے رکشا لیا اور عذرا کو اس کے گھر چھوڑ آیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس نے اپنی اس حالت کے متعلق گھر پر کیا بتایا۔ یوں میں نے اسے سمجھا دیا تھا کہ ایکسیڈنٹ کا بہانہ بنا کر وہ گھر والوں کو مطمئن کر سکتی ہے۔ ویسے وہ خاصی سمجھدار لڑکی تھی۔ کوئی اور بہتر

عذرا بھی تراش سکتی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ اس نے پروفیسر کے متعلق صاف صاف نہیں بتایا ہوگا۔ اس نے صرف کے کپڑے نوچے کھسوٹے تھے یا چہرے پر ناخنوں کی ایک آدھ خراش تھی۔ یہ سب کچھ بالکل اچانک ہوا تھا۔ اسی وقت عذرا کی چیخ نکل گئی اور وہ فوراً وہاں سے چلا گیا۔ اس سانولی سلونی لڑکی نے مجھے یہی بتایا تھا۔

گھر واپس آ کر میں نے دیکھا' پروفیسر ابھی تک نہیں لوٹا تھا۔ میں اوپر جا کر اس کا انتظار کرنے لگا۔ دیر تک انتظار کرتا رہا۔ آدھی رات گزر گئی۔ ایک بجا' ڈیڑھ بجا' پھر دو۔ باہر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ طوفانی ہوائیں چل رہی تھیں۔ کھڑکی کے پٹ بار بار تیز جھکڑ سے کھڑکھڑاتے۔ کمرے کا ماحول آسیب زدہ سا معلوم ہو رہا تھا۔

اس وقت نہ میں عذرا کے متعلق غور کر رہا تھا نہ ایاز کے متعلق۔ مجھے یہ صرف فکر تھی کہ پروفیسر اب تک واپس کیوں نہیں آیا۔

جس وقت دیوار پر لگے ہوئے گھنٹے نے ٹن ٹن دو بجائے تو بارش اور طوفانی ہواؤں کے ملے جلے شور میں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے سرگوشی کی۔ "پروفیسر مر گیا۔۔۔۔۔۔ اس نے خودکشی کر لی۔" پھر جیسے ہواؤں کی چیخوں میں' بارش کی بوندوں کے جل ترنگ میں' دریچوں کی کھڑکھڑاہٹ میں' یہی صدا بار بار ابھرنے لگی۔

"پروفیسر مر گیا"

"پروفیسر مر گیا"

"پروفیسر نے خودکشی کر لی"

"پروفیسر۔۔۔۔۔۔"

میرا جی چاہا کہ وہاں سے اٹھ کر بھاگ جاؤں۔

یکایک میں نے سنا' کوئی باہر زور زور سے دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔ میں نے اٹھ کر کھڑکی سے جھانکا۔ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ میں صرف دروازے پر کھڑی ہوئی ٹیکسی دیکھ سکا۔

میں نے نیچے جا کر دروازہ کھولا۔ سامنے پروفیسر پانی میں شرابور کھڑا تھا۔ وہ اندر آیا تو میں نے دیکھا' اس کے ساتھ نہایت چست اسکرٹ پہنے دوہرے بدن کی ایک نوجوان لڑکی بھی ہے۔ وہ بھی بری طرح بھیگی ہوئی تھی۔

پروفیسر نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ میں اس کے ساتھ ساتھ اوپر گیا۔ اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ وہ نشے میں دھت تھا۔ کمرے میں پہنچتے ہی اس نے وسکی کی بوتل نکالی۔ ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے آگے بڑھا۔ دو گلاس اٹھائے۔ ان میں وسکی

انڈیلی۔ اپنا گلاس تو ایک ہی سانس میں اس نے خالی کر دیا۔ دوسرا گلاس اس لڑکی کے ہونٹوں سے لگا کر بولا۔ "بار برا ڈارلنگ پیو ۔۔۔۔۔۔ کم آن" اس کی آواز اس وقت پھٹے بانس کی طرح بھونڈی معلوم ہو رہی تھی۔ جب وہ گلاس اپنے ہاتھ میں لے کر گھونٹ بھرنے لگی تو وہ بڑبڑانے لگا۔

"کپڑے ۔۔۔۔۔۔ کپڑے تو بھیگ گئے۔ کوئی بات نہیں۔"

اس نے دیکھتے ہی دیکھتے سارے کپڑے اتار ڈالے اور بالکل برہنہ ہو گیا۔ میں ہکا بکا کھڑا تھا۔ اس عالم میں اسے دیکھ کر چونکا۔ اب وہاں ٹھہرنا قطعی مناسب نہیں تھا۔ لہٰذا سوچا کہ اس کی نظر ذرا ادھر ادھر ہو اور میں جھپاک سے زینے کے دروازے پر پہنچ جاؤں۔ پروفیسر اس لڑکی کے سر ہو رہا تھا کہ وہ بھی کپڑے علیحدہ کر دے۔ اس نے زبان سے تو کچھ نہیں کہا مگر بے بسی سے میری جانب دیکھنے لگی۔ پروفیسر نے بھی مڑ کر میری جانب دیکھا۔ جھوم کر بولا۔

"تم کون ہو جی ۔۔۔۔۔۔ کون ہو ۔۔۔۔۔۔ بولو" وہ اس لڑکی سے پوچھنے لگا۔ "یہ کون ہے؟ تم بتاؤ۔"

میں نہ جانے کیوں حماقت میں بول پڑا۔ "پروفیسر صاحب! میں ہوں شہیر"

وہ غضب ناک ہو کر چیخا۔ "پروفیسر ۔۔۔۔۔۔ کون پروفیسر ۔۔۔۔۔۔ میں تو ایاز ہوں۔ پروفیسر سالا تو لائبریری میں کتابوں پر پڑا سوتا ہوگا۔ مگر الو کے پٹھے! تم نے مجھے پروفیسر کیوں کہا؟ ایاز کیوں نہیں کہتے؟" وہ بری طرح بہک رہا تھا۔

میں باہر جانے کے لیے دروازے کی جانب بڑھ ہی رہا تھا کہ وہ پھر چلایا۔ "حرام زادے! الو کے پٹھے!" ساتھ ہی اس نے میرے منہ پر شراب سے بھرا ہوا گلاس زور سے مارا۔

یہ جو میری پیشانی پر صلیب کا سا نشان نظر آ رہا ہے یہ اسی زخم کا نشان ہے۔ اب چلتے چلتے یہ بھی بتا دوں کہ دوسرے میں نے سویرے جا کر دیکھا تو پروفیسر لائبریری میں کتابوں پر سر رکھے بے خبر سو رہا تھا۔ وہ اس وقت تنہا تھا اور بالکل مادرزاد برہنہ تھا۔

◆◆◆